زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

...... پرندہ ......

آغا گل۔۔۔بلوچستان کی زبوں حالی کا نوحہ کناں تو ہے ہی،لیکن بنیادی طور پر وہ انسان کی سربلندی اور سرفرازی کا خواہاں ہے۔۔۔مجھے افسوس ہے،ہمارے نقادوں نے اس نہایت ہم درد،دردمند اور پیار سے لبریز افسانہ نگار،ناول نویس کو نظر انداز کیا ہے،کررکھا ہے۔۔۔مگر قصور اس کا اپنا ہی ہے۔وہ تعلقاتِ عامہ کے فن سے آشنا نہیں۔۔۔وہ دوستیاں کرتا ہے،محبت بانٹتا ہے اور ایمان رکھتا ہے،لوگ اس کے جذبے کو، صداقت کو سراہیں گے۔اپنے آپ کو دانش مند سمجھنے والا آغا گل،کتنا معصوم ہے۔(سچ، میں یہاں کوئی اور لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا!)

امن کا پیاسی اور دنیاداری کے حوالے سے نامی گرامی ہونے کے باوجود اس کی بے چارگی چاروں طرف راکٹ، میزائل اور بارود ہی دیکھتی ہے۔۔۔وہ کیا کرے۔۔۔؟!تلملا کر ایک اور دل پذیر کہانی لکھ دے۔۔۔اپنا کچھ اور کتھارس کرے۔۔۔اُس کی بھڑاس کی تپش میں دُور بیٹھا تو محسوس کر رہا ہوں،نہ جانے اہلِ ادب اور گونگے بہرے سکے دار کب قبول کریں گے۔ ......اظہر جاوید

ایک سوبیس صفحات پر مشتمل یہ عمدہ کتاب دوسو روپے کے عوض سیلز اینڈ سروسز،کبیر بلڈنگ، جناح روڈ کوئٹہ سے دستیاب ہے۔

...... تتلی کی پہلی بارش ......

آج کل بہت سے نئے شعرا،شاعری اور کلامِ موزوں کو دو علاحدہ علاحدہ چیزیں سمجھتے ہیں اور بلاتکلف ایسی کتابوں کو شعری مجموعے کا نام دے کر چھپوا دیتے ہیں جنہیں ہمارے پی سی او والے جج حضرات بھی ''نظریہ ضرورت'' کا لائسنس نہیں دے سکتے۔ایسے میں جب کسی ایسے شاعر کا کلام نظر سے گزرتا ہے جو رموزِ فن سے آشنا ہونے کے ساتھ ساتھ ریاضت پر بھی یقین رکھنے اور پیرایۂ اظہار کو بہتر اور موثر بنانے میں کوشاں ہو تو دل کو ایک عجیب سے خوشی ہوتی ہے اور بلاشبہ شاہینہ فلک صدیقی کے یہاں یہ ساری صفات پائی جاتی ہیں۔اس کتاب میں ان کی نظمیں،غزلیں اور ماہیے(جن کو وہ نہ جانے کیوں ہائیکو کہنے پر مصر ہیں) شامل ہیں۔تھوڑا سا پنجابی کلام بھی ہے۔موضوعات میں خارج کی جھلکیاں تو ہیں مگر ان کا اصل جوہر ''بیانِ ذات'' کے چمنستان میں ہی کھلتا ہے،جہاں اگرچہ پھول کم کم اور کلیاں اور غنچے زیادہ ہیں مگر اس کی فضا نہ صرف متوجہ کرتی ہے بلکہ گاہے گاہے رکنے پر بھی مجبور کرتی ہے اور کسی بھی شاعر کے پہلے مجموعے کے لیے یہ یقیناً ایک اعزاز کی بات ہے۔ ...... امجد اسلام امجد

نفیس کاغذ کی مجلد یہ کتاب دو سو صفحات پر مشتمل ہے جس کی قیمت تین سو روپے مقرر کی گئی ہے،بزمِ تخلیق ادب پاکستان،کراچی سے طلب کی جاسکتی ہے۔

...... تجدیدِ نو ......

(ڈاکٹر وزیر آغا نمبر)

شخصیات پہلے ناگزیر تھیں نہ آئندہ ہونے کا امکان ہے۔ناگزیر اگر کوئی چیز ہے تو علم و ہنر ہے جو قد آور شخصیات ورثہ کے طور پر بعد میں آنے والوں کی رہنمائی کے لیے چھوڑ جاتی ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا نہ صرف پاکستان بلکہ دنیائے ادب کے نہایت بالغ نظر،روشن فکر اور روشن دماغ ادیب،شاعر اور نقاد کے طور پر بلند مقام کے حامل ایسے قلمکار ہیں جن کا فیضانِ قلم ان کی وفات کے بعد بھی جاری و ساری ہے اور آئندہ بھی یہ سلسلہ زیادہ سرگرمی اور فعالیت کے ساتھ جاری رہنے کے امکانات ہیں۔''تجدیدِ نو'' کی مدیران محترمہ عذرا اصغر اور شبہ طراز صاحبہ نے ''تجدیدِ نو'' کی ایک اشاعت ڈاکٹر وزیر آغا کے فن و شخصیت سے منسوب کر کے ایک بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔تین سو پچاس صفحات اور رنگین سرورق کی یہ خاص اشاعت اس اعتبار سے لائق توجہ اور لائق ستائش ہے کہ اس خاص اشاعت میں ہر مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے قریب چار درجن اہلِ قلم نے ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت و فن کو ہر ہر زاویہ سے جانچا پرکھا ہے۔زیرِ نظر دستاویز نوجوان اور تازہ دم اہلِ قلم کے لیے سوغات کا درجہ رکھتی ہے جو فقط ایک سو پچاس روپے کے عوض 14۔رحمٰن ہاؤسنگ سوسائٹی۔B.O.R، جوہر ٹاؤن، لاہور سے دستیاب کی جاسکتی ہے۔ ...... انوار شریف

متاعِ چہارسو

☆

○

میں نظر آؤں ہر اِک سمت جدھر سے چاہوں
یہ گواہی میں ہر اِک آئینہ گر سے چاہوں

○○○

قرطاسِ اعزاز

کشور ناھید

کے نام

○

"خوابِ پیمبری"

فاری شا

(لندن)

نام: کشورناہید
پیدائش: ۳رفروری ۱۹۴۰ء (بلند شہر، بھارت)
والد: سید ابنِ حسن
والدہ: جمیلہ خاتون
تعلیم: بی۔اے (۱۹۵۹ء)، ایم۔اے۔ معاشیات (۱۹۶۱ء)
جامعہ پنجاب لاہور
شادی: ۱۹۶۰ء ہمراہ یوسف کامران
بیٹے: معظم کامران، فیصل کامران

تصانیف:

۱ کلیات: دشتِ قیس میں لیلیٰ
۲ بری عورت کی کتھا (خودنوشت)
۳ بری عورت کے خطوط
۴ شناسائیاں رسوائیاں (یادداشتیں)
۵ ورق ورق آئینہ (کالم)
۶ باقی ماندہ خواب (مضامین)
۷ لیلیٰ خالد (خودنوشت)
۸ زیتون (ناول) "ترجمہ"
۹ آ جاؤ افریقہ (سفرنامہ)
۱۰ خواتین افسانہ نگار (انتخاب ۱۹۳۰ء تا ۱۹۹۰)
۱۱ عورت زبان خلق سے زبان حال تک (مرتب مضامین)
۱۲ عورت خواب اور خاک کے درمیان
۱۳ لب گویا (غزلیں)
۱۴ بے نام مسافت (نظمیں)
۱۵ گلیاں دھوپ دروازے (شاعری)
۱۶ نظمیں (تراجم)
۱۷ فتنہ سامانی دل (شاعری)
۱۸ سیاہ حاشیے میں گلاب (شاعری)
۱۹ خیالی شخص سے مقابلہ (نثری نظمیں)
۲۰ میں پہلے جنم میں رات تھی (شاعری)
۲۱ سوختہ سامانی دل (شاعری)
۲۲ The Scream of an illegitimate vioce
۲۳ Women myth and realities
۲۴ وحشت اور بارود میں لپٹی شاعری (شاعری)

ادارت:

۱	انتخاب برائے مزاحمتی ادب	۱۹۷۷
۲	چیف ایڈیٹر برائے فیملی پلاننگ میگزین	۱۹۷۷
۳	ترجمہ اور رپورٹ برائے انسانی حقوق	۱۹۷۸
۴	ہمعصر اہل قلم پر کتاب	۱۹۷۸،۸۱،۸۵
۵	سال کا منتخبہ ادب	۱۹۸۴
۶	چالیس سال کا منتخبہ پاکستانی ادب	۱۹۸۷
۷	منتخبہ ادب برائے سارک ممالک	۱۹۸۸
۸	اداکاری وصداکاری پر بارہ کتابیں	۱۹۹۴_۹۷
۹	اٹھارہ منتخب مصوروں کے تذکرے	۱۹۹۴_۹۷
۱۰	تدوین برائے اساتذۂ موسیقی آف پاکستان	۱۹۹۴_۹۷
۱۱	پاکستان کی پچاس سالہ موسیقی کی یکجائی	۱۹۹۷
۱۲	انتخاب برائے عالمی خواتین ادب	۲۰۰۳

اعزازات:

۱	آدم جی ادبی ایوارڈ	۱۹۹۴_۹۷
۲	انعام برائے بچوں کا ادب (یونیسکو)	۱۹۷۴
۳	بہترین ترجمہ نگار ایوارڈ (کولمبیا یونیورسٹی)	۱۹۸۴
۴	نامزدگی برائے امریکہ سال کی منتخب خاتون	۱۹۹۷
۵	منڈیلا ایوارڈ (ساؤتھ افریقہ)	۱۹۹۷
۶	ستارۂ امتیاز (حکومتِ پاکستان)	۲۰۰۰
۷	نامزدگی برائے نوبیل امن انعام برائے خواتین	۲۰۰۵

تحقیق:

۱ برکلے یونیورسٹی میں مس انیتا نے کشور ناہید کے شعری اور نسوانی تناظر پر ڈاکٹریٹ کی۔
۲ آمنہ یقین نے لندن یونیورسٹی سے کشور ناہید کی شخصیت وفن پر تحقیق کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔
۳ کشور کی فیمنسٹ تھیوری پر مقالہ تحریر کر کے مس مہوش نے نیویارک یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کیا
۴ پاکستان کی بیشتر یونیورسٹیز میں ایم۔اے۔ کی سطح پر کشور کی شخصیت و فن پر بے شمار مقالے تحریر کیے گئے۔

تراجم:

آمنہ یقین، انصر رحمان، آصف فرخی، بیدار بخت، داؤد کمال، ڈیرک کوپن، فردوس علی، رخسانہ احمد اور مہوش شعیب نے کشور کا کلام اردو سے انگریزی میں منتقل کیا ہے جسے

The Distacne of Shout

اور

The Scream of an illegitimate voice

کے نام سے سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۰ اور ۲۰۰۸ء میں شائع کیا ہے۔

محترمہ کشور ناہید نے ان گنت غیر ملکی شعرا کا کلام اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے جس میں پابلو نرودا، وزنی سینگی، کینتھ بیچن، لیوپولڈ، سیداد سینگھور، فروغ فرخ زاد،۔ رابرٹ فراسٹ، جان مشکوئی، چانگ سوکو اور ہیرا کی کے تراجم کے علاوہ نثر میں سیمون ڈی بورا کی کتاب **Second Sex** کی تخلیص، بپسی سدھوا کے ناول برائڈ کا ترجمہ اور لیلیٰ خالد کی آپ بیتی کا ترجمہ بھی شامل ہے۔

تجربہ:

ہالینڈ، ویتنام اور بھارت سے خواتین کی دستکاری، کاروبار، مہارت پر مختلف کورسز کے علاوہ انتظامی امور، مالی معاملات، نشرواشاعت، تشہیر، فلم رائٹنگ، کتب، رسائل، جرائد، طباعت اور ترسیل کا پچاس سالہ تجربہ۔

سیاحت:

کشور ناہید پچاس سالہ ادبی جہاد میں کم و بیش اسّی ممالک میں علمی، ادبی کانفرنسز، سیمینار اور ورکشاپس میں شرکت کر چکی ہیں۔ بیشتر ممالک میں انہیں بطور مقررِ خاص یا مہمانِ خصوصی کے طور پر مدعو کیا جاتا ہے۔ ان کانفرنسز، سیمینار اور ورکشاپس کی روداد کشور ناہید اکثر اپنے اخباری کالم میں بیان کرتی رہی ہیں جسے کشور ناہید عالم گردی کا نام دیا کرتی ہیں۔

خدمات:

کشور ناہید گزشتہ نصف صدی سے قلمی جہاد کے ساتھ اہل قلم کے حقوق اور محروم طبقوں کے ساتھ خواتین کے حقوق کی جنگ ہر محاذ اور فورم پر بھرپور طریق سے لڑ رہی ہیں۔ اُنھوں نے اب تک گھریلو صنعت، خودکار گھریلو کاروبار منصوبہ، محدود سرمائے سے کاروبار کا آغاز، دیہی علاقوں کے لوگوں کی تعلیم و تربیت، اشیا کا معیار اور پیداوار، آبادی کے کمزور طبقوں کے لیے ترقیاتی منصوبے، خواتین کی ترقی میں حائل رکاوٹیں، لاہور اور پنجاب میں دستکاری سے متعلق کتب اور معلوماتی فلمیں، قصور کے علاقے میں خواتین اور نوجوانوں کے لیے متبادل پیشوں کا اہتمام، ایشیا فاؤنڈیشن کے تحت خواتین کے لیے مالی تعاون، ایشیائی ترقیاتی بنک کے تعاون سے کوئٹہ، ڈیرہ اسماعیل خان اور حیدرآباد میں خواتین کی ترقی کے منصوبہ جات، عورت فاؤنڈیشن کے تحت خواتین کونسلرز کی لاہور، اٹک، سیالکوٹ میں تربیت کا اہتمام، ہنر مند خواتین کی ''کرافٹ کوآپریٹو'' کے تعاون سے مدد، ایکشن ایڈ پاکستان کے تعاون سے تھرپارکر، راجن پور، کوئٹہ میں ذاتی کاروبار کی تربیت، D.F.I.D اور R.S.P.N کے تعاون سے پس ماندہ علاقوں میں ہنر مند خواتین کی تربیت و رہنمائی وغیرہ۔

موجودہ ذمہ داری:

قومی مشیر برائے:

ILO/UNIDO/TVO/NRSP/PEMRA

چیئر پرسن ''ہنرکرافٹ'' اسلام آباد، لاہور۔

HELLO

برطانیہ کی چھہتر سالہ خاتون کے پیٹ سے آپریشن کے ذریعے قلم نکال لیا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ قلم نہ صرف درست حالت میں تھا بلکہ اُس کے اندر موجود سیاہی بھی استعمال کے قابل تھی۔ دریافت کرنے پر خاتون نے بتلایا کہ وہ پچیس برس قبل غلطی سے یہ قلم نگل گئی تھی اور اس حادثے کو بھول بیٹھی تھی۔ اُس کے پیٹ میں اکثر دردِ معدہ کی شکایت رہا کرتی تھی۔ سی۔ ٹی۔ سکین کے ذریعے قلم کی موجودگی کے بعد ڈاکٹروں نے آپریشن کا فیصلہ کیا اور اسے میڈیکل کی دنیا کا انوکھا واقعہ قرار دیتے ہوئے آپریشن کرنے والے ڈاکٹر نے مریضہ کے پیٹ سے برآمد ہونے والے قلم سے ہیلو تحریر کر کے مریضہ کی خیریت دریافت کی۔

''اُبٹن کا خمار''

فردوس حیدر (کراچی)

کشور کا اور میرا دکھ کا رشتہ ہے۔ سچّا اور کھرا رشتہ۔ خوشیوں میں تو کوئی بھی شریک ہو جاتا ہے۔ ناچیں گائیں شور مچائیں کہنے کے لیے سب ہی بھاگے چلے آتے ہیں لیکن تھوڑا نبھانے۔ اندر کی بھوک پیاس بانٹنے؟ بس ایک آدھ۔۔۔ اور یہ ہی ہم دونوں ہیں ایک آدھ۔۔۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کے لیے آنسو بہائے۔ دل جلایا اور ایک دوسرے کے دفاع میں گالیاں سُنیں۔ الزام سمیٹے۔

''تیری سہیلی ایسی ویسی۔۔۔''

''تیری سہیل کی ایسی تیسی۔۔۔''

واہ دُنیا والو۔ جو عزتِ نفس سے جی رہا ہے اس سے جینے کا حق چھینتے ہو؟ اس کی صلاحیت۔ محنت اور ذہانت سے خائف ہونا؟ اس لیے۔۔۔

وہ مرد جو کشور کے لطیفے سننے اور اس کے زوردار قہقہوں سے لُطف اندوز ہونے کی غرض سے ملتے ہیں اور ملنے کے بعد احساس کمتری یا احساس محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہی مرد اس کے لطیفوں اور گفتگو کو خارج از ادب کہہ کے باوضو ہونا چاہتے ہیں۔ یہ ہی دُہرا معیار اور منافقت کشور کی لغت میں نہیں۔ وہ جو ہے جیسی ہے ویسی ہی نظر آنا چاہتی ہے۔ اور کسی طور شرمندہ نہیں۔ لوگ اس سے پوچھتے ہیں ''تم عورت کب تک بنی رہو گی تو اُسے حیرت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اس کا جواب نہایت سادہ اور جامع یہ ہی ہوسکتا ہے ''میں عورت ہوں۔ عورت رہوں گی۔''

انسان جو کچھ ہے اسے وہی رہنا ہے وہ چاہے بھی تو کچھ اور نہیں بن سکتا۔ لیکن یہ تو مسئلہ نہیں کہ وہ عورت کیوں ہے۔ یا عورت ہوتے ہوئے اسے مرد کی زندگی بسر کرنی چاہیے۔ بلکہ مسئلہ تو یہ ہے کہ عورت کو انسان سمجھا جائے۔ اُسے غلامی اور محکومی کی زنجیر سے آزاد کیا جائے۔ اُس کے ساتھ نسل در نسل جو بددیانتی اور ناانصافی ہوتی رہی ہے اب ختم کی جائے۔ للچائی آنکھوں پینٹ کھجاتے ہاتھوں سے بچانے کے لیے عورت کو چار دیواری میں محصور کیوں کیا جائے۔ کشور عورت کو قید سے رہائی دلانا چاہتی ہے۔ صدیوں کی زنجیر کو توڑنا چاہتی ہے۔ انھیں اپنے حق مانگنے کا شعور۔ اپنی بات کہنے اور منوانے کا حق۔ اسی لیے اس کے ہر انداز میں لجاجت نہیں بلکہ مزاحمت ہے۔ احتجاج ہے۔ بغاوت ہے۔ ڈی۔ ایچ لارنس نے ایک جگہ لکھا ہے۔

''خاکستری بالوں والوں کا روّیہ کچھ اس طرح کا ہے کہ لڑکیو! تم بے شک ساری شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ دو بشرطیکہ تم اپنے غلیظ راز کو آغوش میں چھپائے رکھو''

کشور ناہید نے اسی روّیے سے بغاوت کی ہے۔ اس کی زندگی اس کی شاعری اس کی ہر تحریر یہ ہی کچھ ہے۔ جو لوگ منافقت کو اپنی شریعت نہیں سمجھتے وہ جانتے ہیں کشور کو خوش کرنے کے لیے کار کا دروازہ کھولنا ضروری نہیں۔ اس کے قریب ہونے کے لیے ذہن کا۔ دل کا۔ دیانت کا۔ انصاف کا راستہ چاہیے۔ وہ قحط زدہ عورتوں کی سُوکھی ہڈیوں کی تصویریں فروخت کرنے والوں کے قریب نہیں ہوسکتی وہ عورتوں کے حقوق پر کتاب لکھنے پر سزا دینے والوں کی دوست نہیں ہوسکتی۔ عورت کے پاؤں میں لوہے کی جوتی اور سر پر لوہے کی ٹوپی پہنانے والوں کے ساتھ نہیں ہوسکتی۔

میں کشور کو ۱۹۵۷ء سے جانتی ہوں۔ میں اس زمانے میں کشور کی بہن اقبال کی زیادہ دوست تھی۔ ہم سب ایف۔ اے کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ میرے اور اقبال کے مضامین مشترک تھے۔ فلاسفی اور فارسی۔ اقبال بہت ذہین اور پڑھا کو بڑی اصولی۔ وقت کی پابند۔ بلکہ رسم وروایات ہر چیز کی پابند۔ میں اس کے برعکس پھرونت اور کھلنڈری۔ جہاں کہیں فٹ بال یا ٹینس کا میچ ہوا میں نے سائیکل پکڑی اور کالج سے غائب۔ کبھی کنیئرڈ کالج۔ اور کبھی یونیورسٹی گراؤنڈ۔ اقبال میری نگرانی کرتی میں ٹینس کھیلتی اور وہ کورٹ کے پاس بیٹھی رہتی۔

''تم یہاں سے سائیکل اسٹینڈ کی طرف نہیں جاؤ گی۔ فلاسفی کا ٹیسٹ ہے۔ آموختہ دُہرانا ہے''۔ وہ جانتی تھی مجھے فلاسفی کی ٹیچر بے حد پسند تھی۔ وہ بہت اچھی استاد تھی۔ نہایت محبت اور شفقت سے پیش آنے والی۔

''ٹیسٹ میں نمبر کم آئے تو مِس کیا سوچیں گی؟''

میں اقبال کے محبت بھرے اصرار کے سامنے بے بس ہو جاتی۔ پھر امتحان قریب آ گئے۔ ''تمہارے پاس سواری ہے سائیکل پکڑو اور آ جاؤ مل کے پڑھیں گے'' اقبال نے مشورہ دیا۔ گھر سے نکلنے کا بہانہ سیر کی سیر اور پڑھائی بھی۔ سودا مہنگا نہ پڑا اقبال کو طلائی تمغہ ملا اور مجھے وظیفہ۔

یوں اقبال کے ساتھ کشور بھی میری دوست بن گئی بلکہ وہ گھر میرا گھر بن گیا۔ میرا زیادہ تر وقت وہیں گزرنے لگا۔

سنجیدہ گفتگو اور پڑھنے کے لیے اقبال۔ مشاعروں پر جانے کے لیے کشور۔

اسی زمانے میں اقبال کے ساتھ فارسی پڑھنے پہلی بار صوفی غلام مصطفٰے تبسم کے ہاں گئی کشور کے گھر سے قریب اسی گلی میں رہتے تھے۔

بی۔ اے فائنل کے امتحان ہونے والے تھے کہ اقبال کی شادی ہو گئی۔ اب میری پوری توجہ کشور پر ہوگئی۔ میں نے ایم۔ اے فلاسفی اور کشور نے اکنامکس میں داخلہ لیا۔ پنجاب یونیورسٹی کی فضا۔ ۔لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ۔۔ علمی وادبی گفتگو۔۔ الیکشن۔۔ مباحثے۔ ''ہم بھی کسی سے کم نہیں'' ہر ایک کی جبیں پر لکھا نظر آتا تھا۔ اسی زمانے میں کشور نے ایک لڑکے سے متعارف

کرایا۔''یہ یوسف کامران ہے۔۔۔شاعر۔۔۔''لڑکوں اورلڑکیوں کے جھرمٹ میں ایک مسکراتا ہوا چہرہ۔۔۔

''اچھا تو آپ ہیں فردوسِ بریں۔۔۔لمبے بالوں والی۔۔۔فلاسفی ڈیپارٹمنٹ''

''لمبے بال تو کشور کے بھی ہیں''۔۔۔میں ہنسی۔۔۔

''ہاں ہیں تو لیکن بلّی آنکھیں صرف تمہاری ہیں''

میں خاموش ہوگئی۔

''تم نے پوچھا نہیں کہ تمہارے بارے میں اطلاعات کون فراہم کرتا ہے۔ایک شاعر ہے میرا دوست فلاسفی میں۔۔۔تمہارا کلاس فیلو ہے۔تم سے دوستی کرنا چاہتا ہے۔''

''مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔''

میرے جواب پر یوسف ہنس دیا۔''ٹھیک ہے۔۔زبردستی تھوڑی ہے۔''

یوسف میں یہ بات اچھی تھی وہ کسی بات کو مسلط نہیں کرتا تھا۔ جو جس کا جی چاہے کرو۔لیکن بعد میں جب وہ کشور کا شوہر بن گیا تو بدل گیا۔وہی روایتی انداز خود آزادی چاہتا تھا لیکن بیوی کے لیے ذرا سوچ سمجھ کر۔۔۔وہی ملکیت اور تسلط۔۔۔گو عام لوگوں کو بالخصوص اس کے دوستوں کو کچھ نظر نہیں آتا تھا۔وہ ہمیشہ یہ ہی سمجھتے تھے کہ کشور زیادتی کرتی ہے۔کشور نے یوسف کو ملازمت سے نکلوایا۔کشور اونچا بولتی ہے۔یوسف کی عزت نہیں کرتی۔کشور فیوڈل ضابطۂ حیات کو رد کر چکی ہے۔یوسف کامران ذہنی طور پہ کبھی بھی قبول نہ کر سکا۔زبانی بہت کچھ قبول کرتا لیکن عملی طور پر صفر۔یہ اُس کا قصور نہیں تھا۔اس کے گھر والے بار بار آ کے اُسے اپنے پرانے سسٹم کی یاددہانی کراتے تھے اور یوسف کمزور انسان تھا۔کشور کے مقابلے میں بہت کمزور۔۔۔ورنہ کشور میں تو یہ کہنے کی جرأت ہے۔

''جب تُو نہیں ہوتا
تو بھی، تیرے فراق کا ہر لمحہ
تجھ جیسا ہوتا ہے''
یا پھر
''میرے اور تیرے بدن سے
رات کا شجر مہک اُٹھتا ہے''

ایم۔اے سال اوّل کے امتحان ختم ہوئے۔میں گوجرانوالہ چلی گئی۔کشور ناہید۔یوسف کامران اور کئی لڑکے لڑکیاں مجھے لینے آئے''مری چلنا ہے تیار ہو جاؤ''میں تو جیسے تیار بیٹھی تھی۔اُٹھی اور چل دی۔وہاں پہنچ کے پتہ چلا کئی شاعر آئے ہوئے ہیں۔کشور بے دھڑک ہر ایک کے پاس پہنچ جاتی تھی۔میں اور یوسف اُس کے ساتھ ساتھ مشاعرے کا اہتمام کر ڈالا۔خوب تصویریں کھینچیں۔گھومے پھرے اور میں پھر گوجرانوالہ چلی گئی۔ایک ماہ بعد اقبال کا خط آیا فوراً لاہور پہنچو۔میں نے بس پکڑی اور لاہور۔۔۔اقبال نے گلہ کیا۔کشور کسی لڑکے سے محبت کرتی ہے اور تم نے مجھے نہیں بتایا۔

''ہر دوست کا الگ الگ خانہ ہوتا ہے۔ایک کا راز دوسرے کو کیسے بتایا جا سکتا ہے''میں حیرت زدہ اقبال کو دیکھ رہی تھی۔

''کیا نام ہے اس لڑکے کا کہاں رہتا ہے؟''

میں خاموش رہی۔۔۔

''کیا وہ کشور سے شادی کرے گا۔''

''کیوں نہیں''میرے لہجے میں اعتماد تھا۔

اتنے میں امّاں کمرے میں آ گئیں۔مجھ پر قہر آلود نگاہیں۔ہاتھ میں چھری نہیں تھی ورنہ میرا قیمہ پیس دیتیں۔

''کان کھول کر سُن لے اگر شام کی اذان تک اس نے کشور سے شادی نہ کی تو پھر کشور کو ہماری مرضی سے شادی کرنی ہوگی۔ہم سختی کرنا جانتے ہیں''۔

''اگر شام تک یوسف کامران مجھے نہ ملا۔اگر وہ لاہور میں نہ ہوا۔۔۔اگر۔۔۔اُف کیا ہوگا''میں دہل گئی۔

''اماں دو تین دن کی مہلت دیں''میں گھگھیائی۔

''ہرگز نہیں۔''فیصلہ اٹل تھا۔

کشور دوسرے کمرے میں پریشان ٹہل رہی تھی۔مجھے دیکھتے ہی رو پڑی۔

''یوسف کو ڈھونڈ لاؤ۔اس کے سب ٹھکانوں پر جاؤ۔ورنہ یہ لوگ مجھے نہ جانے کس کے پلے باندھ دیں گے۔''

میں روتی ہوئی یوسف کو تلاش کرنے چل پڑی دن بھر سائیکل چلاتے میری پنڈلیاں دُکھنے لگیں۔اور شام سے پہلے میں نے یوسف کو ڈھونڈ نکالا۔امّاں کی شرط پوری ہوئی۔آج سوچتی ہوں اس دن اماں اگر چھری چاقو والی زبان استعمال نہ کرتیں۔تو میں یوسف کو نہ پکڑ لاتی اور دونوں کی شادی نہ ہوتی تو پھر کشور اتنے دکھ نہ سہتی۔۔۔لیکن پھر دُکھ کی بھٹّی سے نکل کر کُندن کیسے ہوتی۔وہ کشور ناہید کیسے بنتی جس سے لوگ خوفزدہ رہتے ہیں۔وہ اپنی بہن اقبال کی طرح اپنے شوہر کی خوشنودی کے لیے گمنام زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی۔طلائی تمغہ حاصل کرنے والی اپنے کالج کے زمانے میں تنقیدی مضامین لکھنے والی اقبال کہاں گئی؟اب صرف بچوں ہنڈکلیا پکانا سکھاتی اور کہانیاں سناتی رہی۔

''ایک دفعہ کا ذکر ہے تمہاری ماں ادب پر بہت کچھ لکھتی تھی۔۔۔کالج کے میگزین میں چھپتی تھی اور پسند کی جاتی تھی لیکن شادی کے بعد۔۔۔آگے آیت۔

اقبال کے اندر ایک بہت بڑی تنقید نگار تھی جو مر گئی۔کسی کو علم تک نہ ہوا۔سوگ ہوا نہ ماتم اور نہ (چٹائی) پھوڑی بچھی۔کیسی کیسی صلاحیتیں زنگ آلود ہو جاتی ہیں۔اور ٹیلنٹ دفن کر دیے جاتے ہیں۔لیکن اپنی صلاحیت کو منوانے سے پہلے کانٹوں بھری راہ پر برہنہ پا گزرنا ہوتا ہے۔سنگسار ہونے کا حوصلہ پیدا کرنا پڑتا ہے۔ماں کے گھر سے رخصت ہونے کا روایتی انداز ہر بیٹی کو پسند ہوتا

ہے۔ڈھولک کی تھاپ۔سکھیوں سہیلیوں کے بیچ مہندی کی سوندھی سوندھی خوشبو۔ لیکن کشور کا فیصلہ والدین کے فیصلے سے ٹکرا گیا۔اس نے اپنے سارے ارمان۔ساری خواہشیں دبا دیں۔کچھ نہیں مانگا۔کچھ نہیں چاہا۔سوائے یوسف کے۔۔۔میں آج بھی جب کشور کی یہ لائنیں پڑھتی ہوں تو سارا منظر نظروں میں گھوم جاتا ہے۔

میں دُلہن ایسی بنی لیکن
کہ مہندی تھی نہ افشاں
اور نہ اُبٹن کا خمار

میں اس کی واحد دوست اس پورے منظر نامے کا حصہ تھی۔دیوار کا سہارا لیے رو رہی تھی ماں نے چلتے سے کوئی دعا نہیں دی۔گھر کا ہر فرد جیسے ماں کا ہم خیال تھا۔خود کشور کو بھی سوچنا پڑا۔

ہوا کو نگل کر میں کس سمت جاؤں
کہ میرے پلّو میں
جگنوؤں کی جگہ بد دعا بندھی ہوئی ہے

کشور کو پیا کے گھر پہنچ کر بھی کچھ نہ ملا۔کسی نے سواگت نہیں کیا۔کسی نے دہلیز پہ تیل ڈال کر شگون نہیں لیا۔اس کے سسرال والے مجھے گالیاں دیتے رہے۔مجھے تلاش کرتے ہوئے صوفی تبسم کے پاس پہنچ گئے۔''کہاں ہے فردوس اُس نے ہماری اجازت کے بغیر ایسا قدم کیوں اُٹھایا''۔صوفی صاحب نے مجھے کہا ''لاہور چھوڑ جاؤ''۔لیکن میں کیوں ڈرتی۔میں کشور کی دوست تھی۔کشور جس نے ماں کے گھر میں سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا۔مہندی اُبٹن کے بغیر بابل کے گھر سے وداع ہو گئی جانتی تھی زندگی اس کے لیے پھولوں کی سیج نہیں۔

دروازہ جو اندھی آندھی کھول گئی ہے
بند اُسے اب کون کرے گا؟۔۔۔

وہ اندھی آندھی تھی۔جس کا اس نے مقابلہ کر لیا میں تو ایک وسیلہ تھی۔حوصلہ تو اس کا اپنا تھا فیصلہ بھی اس کا تھا۔آزاد رہنے کا فیصلہ۔

مجھے سمندر کے کنارے بیٹھی مرغابیوں کی سی آزادی چاہیے
میری آنکھ اور میری ذات دونوں قید سے رہائی چاہتے ہیں

لیکن آزادی اتنی آسانی سے کہاں ملتی ہے۔اپنا حق مانگنا پڑتا ہے۔ لڑنا پڑتا ہے۔بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔مرد خواہ تعلیم یافتہ ہو یا جاہل وہ عورت کو کسی نہ کسی طرح استعمال کرنا چاہتا ہے۔لیکن کشور کا شمار اُن عورتوں میں نہیں اس لیے کہ وہ اپنے حق کے لیے جہاد کر سکتی ہے۔وہ کہتی ہے۔

پوسٹروں پر نیم برہنہ
موزے جوتے بیچتی عورت میرا نام نہیں

اور وہ یہ بھی کہتی ہے

برف کی دیوار میں
اب کے میں چنوا دی جاؤں گی
کہ مجھے آگ سے کھیلتا دیکھ کے
دانش مندوں نے یہ ہی فیصلہ کیا ہے۔

وہ سب کچھ جانتی ہے۔اپنوں کے روّیے۔غیروں کی نکتہ چینی۔دانشمندوں کے فیصلے۔وہ کسی سے ہراساں۔کسی سے خائف نہیں۔خوفزدہ تو وہ ہو جسے کچھ ٹوٹ جانے۔چھن جانے۔کھو جانے کا اندیشہ ہو۔اس نے تو جو کر دیا سو کر دیا۔اُسے کوئی ملال نہیں۔اس کا ہر فیصلہ اپنا فیصلہ تھا۔ہر انجام سے واقف تھی۔

میں کہ جس نے
اندر کی گڑیا کے بازو، ٹانگیں اور سر
خود ہی الگ الگ کر کے پھینکا تھا

کشور تو اب اس مقام پر پہنچ گئی ہے کہ لوگ اس سے خوفزدہ رہتے ہیں۔اس لیے کہ وہ سچی اور کھری ہے۔بہتوں کے رازوں کی امین ہے۔وہ جو اسے گالیاں دیتے رہے اس کی مخالفت کرتے رہے۔اس کے بارے میں غیر مہذب گفتگو کرتے رہے۔جب اُن پر کوئی آفت آئی۔مصیبت پڑی۔بُرا وقت آیا تو سب کچھ بھول بھال کشور ناہید ڈھال بنی۔تحفظ کا احساس دلاتی محبت نچھاور کرتی ہوئی موجود۔

وہ جو دوسروں کو تحفظ دیتی ہے۔محبت نچھاور کرتی ہے۔دراصل اس کے اندر اس کی طلب موجود ہے۔اپنے اندر کی گڑیا کے بازو ٹانگیں اور سر الگ الگ کر کے پھینکنا آسان نہیں۔

انسان کہیں بھی چلا جائے۔زندگی کی ہر مہم سر کر لے۔کامیاب زندگی بسر کر لے لیکن بچپن اس کا تعاقب کرتا رہتا ہے۔وہ جو کچھ بھی ہوتا ہے یا بننا چاہتا ہے بچپن کا کردار اہم ہوتا ہے۔کشور کے بچپن سے وابستہ شخصیات کو دائرہ اعتراض میں لانا میرا مقصود نہیں۔ماں سخت گیر تھی۔ہاں تھی۔مان لیا۔وہ طبعاً ایسی ہی تھی۔سات بچوں کی ماں تھی۔آخر کشور پر زیادہ اثر کیوں ہوا۔اس لیے کہ کشور اپنے بہن بھائیوں سے مختلف تھی۔جب وسائل محدود ہوں اور سب بچے کھیپ میں پل رہے ہوں تو ایسا ہوتا ہے۔کسی ایک پر خصوصی توجہ نہیں دی جا سکتی۔

میری ماں بھی ایسی ہی تھی۔سات بچوں کی ماں۔محدود وسائل اور میں مختلف۔۔۔توجہ حاصل کرنے کے لیے گھر سے باہر بھاگتی۔میں جیسی تھی۔میرا ہونا میرے اختیار میں نہ تھا میں کشور کے ہاں جاتی۔اُسے ڈانٹ پڑتی تو مجھے لگتا کشور کی بجائے مجھے ڈانٹا جا رہا ہے۔اس لیے میں صرف اور صرف کشور کی دوست بن گئی۔

کشور بھیڑ میں ہمیشہ تنہا ہوتی ہے اور تنہائی میں اپنے اندر انجمن سجائے رکھتی ہے۔یہ ہی اس کی کامیابی کا راز ہے۔جس طرح اچھی نظم ایک بار پڑھیں تو سمجھ میں نہیں آتی۔اسے سمجھنے کے لیے۔اُس سے لطف اندوز ہونے کے لیے بار بار پڑھنا پڑتا ہے۔اسی طرح ایک بار ملنے سے کشور ناہید سمجھ میں نہیں آتی۔وہ پھولن دیوی ہے اور نہ ہی اُسے نسائی بوطیقا کی تلاش ہے۔وہ انسان ہے اور اسے انسانیت کی تلاش ہے۔

''زمیں کی بیٹی کی تصویر''

اصغر ندیم سید
(لاہور)

زرد اوڑھنی سے سانولی لڑکی کو باہر نکلنے کے لیے اتنی دیر لگتی ہے۔ جتنا ایک زخم کو ہسپتال سے نکلنے کے لیے یا جتنا ایک قوم کو اپنی تاریخ کے قدموں میں گرتے ہوئے وقت لگتا ہے۔ یا ایک چیخ کو دبے ہوئے جذبات کے نیچے سے نکلتے ہوئے۔ یا ایک بیوی کو جنرل سٹور میں بدلتے ہوئے جتنا عرصہ لگتا ہے۔ یا تو اور بھی بہت سے ہیں لیکن عورتیں اُس آدمی پر بہت شک کرتی ہیں جو عام زندگی میں زیادہ ''یا'' استعمال کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ لیکن میں جس خاتون کے متعلق بات کر رہا ہوں وہ انسان کی اس طرح کی تخصیص کے خلاف ہے کہ اُسے عورت اور مرد کے خانوں میں بانٹ کر رکھا جائے۔ اگرچہ اُس کے پرس میں بے شمار لاکرز رکھے ہیں۔ کسی میں نیلا تھوتھا ہے جو کلر بلائنڈ لوگوں کے لیے ہے۔ کس میں مصری ہے جو اُس نے زنانِ مصر سے چھینی ہے۔ کسی میں ''لاہور نامہ'' کا محاورہ ہے۔ جو محکمہ موسمیات کے تعاون سے پروان چڑھا ہے۔ کسی میں مُنو بھائی کے گریبان کے بٹن ہیں (منّو بھائی سے کسی کو یہ بھی مل جائے تو غنیمت ہے) کسی میں پیراہن یوسف کے ٹکڑے ہیں۔ کسی میں فیض احمد فیضؔ کی جلاوطنی کی فوٹوسٹیٹ کاپی ہے ۔کسی میں زاہد ڈار کی وِنجھلی اور کتاب ہے۔ جس کے سارے ورق جڑے ہوئے ہیں۔ اور کسی میں زرد اوڑھنی ہے جسے وہ چپکے چپکے نکال کر دیکھ لیتی ہے۔ اس کی زرد اوڑھنی پر ایک پھول کاڑھا ہوا ہے۔ جو راتوں کو کھلتا ہے۔ عورت بھی رات کو کھلنے والا پھول ہے جو دن کو درخت بن جاتا ہے جس پر اُس کے شوہر کے بچے جھولا جھولتے ہیں۔ بیوی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ شوہر اُس کے ساتھ جو ٹھگی کرتا ہے۔ کم از کم اس کا اقرار نہ کرے جھوٹ بولتا رہے۔ یہ جھوٹ اُس کا سچ ہوتا ہے۔ اس جھوٹ کے سچ سے بچنے کے لیے اس نے زرد اوڑھنی سے ساڑھی تک کا فاصلہ طے کیا ہے اور عورت سے انسان تک کی منازل عبور کی ہیں۔

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی تلاش میں نکلیں تو اچانک سامنے دیوار آ جاتی ہے۔ جس پر لکھا ہوتا ہے کہ ''پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے''۔ یا لکھا ہوتا ہے یہاں سے آگے تو وہ شخص خود نہیں جا سکا آپ کدھر جا رہے ہیں۔ بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی تلاش میں نکلیں تو راستے ہی راستے چوراہے اور کئی قسم کے موڑ آتے ہیں۔ بس یہاں خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کشور ناہید ایسی شخصیتوں میں سے ہیں۔ اگر پروگرام ''کسوٹی'' کے ذریعے اُسے بوجھا جائے تو تین سے زیادہ سوال نہیں بنتے۔ مثلاً مرد ہے یا عورت ہے۔ زندہ ہے یا مُردہ۔ لاہور میں رہتی ہے اور بس۔ اس کے بعد آپ نے شخصیت بوجھ لی۔ اب اگر آپ چاہیں تو بجھوانے اولے کو بیس سوالوں تک تنگ کر سکتے ہیں۔ مثلاً یہ پُوچھ کر کہ وہ جس کا ڈرائنگ روم تیسری دنیا کا ''برگر الیون'' ہے یا ''سالٹ اینڈ پیپر'' ہے یا وہ جس کے تھیٹر کے اداکار اپنے گھروں میں بھی اداکاری کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن کیا کشور ناہید کو یہاں تک بوجھ لینا کافی ہے۔ کیا وہ تین سوالوں سے بوجھی جا سکتی ہے۔ میرے خیال میں تین ہزار سال بھی اُسے بوجھنے کے لیے ناکافی ہیں۔ اُس کے پاس کوئی ماسک نہیں ہے۔ وہ چھپی ہوئی بھی نہیں ہے۔ جو چیز ظاہر ہو اُسے پانا تو اور بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے میں دن میں جگنو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ کو میری ناکامی پر ہنسنے کا پورا حق حاصل ہے۔ بعض لوگ اپنی ذات میں انجمن ہوتے ہیں۔ کشور کے ساتھ معاملہ اُلٹ ہے۔ وہ انجمن میں ذات ہے۔ کوئی انجمن اس کے بغیر نہیں سج سکتی۔ اگر سج بھی جاتی ہے تو گونگی رہتی ہے یا زیادہ سے زیادہ ٹھٹھّی رہتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے پر جملے اچھالنے کی خواہش کو مٹھی میں دبائے بیٹھے رہتے ہیں۔

انھیں لبِ گویا کشور کے آنے کے بعد ملتے ہیں۔

اور پھر سب اپنی اپنی جیبوں سے مسکراہٹ نکال کر پہن لیتے ہیں۔

اس لیے کہ مسکراہٹ کے علاوہ اُن کی جیبوں سے آج تک کچھ نہیں نکلا۔ ایک تو سفید پوشی کے بہانے نے سب کا خون سفید کر دیا ہے۔ دوسرا کھلانے پلانے کے معاملے میں یہاں کے ہر ادیب کے تعلقات اپنی بیوی سے مستقل خراب رہتے ہیں۔ بلکہ طلاقوں تک بھی نوبت آ جاتی ہے۔ چونکہ کشور ناہید کی کوئی بیوی نہیں ہے۔ اس لیے کھانے پینے کی جتنی محفلیں اس کے ہاں ہوتی ہیں، انھیں اگر ایک طرف رکھ دیا جائے تو لاہور کی زندہ دلی کا پول کھل جائے۔ کھلانے کا کام کشور ناہید کے ذمے اور پلانے کا یوسف مرحوم کے ذمے ہوتا تھا۔ اس لیے میرے تعلقات یوسف سے ہمیشہ اچھے رہتے تھے۔ البتہ کشور سے تعلقات ایک سے رکھنا بڑا جگرے کا کام ہے۔ یوں سمجھ لیں کشور سے دوستی تنی ہوئی رسی پر چلنے کے مترادف ہے۔ خاتون کوئی بھی ہو چمٹا استعمال کرنا اس کی جبلّت میں شامل ہوتا ہے۔ چاہے سوئی گیس ہی کیوں نہ آ جائے۔ اور چاہے خاتون باروچی خانے سے اُٹھ کر دفتر میں کیوں نہ بیٹھ جائے۔ ایک چمٹا ہر وقت موجود رہتا ہے اور باروچی خانے میں فائلیں! چمٹا وہ ایسے لوگوں کے لیے استعمال کرتی ہے جو اُسے بہن بنانے کے لیے لمبی چوڑی تمہید باندھ کر آتے ہیں۔ یا جن کے لیے شہر کا کوئی ڈرائنگ روم کھلنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ یا پھر یہ چمٹا ان لوگوں پر استعمال ہوتا ہے جو اپنے شاعر ہونے کا سٹیفکیٹ معہ ہرجہ خرچہ لینے کے لیے اس کے پاس آتے ہیں۔ یہ چمٹا اُن نقادوں کو بھی اچھی طرح پہچانتا ہے جو یہ پوچھنے کے لیے وہاں آتے ہیں کہ کوئی مضمون وغیرہ تو نہیں لکھوانا۔۔۔

کشور ناہید جس شعبے میں بھی گئی۔ وہ شعبہ اُس کی وجہ سے مشہور ہوا۔ کیونکہ ادیبوں کا قبلہ اُس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اور جو لوگ اپنا قبلہ اُس

سے الگ کر لیتے ہیں وہ پہلے ہنستے ہیں پھر روتے ہیں۔ ہنستے اس لیے ہیں کہ اب کشور کی محفل سونی ہو جائے گی اور پھر روتے اس لیے ہیں کہ اکیلا ٹی ہاؤس ان کے دُکھوں کا مداوا نہیں کر سکتا۔ سو وہ باقی زندگی یاد اللہ میں بسر کر دیتے ہیں۔

کشور کو پہلے ماہنامہ پاک جمہوریت اور ''ماہِ نو'' نکالنے پر مامور کیا گیا۔ جب اس ملک سے پاک جمہوریت پوری طرح نکل گئی اور کام پورا ہو گیا تو اسے نیشنل سنٹر میں بٹھا دیا گیا۔ یہاں اس کے ذمہ جمہوریت اور سماج دشمن عناصر کے خلاف مذاکرے کرانے کا کام سپرد کر دیا گیا اور پھر جب ملک میں دوبارہ پاک جمہوریت کو داخل ہونے کی اجازت مل گئی تو کشور ناہید کو پھر پاک جمہوریت اور ماہِ نو کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ وہ جہاں بھی جاتی ہے اپنا سیکرٹریٹ ساتھ لے کر جاتی ہے۔ یہ تو خیر دفتر ہے کشور کو اگر فائر بریگیڈ میں بھی لگا دیا جائے تو وہ وہاں بھی اپنا سیکرٹریٹ قائم کرے گی۔ بقول انتظار حسین جہاں پر سب فیصلے ہوتے ہیں۔ کس کو اِن کرنا ہے کس کو آؤٹ۔ ویسے تو اب بھی فائر بریگیڈ ہی کا کام کر رہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جب کہیں آگ نہیں لگتی تو کبھی کبھی یہ کام اسے خود کرنا پڑتا ہے۔

ہمارے ہاں قیام پاکستان کے بعد ادیبوں اور شاعروں کا ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا ہے جس کا کام ہر دور میں گرفتار ہونا اور جیل جانا ہے۔ اور واپس آ کر اس قیام کی صعوبتیں بیان کرنا ہے۔ جب صعوبتوں کے یہ قصّے ختم ہو جاتے ہیں تو وہ دوبارہ جیل چلے جاتے ہیں۔ عام طور پر اُن کے اہل خانہ کے لیے سکھ کا زمانہ وہی ہوتا ہے جب وہ جیل میں ہوتے ہیں کیونکہ اُسی زمانے میں اُن کے صحن میں ایک ہاتھ کھلتا ہے جس میں مُٹھی بھر آٹا۔ دال دلیہ اور دلاسہ ہوتا ہے۔ یہ ہاتھ چپکے سے اُس نظم کا خسارہ پورا کرتا ہے جس کے لفظ زنجیر کی کڑیاں بن جاتے ہیں۔ جیل جانے سے پہلے یہ ادیب اور شاعر کشور کو تلاشی دے کر جاتے ہیں کہ دیکھ لو ہماری جیبوں میں معافی نامہ نہیں ہے۔ اور واپس آ کر یقین دلاتے ہیں کہ ان کی رہائی صرف اس لیے عمل میں آئی ہے کہ اُنھوں نے جیل میں جو کچھ لکھا ہے وہ باہر جا کر سُنا آئیں۔ اس لیے جونہی یہ کام مکمل ہو گا ہم واپس چلے جائیں گے۔ ایک طرف تو کشور سے ان کا یہ تعلق ہے۔ دوسری طرف یہی لوگ کشور کے متعلق یہ کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ یار یہ کشور ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ اندر سے حکومت سے ملی ہوئی ہے اس نے ہمیں جیل بھجوا دیا۔ اور خود باہر ہے اسے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ حالانکہ یہ بات بھی انہیں سمجھنی چاہیے کہ اگر کشور بھی ان کے ساتھ جیل چلی جائے تو ان کے بال بچوں کو کون پوچھے گا۔ اس پر ہمیں ایک واقعہ یاد آ گیا ہے۔ ایک دفعہ مجید امجد مرحوم اور ہمارے ماموں حسن رضا گردیزی جو کہ سرائیکی کے نامور شاعر ہیں مُجرا دیکھنے ایک کوٹھے پر چڑھ گئے۔ ان دنوں حسن رضا گردیزی ساہیوال میں تحصیل دار ہوا کرتے تھے۔ ابھی گانا شروع ہی ہوا تھا کہ پولیس کا چھاپہ پڑ گیا۔ رضا طبلچی کو دھکا دے کر اُس کی ٹوپی پہنی اور طبلہ بجانے لگے۔ مجید امجد جہاں بیٹھے تھے وہیں بیٹھے رہ گئے۔ پولیس پکڑ کر لے گئی۔ وہ دل ہی دل میں گردیزی صاحب کی بے وفائی اور طوطا چشمی پر کڑھتے ہوئے اور زمانے کی بے بضاعتی پر غور کرتے ہوئے تھانے چلے گئے۔ گردیزی صاحب ان کے جانے کے بعد گھر گئے اور تھانے دار کو فون کیا اور اُسے بتایا کہ وہ ایک عظیم شاعر کو حراست میں لے گیا ہے اور اگر اُس نے باعزت رہا نہ کیا تو صبح اُس کی پیٹی اُتر جائے گی۔ چنانچہ مجید امجد اُسی وقت گھر واپس آ گئے اور آ کر گردیزی صاحب سے اس حرکت کا گلہ کیا۔ گردیزی صاحب نے کہا اگر میں ایسا نہ کرتا تو اس وقت ہم دونوں اندر ہوتے۔ چنانچہ کشور کا معاملہ بھی یہی ہے۔ وہ اگر باہر نہ رہے تو اندر والوں کا خیال کون کرے۔

ویسے کشور اندر ہی کسی سے ملی ہوئی ضرور ہے۔ ورنہ جو منصوبے وہ سوچتی ہے ان پر کبھی عمل نہ کر سکتی۔ سیمون ڈی بوار نے ایک جگہ لکھا ہے کہ عورت کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ لمبے عرصے کے لیے سوچتی ہے اور Plan کرتی ہے۔ بس یہیں سے اس کے خواب ٹوٹنا شروع ہو جاتے ہیں کشور اس بات کی تردید کرتی ہے۔ وہ ہمیشہ لمبے عرصے کی Planing کرتی ہے اور اس میں کامیاب بھی ہوتی ہے۔ اس لیے اُسے پلاننگ کمیشن کا چیئرپرسن ہونا چاہیے۔ اس کے پاس کام کرنے والوں کی ایک ٹیم ہے جس میں فنانسر بھی ہیں۔ خالی خولی مشورے دینے والے بھی ہیں۔ آرٹسٹ بھی ہیں۔ اداکار بھی ہیں۔ گن مُٹھے بھی ہیں۔ ٹھٹھے بھی ہیں۔ سواریاں ڈھونے والے بھی ہیں۔ کرسیاں لگانے والے بھی ہیں۔ حلیم پکانے والے بھی ہیں۔ حلیم الطبع بھی ہیں۔ مُنہ بسورنے والے بھی ہیں۔ گلا پھاڑ کے ہنسنے والے بھی ہیں۔

یہ سب کشور کا گروپ کہلاتا ہے۔ بلکہ کشور گروپ آف انڈسٹریز ہے۔ اور اسے کام کرتے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ ایک ہاتھ سے کتنے کام نمٹا رہی ہے۔ اس ہاتھ چمچہ۔ قلم اور ٹیلی فون کے ساتھ ساتھ اسے اپنی ساڑھی کا پلّو بھی سنبھالنا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ بھی اب سرکاری فرائض میں شمار ہونے لگا ہے۔ اس ہاتھ کے علاوہ دوسرا ہاتھ بھی ہے جو اُس نے اپنے سینے پر رکھا ہوا ہے۔ ہم لوگ ایک ہاتھ کی مخلوق ہیں۔ ہمارا دوسرا ہاتھ مستقلاً سینے پر یا آنکھوں پر رکھا ہوا ہے۔ ہمیں اس طرح جینے کے لیے کہا گیا ہے۔ ہمارے جسم میں حرارت ختم ہونے لگتی ہے تو ہم ماچس کی تیلی جلا لیتے ہیں۔ ہمیں کوئی گھُور کے دیکھتا ہے تو ہم اپنی نظموں میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کشور نے اپنی شاعری سے ایک آرٹ گیلری بنائی ہے۔ جہاں وہ اکیلی اپنی نظموں سے باتیں کرتی ہے۔ اپنی نظموں کو اس زمانے کا چال چلن سمجھاتی ہے۔ تاکہ یہ نظمیں اپنے پڑھنے والوں سے بہتر کلام کر سکیں۔ اس آرٹ گیلری میں شراب کی خالی بوتلیں رکھی ہیں۔ کسی بوتل میں سمندر کی جھاگ ہے۔ کسی میں ہجرت کرنے والے پرندے کا ٹوٹا ہوا پر ہے۔ کسی میں خود مختار علاقوں کی ہوا ہے۔ اور کسی میں رات کو کھلنے والا پھول ہے۔ کبھی کبھی شاعری کرتے ہوئے میں نے کشور کو اُس درخت کی طرح دیکھا ہے۔ جس سے ابھی ابھی کسی نے منوں پھل ٹوکرے بھر بھر کے اتار لیا ہو۔ اور کبھی کبھی وہ شاعری کے لباس میں پچھلی رات کا چاند بن جاتی ہے جو سمندر کو اپنی طرف گھسیٹ کر آہستہ آہستہ نیچے جا رہا ہوتا ہے۔ کشور ایک امیج سے دوسرے امیج میں منتقل ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ

''ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے''

صغیر ملال

(لاہور)

''جو کشور ناہید کے پھندے میں آ گیا دونوں جہان سے گیا''

''انتہا ہے انتہا۔۔۔'' ''باریک کام کی ماسٹر ہے''

''دُکھی ہے یار۔''

''دُکھی؟ ایسے دُکھ اللہ سب کو دے۔''

"Who is Kishwar?"

"An Urdu poetess from Lahore"

"Do you know? I consider her a source of Inspiration for budding writers."

''یہ کیا کہہ رہا ہے؟''

''کہہ رہا ہے کشور ناہید ولی اللہ ہے۔''

''میں نے کب کہا؟''

''مطلب تو اس کا یہی نکلتا ہے۔''

''مطلب تو اس کا یہ نہیں نکلتا۔ لیکن تمہارے لیے تو وہ ولی اللہ بھی ثابت ہوئی ہے''

''چلو کوئی اور بات کریں''

مگر کوئی اور بات کیونکر کریں۔ ادیبوں کی محفل ہو اور ادبی شخصیات زیرِ بحث نہ آئیں۔ ناممکن! اور کشور ناہید اس لحاظ سے خوش نصیب ہے کہ

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ

''ہر'' محفل میں ہے۔

انگریزوں کا مشاہدہ ہے کہ بڑے دماغ کے لوگ خیالات کو موضوعِ گفتگو بناتے ہیں جبکہ چھوٹے لوگ اپنے ساتھیوں کی شخصیتوں پر باتیں کرتے زندگی گزار دیتے ہیں۔ اس اصول کو درست تسلیم کر لیا جائے تو اردو ادیبوں میں ''بڑا دماغ'' تلاش کرنے میں سانس اکھڑ جائے گی۔ قدیم چینی دانشوروں سے جب کوئی کہتا کہ وہ سچ کی تلاش میں گھر بار ترک کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ لامحالہ اسے یہ الفاظ کہتے تھے۔

"Don't seek after the truth Just stop holding opinions."

لیکن ہم لوگ تو ہمہ وقت چیزوں اور انسانوں کے بارے میں اپنی اچھی یا بُری رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم صداقت سے بہت دُور ہیں۔

میں اردو ادیب ہوں اور گناہ گار ہوں کہ دنیا و مافیہا کے بارے میں اچھی بُری رائے رکھتا ہوں اور جہاں موقع ملے اس کا اظہار کر دیتا ہوں۔ لیکن کشور کے بارے میں میری کوئی منفی یا مثبت رائے نہیں ہے۔ اس کے باوجود گزشتہ بارہ سال سے لاہور پہنچ کر مکروہاتِ منصبی سے فارغ ہوتے ہی میں جلد از جلد کشور کے پاس زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی تگ و دو کرتا ہوں۔ ابتدا میں اس معمے کی کشور کے لیے میں نے حکمت سے کام لینا چاہا تھا۔ ناکام ہونے پر میں ایک مرتبہ پھر اپنے پاسبانِ عقل کی ناقص کارکردگی پر جھنجھلایا تھا۔ معلوم نہیں کیوں؟ لوگ شکایت کرتے ہیں کہ یاروں کے ایک سے زیادہ رُوپ ہیں۔ مجھے تو ''یک رنگ'' آدمی کی صحبت میں ہول اُٹھتا ہے۔ عالمِ تلوین اور تمکین کا مسئلہ مختلف ہے۔ ممکن ہے دُرونِ ذات کشور درجۂ ''تمکنت'' ہی پر فائز ہو، مگر بیرونی صورتِ حال میں وہ مجھے ہر مرتبہ ''جہانِ نَو'' محسوس ہوئی۔ (۱۹۸۱ء میں اُس نے ایک ٹھیک ٹھاک ادیب کو معمولی سی بات پر ذرا سا ناخوش ہو کر اتنا زیادہ ڈانٹا کہ وہ خاکسار مزید لجلجا گیا۔ اور ۱۹۸۷ء میں وہ تلاشِ روزگار میں مصروف ایک نوجوان کے سلسلے میں دنیا بھر سے ''بات'' کرنے کے بعد اُسے کامیاب زندگی گزارنے کے اصول بتانے لگی۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ کسی دن کوئی مردِ دانا مجھے اس کا مطلب بتا دے گا۔ مگر اب تک تو میں فقط یہ جانتا ہوں کہ ۱۹۸۱ء میں مجھے اُس ادیب پر ترس آیا کہ ایک ''عورت'' کی پھٹکار سے اُس کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ اور ۱۹۸۷ء میں اُس ''صاحبزادے'' پر غصہ آیا تھا کہ وہ تمام سفارشیں اور ہمدردیاں حاصل کرنے کے بعد چائے اور بسکٹ کے لیے بھی بیٹھ گیا تھا۔

مجذوب فرنگی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''ظالم شخص دوست بنا نہیں سکتا اور مظلوم شخص دوست بن نہیں سکتا۔ ہر عورت میں ایک ظالم اور ایک مظلوم موجود ہوتا ہے، اس لیے عورت اب تک دوستی کے منصب پر فائز ہونے کے قابل نہیں ہوئی۔ وہ بے چاری فقط محبت کر سکتی ہے۔ اور جس سے وہ محبت نہ کر سکے۔۔۔ اُس سے نفرت کرنے لگتی ہے؟

میں استاد نطشے کا بہت بڑا مدّاح ہوں۔ اور مکمل male chawvinist نہ ہونے کے باوجود مرد کی عورت پر فضیلت کا قائل ہوں۔ لیکن کوئی اصول مستثنیات سے خالی نہیں ہوتا۔ اور کشور ناہید ان معدودے چند عورتوں میں سے ہے جن سے مل کر کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ ابھی وہ گاڑی کا رُخ کسی مہنگے چینی ریستوران کی جانب موڑ دیں گی اور آپ کو ان کی صحبت کی قیمت ایک لمبے چوڑے بل کے ذریعے ادا کرنی ہوگی۔ وہ تو جو اُس کے گھر میں حاضر ہو بلا حجت سامنے رکھ دیتی ہے، اور خود ایک کونے میں سمٹ کر آپ کو کھاتے دیکھتی رہتی ہے۔ جب آپ کے ذہن میں آتا ہے کہ اب وہ اس طرح کی کوئی بات کرنے والی ہے کہ:

''اور لو۔''

''چاول تو چکھّے ہی نہیں۔''

تو اُس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

''اردو ادیب معیاری کتابوں کا مطالعہ کیوں نہیں کرتے؟''

''تراجم! اچھے تراجم کی بھی بہت کمی ہے۔''

خدا گواہ ہے میں نے آج تک کسی کو ادیبوں کا اتنا ہمدرد نہیں پایا۔ ناخوش مُرادآبادی سے شاد لاہوری تک سب کشور سے مدد مانگتے اور مراد پاتے ہیں۔ ایک بار میں نے اُسے گلوکارہ ریشماں کی حق تلفی ہونے پر مضطرب الحال پایا تو کہا ''غیر مُلکی دوروں میں شو بزنس والوں کے ساتھ اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔ آپ کیوں تڑپ رہی ہیں۔''

''گلوکار بھی فن کار ہوتے ہیں۔'' کشور نے جواب دیا۔ ''ان میں بھی ادیبوں جیسی سادہ لوحی ہوتی ہے۔''

کشور ناہید ادب کی بہترین پارکھ ہے۔ ایک زمانے میں وہ ادبِ لطیف کی ادارت کرتی تھی، اور میں بزعم خُود مشہور غزل گو بن چکا تھا۔ میں نے ایک غزل اشاعت کے لیے بھیجی۔ کشور کا جواب آیا۔

ڈیئر مغیر

یہ ایسی غزل نہیں ہے جس کی میں تم سے توقع رکھتی ہوں۔ میں تمہاری اس سے اچھی غزلیں پڑھ چکی ہوں۔

کشور

ظاہر ہے کہ وہ غزل کشور نے ادب لطیف میں نہیں چھاپی۔ ایک سال بعد جب میں اپنا مجموعہ ترتیب دے رہا تھا تو مدّت بعد پڑھنے پر خود مجھے بھی اپنی وہ غزل ـــ اچھی نہیں لگی، اور یوں وہ غزل مجموعے سے باہر ہو گئی۔ قریباً آٹھ سال بعد جب وہ ''ماہِ نو'' کی فل ٹائم مدیر تھی تو میں نے چند مختصر افسانے روانہ کیے۔ جواب آیا۔

''اچھے ہیں۔ مختلف ذائقہ ہے۔ چھاپُوں گی۔''

کشور کی ادبی پرکھ کو میں فقط اپنی تحریروں پر منطبق کر کے عظیم ثابت نہیں کر رہا، میں نے اُسے اُن شاعروں کی غزلیں سُنا کر بھی بغور دیکھا ہے جنہیں وہ بحیثیت شاعر پسند نہیں کرتی۔ اُس نے اچھے مصرعے، یہاں تک کہ اچھی ترکیب کی بھی داد دی۔ مجھے بھی لفظوں کا بیوپار کرتے عمر گزر گئی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جھوٹی داد دینا تو ممکن ہے، لیکن خوبصورت مصرعہ سُن کر آنکھوں میں بجلی کا جو کوندا لپکتا ہے، اس کی اداکاری ناممکن ہے۔

گوتم بدھ کا کہنا تھا کہ جس فکری تحریک میں عورتیں شامل ہو جائیں اس تحریک کی عمر آدھی رہ جاتی ہے۔ مجھ ہیچمداں نے تو یہ دیکھا کہ جس ادبی تحریک میں کشور شامل ہوئی اُس کے اعتبار میں اضافہ ہوا اور جس رسالے کی ادارت اُس کے سُپرد ہوئی وہ معیار میں دوچند ہوا۔ کشور کے مطالبے پر کاہل سے کاہل آدمی ترجمے کرنے لگتا ہے۔ محض لفاظی کرنے والا غزل گو اپنے مصرعوں میں جان ڈالنے کی کوشش کرتا ہے، کوئی نادیدہ طاقت افسانہ نگار کی نکیل کھینچ کر اُسے تیز رفتاری پر مجبور کر دیتی ہے۔ اور ''ابہامی'' نثری نظمیں کہنے والوں کے لیے تو کشور روشنی کا مینار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جنونی کیفیت میں مبتلا ہو کر اول فول بکنے والوں کے لیے لگام تخیل پر بھی غور کرتی ہوگی، اور جب وہ آشفتہ نوا، کشور جیسی ہمدرد سماعت میسر آنے پر انتہائیں چھونے لگتا ہوگا تو کشور حسرت سے دل میں کہتی ہوگی۔ ''کاش یہ اپنی گفتگو کی ''ایڈیٹنگ'' پر قدرت رکھتا''۔ اور یہ کوئی مضحک بات نہیں ہے۔ دُنیا کا تمام بڑا آرٹ اُن جنونی اذہان کی تخلیق ہے جو اپنی ''ایڈیٹنگ'' پر قدرت رکھتے تھے۔ دیوانگیٔ میر سے سب اسی لیے تو آج تک خوش ہیں کہ ''کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ۔''

کشور ناہید ادیبوں سے ہمدردی رکھتی ہے۔ اور ادیبوں سے ہمدردی رکھنا نہایت خطرناک عمل ہے۔ اگر آپ کو کبھی ویرانوں میں بھٹکنے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ ''محبت بُوٹی'' سے ضرور آشنا ہوں گے۔ نام اس کا محبت بوٹی ہے لیکن کام پریشان کرنا ہے۔ یہ کپڑوں سے کچھ اس طرح چمٹ جاتی ہے کہ اس کی باقیات بہت دنوں تک وجود کو خارش زدہ بنائے رکھتی ہیں۔ خاکم بدہن ہمارے ادیبوں میں بھی محبت بُوٹی والی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

لپٹ نہ جاؤں کہیں پیرِ تسمہ پا کی طرح
اسی لیے تو نہ کوئی شریکِ درد ہوا

کشور ناہید جن کے درد میں شریک ہوئی اُن کی اکثریت تو جانتی تھی کہ دو جمع دو، چار ہوتے ہیں، لیکن چند دُکھیارے اعداد و شمار سے ماورا ہو چکے تھے۔ انھوں نے دو اور دو کا نتیجہ کبھی تین اور کبھی پانچ نکالا، اور کشور اس گھمسان کے معرکے سے چومُکھی لڑتی گزر گئی۔

چند خوش رائے حضرات کہتے ہیں کہ کشور ناہید ''پبلک ریلیشنگ'' کے فن میں طاق ہے۔ میرے خیال میں ہمیں اس ٹرم کو بھی درست بنیادوں پر استوار کرنا ہوگا۔ ایک خوش اخلاق شخص اور تعلقاتِ عامہ کے ماہر میں آپ کیسے فرق کریں گے؟ اگر آپ یہ فرق بیان نہیں کر سکتے تو۔۔۔ ہر خوش اخلاق اور ہمدرد انسان کے بارے میں نہایت آسائش سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ''پبلک ریلیشنگ'' کرتا ہے۔ اور اگر منطق کو مزید ایک درجہ بڑھایا گیا تو ''حقوق العباد'' ادا کرنے والے کو بھی دوسرے زاویے سے دیکھا جائے گا۔ یہ دُوسرا زاویہ اُس وقت تک پریشان کُن رہے گا جب تک ''پبلک ریلیشنگ'' یا تعلقاتِ عامہ ایسے فن کو کہتے ہیں جس میں آپ ایسے افراد اور اداروں سے تعلقات خوش گوار بنائے رکھتے ہیں جو وقت پڑنے پر آپ کے کام آ سکتے ہیں۔ اگر کشور کا مسئلہ فقط پبلک ریلیشنگ ہوتا تو وہ ناخوش مرادآبادی اور شاد لاہوری (یہ نام علامتیں ہیں) کے بیٹوں کی ملازمتوں کے لیے اپنی دس فون کالیں اور بیس گھنٹے کیوں ضائع کرتی۔ یہ حضرات تو شکریے کے طور پر زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ اُس کے بیٹے کی شادی پر سہرا لکھ لائیں، جس کی (ظاہر ہے) کشور کو کبھی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اور اگر اُس کے دام تمنا میں ایک صید زبوں

ایسا ہوتا ہے جو دوسرے صید کے کام آسکے، اور وہ اس سے کام لیتی ہے تو اس میں کیا بُرائی ہے؟ کشور تو ''الف'' کو نقصان پہنچائے بغیر ''ب'' کو مستفید کر دیتی ہے۔ ہماری روایت میں تو اُن ڈاکوؤں کو بھی قابل تعظیم سمجھا گیا ہے جو دولت مندوں کو لوٹ کر ان کی متاع غریبوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ کشور کسی کو نہیں لوٹتی، اس لیے اُسے اپنے لٹنے پر ماتم کا حق حاصل ہے۔ میں اُسے اتنے نزدیک سے نہیں دیکھ سکا کہ اس کی شاعری اور شخصیت کی نشوونما اور باہمی ربط پر کچھ کہہ سکوں اور بتاؤں کہ یہ لٹنا کب فغاں بنا اور کب مُدھر گیت میں ڈھل گیا۔ کب قہقہہ بن کر سطح پر آیا، اور کب بذلہ سنجی کے طوفان میں ڈوب گیا۔ میرے اور اُس کے درمیان اوّل روز سے جو تھا، اس سے میں فقط یہ دیکھ سکا کہ ایک عورت ہے جو شاعری کی باریکیاں سمجھتی ہے۔ نثر کی گہرائی سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ تیسری دنیا کے مرد ادیبوں کی اعصابی کمزوریوں پر ہنس سکتی ہے۔ اور غور سے دیکھنے پر خود آتش دیدہ معلوم ہوتی ہے۔ میری جب اُس سے پہلی ملاقات ہوئی تو وہ ''صحو بعد المحو'' کے مقام پر تھی، اور مجھے ابھی نیا نیا یار کا جلوہ دکھائی دینا شروع ہوا تھا۔ وہ میرا تجرباتی مطالعہ کرنے کی اہل تھی۔ میں تو صرف اس کا مشاہدہ کر سکتا تھا۔ رائے قائم کرنے کا حق ''تجزیہ'' کرنے والے کو ہوتا ہے۔ میری صورتِ حال میں تو عینی شاہد وہ بچہ ہوتا ہے جو بڑوں کی عدالت میں ''چشم دید'' بیان کر کے سبکدوش ہو جاتا ہے۔ اسی لیے میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ کشور کے بارے میں میری کوئی منفی یا مثبت رائے نہیں ہے۔ میں اُسے ایک دہائی سے زیادہ عرصے سے وقتاً فوقتاً دیکھ رہا ہوں۔ اور اس عرصے میں کبھی اُس کا جلالی رُوپ سامنے آیا اور کبھی وہ جمالی انداز میں دنیا سے بات کرتی نظر آئی۔ کبھی وہ ''افسردگیٔ سوختہ جاناں ہے قہر قہر'' کی تصویر دکھائی دی اور کبھی ''ہم اس معاملے میں ذرا تیز ہی سہی'' معلوم ہوئی۔ مگر ہر حال میں اور ہر جگہ وہ اردو ادب اور ادیبوں پر بات کرنے کے لیے تیار تھی۔ اور ان کے مستقبل کو اُن کے ماضی سے بہتر بنانے کی تجویز پر ہمہ تن گوش ہو جاتی تھی۔

چوزوں والی مرغی زمین پر پڑی ہر چیز کو اپنے چوزوں کے لیے مفید یا مضر ہونے کے زاویے سے جانچتی پرکھتی ہے۔ مناسب شے نظر آنے پر وہ اُنھیں آواز دے کر بلاتی ہے اور اشارے سے بتاتی ہے کہ ''ہاں یہ تمہارے لیے توانائی بخش ثابت ہوگی'' اس تمام عرصے میں وہ خود "Selfless as melting snow" کی مثال بنی رہتی ہے۔ کشور اکثر عالمی ادب کے انبار سے وہ چیزیں لیے اُبھرتی ہے جو اردو کے جونیئر ادیبوں کی ذہنی صحت کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ جب ادیب ''بڑے'' ہو کر ناشکرے ہو جاتے ہیں تو وہ اس فطری عمل کو قبول کرتی ہے، اور دوسری کھیپ کو توانا کرنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔

یہ انہماک قیادت میں بھی نہیں ملتا
یہ سوئے نفس عبادت میں بھی نہیں ملتا

اگر میں اقلیم اردو کا سربراہ ہوتا، تو کشور کو کم از کم ''وحدتِ تاثر'' کا تمغہ ضرور دیتا۔

بقیہ: پہلی سیڑھی

تھیں۔ اب نیچے کوٹ میں بسوں کے اڈے کے پاس ایک دفتر بھی تھا۔ معلوم نہیں اماں ابا کی لڑائی ہوتی تھی کہ ناراضگی، بس یہ پتہ چلتا تھا کہ ابا جی نیچے کوٹ والے دفتر سے گھر نہیں آ رہے ہیں، یوں کئی دن گزر جاتے، پھر ایک دن دیکھتے اماں نے ساڑھی باندھی ہوئی ہے۔ کانوں میں موتیا پہنا ہوا ہے، ہنس رہی ہیں اور ابا جی گھر کی منڈیروں پر آب خورے بھر بھر کر رکھ رہے ہیں، ابا کی ناراضگی کے دنوں میں اماں کالا مرغا منگایا کرتی تھیں اور ایک بی بی آ کر یہ مرغ لے جاتی تھیں اور جواباً پڑھی ہوئی چینی اماں کو دے جاتی تھیں۔ جتنی اماں کی نمازیں بڑھتی گئیں۔ تسبیحیں اور دعائیں طول پکڑتی گئیں۔ اتنا ہی ابا جی، نماز سے لاپرواہ ہوتے گئے۔ ان کے اندر کچھ اور سودا سمارہا تھا، کوئی اور شعلہ تھا جو روشن ہو رہا تھا۔

بقیہ: ذمیں کی بیٹی

اپنی نظموں میں جو سچ بولتی ہے۔ کبھی کبھی وہ لوگوں کے منہ پر نہیں بول سکتی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ لوگوں کے حوصلے اور برداشت کے گراف سے واقف ہے۔ اُسے ستے پن۔ سطحی انداز اور گھٹیا حربوں سے شدید نفرت ہے۔ اس لیے جو دوست اس قسم کی حرکت سے مشہور ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ کشور اُسے عاق کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں مشہور ہونے سے رہ گیا ہوں۔ میں اس کے ڈر کی وجہ سے مشہوری کا ایسا کوئی کام نہیں کرتا جس سے پرواز میں کوتاہی آ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ کشور کو پڑھتے ہوئے اور اس کے متعلق سوچتے ہوئے کبھی اس قسم کا خیال نہیں آیا جیسا دوسری خواتین ادیبوں اور شاعروں کے متعلق آتا ہے۔ ہمارے ہاں خواتین ادب میں عام طور پر رعایتی اور نسوانی نمبروں سے پاس ہوتی آئی ہیں اور ان میں کچھ تو ایسی ہیں جنھیں نقاد ہارن دے کر پاس کرتے آئے ہیں۔ لیکن کشور کے ادب کو ہم کسی خانے میں نہیں ڈال سکتے۔ اسے ہم تیسری دنیا کے مخصوص انسانی روّیوں کے پس منظر اور پیش منظر میں دیکھتے ہیں۔ کہ یہ بیسویں صدی کے ایک کمزور معاشرے کے محور سے پھوٹنے والا ادب ہے۔

کشور نے گھر کو کیا دیا اور ادب کیا دیا۔ یہ مسئلہ ہماری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ البتہ مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آ گیا ہے کہ میرے والد نے جب اپنی محبوبہ کو میری ماں سے ملوایا تو میری ماں نے دیسی گھی کی پنجیری اس کے سامنے رکھی اور کہا کہ تم نے میرا حق تو مار لیا ہے۔ خدا کے لیے میرے بچوں کا حق نہ مارنا۔ اسی بات کے اُلٹ یوسف مرحوم یہاں کے ادیبوں سے یہ بات کہنے کا حق رکھتا تھا کہ تم نے میرے بچوں کا حق تو مار لیا ہے۔ خدا کے لیے میرا حق نہ مارنا۔

''بندگیٔ شہر''

(کلامِ کشور ناہید سے غیر مطبوعہ سوغات)

عطیہ سکندر علی (سکھر)

خوابوں کی پیشی

میں نے سوچا تھا
اپنے خواب بھی کپڑوں کی طرح بدل لیا کرونگی
اور تر و تازہ ہو جاؤنگی
بند صندوق میں تہہ کیے خوابوں کو نکال کر سونگھا
ان میں رکھے ہوئے کی بو آ رہی تھی۔
خواب ذرا نم بھی تھے
میں نے انہیں تازہ کرنے کو، سکھانے کو
دھوپ میں ڈالا
ہر خواب کا تہہ پر سے رنگ اڑا ہوا تھا۔
رنگت بھی ماند پڑ گئی تھی
مگر حلیے سے شناخت ہو سکتی تھی۔
محبت کے خوابوں کا رنگ
اب سرخ انار سے، بھوسلا بھوسلا
کلیجی جیسا ہو گیا تھا۔
رفاقت کے خوابوں کا رنگ
اب آسمانی سے
ملگجا ملگجا دودھیا سا ہو گیا تھا۔
وعدوں کے خوابوں کا رنگ
دہکتے قرمزی سے
راکھ ہوتے کوئلے کے رنگ سا ہو گیا تھا۔
مامتا کے خوابوں کا رنگ
سبز پتاور سے
جھریوں جھریوں سوکھا پیلا ہو گیا تھا۔
میں نے ہر رنگ کے خواب کو دھوپ میں ڈالا
تپش کے لمس نے خوابوں کو سوال بنا دیا تھا۔
میری مسکراہٹ، میری آنکھیں، میری بات
ہر چیز سوال بن گئی
میں نے کتابوں سے سوال کا جواب مانگا
ایک ہاتھ لگانے سے ساری کتابیں
زمین پر آ رہیں۔
قطار میں چیونٹیاں بھاگی جا رہی تھیں
میں بھی انکی قطار میں شامل ہو گئی
انہوں نے مجھے کوئی اہمیت نہیں دی
میں اپنے سوال لیے کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی
سامنے ایک عدالت لگی تھی
پتہ چلا روز مقدمہ لگتا ہے، روز فیصلہ ہوتا ہے
مجھے ناجائز خواب اور ناجائز سوال رکھنے کے جرم میں
چودہ سال قید کی سزا سنا دی گئی
میں جیل جانے سے پہلے گھر کپڑے لینے آئی
تو دیکھا
دھوپ میں کوئی خواب نہیں تھا۔
چند لال بیگ الٹے پڑے تڑپ رہے تھے!

○

یہ دشتِ فراموشی ٹھہرنے نہیں دیتا
لیکن درِخواہش کو بھی کھلنے نہیں دیتا

یہ رسم ہے دیوار و درِگریہ کی لیکن
در یوزہ گرِ خواب تو رونے نہیں دیتا

آشوب ہے ایسا کہ سراسیمہ ہے وحشت
یہ عجز بیاں، زخم بھی دھونے نہیں دیتا

ہاں منزلِ امید بھی نزدیک تھی لیکن
غم خانۂ جاناناں بہلنے نہیں دیتا

آنکھوں پہ وہی رنجِ اسیری ہے مسلط
جو حشر بپا ہونا ہے، ہونے نہیں دیتا

بے نام رہی خواہشِ دیدار ہمیشہ
شبنم کی طرح وہ مجھے ہنسنے نہیں دیتا

آنگن میں لہو دیکھ کے روتی نہیں آنکھیں
یہ دل تو سلگتا ہے پہ جلنے نہیں دیتا
☆

سیڑھیوں پہ ٹھہری عمر

زندگی کے سال ایسے بڑھتے ہیں
جیسے جنگلوں میں خودرو گھاس۔
جیسے ساحلوں پہ ٹوٹی ہوئی کشتیاں
جیسے لکڑی کے بوسیدہ دروازے کی چرچراہٹ
جیسے زردائے کاغذ پہ پھیکے پڑے ہوئے حرف
جیسے ہر کمرے میں بکھری ہوئی یادیں
جیسے آنکھوں پہ لگے چشمے کا بڑھتا ہوا نمبر
جیسے ہڈیوں میں بھربھرے پن کا احساس
جیسے ریت میں منتقل ہوتے دریا

زندگی کے سالوں کو سمیٹو تو
مونگ پھلی چھیلتے ہوئے
قہقہوں کی بارش
آتشدان میں دہکتی لکڑیوں کی گرمائش
سردیوں کی راتوں میں لپٹے ہوئے جسموں کے سائے
چنار کی طرح دہکتے رخسار
اور سمندر کے جھاگ کی طرح پیروں سے لپٹے ہوئے لمحات
اتنے سارے لمحات کو پکڑتے پکڑتے
میں تھکتی نہیں ہوں
مرجھاتی نہیں ہوں
ریت میں بھنتے ہوئے مکئی کے دانوں کی طرح
میں کھِل اُٹھتی ہوں۔

○

زندگی خواب دکھاتی ہے، رلاتی بھی ہے
ہم کو تائیدِ محبت یہ سکھاتی بھی ہے

کچھ نہیں تھا تو بہت کچھ تھا، تمہارے باعث
اے ستمگر تمہیں امید بلاتی بھی ہے

خوابِ ہستی تھے تم ہی اور تم ہی غائب تھے
آنکھ اشکوں سے بنھاتی ہے، ہنساتی بھی ہے

آج دیوار پہ سایہ سا کوئی لہرایا
یوں گماں ہوتا ہے دیوار بلاتی بھی ہے

نام اسکا ہی زباں پہ جو کبھی آجائے
بندگی شہر میں نقارہ بجاتی بھی ہے

میں نے ہاتھوں کے پیالوں میں بھرا تھا اسکو
جسکی صورت مجھے خوابوں میں رجھاتی بھی ہے

دل کو تسکین نہیں ملتی کسی صورت ناہیدؔ
تلملاتی ہے کبھی اور کبھی گاتی بھی ہے

☆

سونے سے پہلے ایک خیال

مجھے نومبر کی دھوپ کی طرح مت چاہو
کہ اسمیں ڈوبو تو تمازت میں نہا جاؤ
اور اس سے الگ ہو تو
ٹھنڈک کو پور پور میں اترتا دیکھو
مجھے ساون کے بادل کی طرح مت چاہو
کہ اسکا سایہ بہت گہرا
نس نس میں پیاس بجھانے والا
مگر اسکا وجود پل بھر میں ہوا
پل میں پانی کا ڈھیر
مجھے شام کی شفق کی طرح مت چاہو
کہ آسمان کے قرمزی رنگوں کی طرح
میرے گال سرخ
مگر لمحہ بھر میں
ہجر میں نہا کر، رات سی میلی میلی
مجھے چلتی ہوئی ہوا کی طرح مت چاہو
کہ جسکے قیام سے دم گھٹتا ہے
اور جسکی تیز روی قدم اکھیڑ دیتی ہے
مجھے ٹھہرے پانی کی طرح مت چاہو
کہ میں اسمیں کنول بنکے نہیں رہ سکتی ہوں
مجھے بس اتنا چاہو
کہ مجھ میں چاہے جانے کی خواہش جاگ اٹھے

"پہلی سیڑھی"

کشور ناہید

حوا نے اپنی کہانی کسے سنائی تھی!

آدم کو۔۔۔اس نے تو مشہور کر دیا میں اس کی پسلی سے نکلی تھی۔

۔۔۔۔خدا کو اس کی کتابوں نے تو مجھے ورغلانے والی اور مجازی خدا کو سجدہ کرنے والی بنا دیا۔

زمین کو۔۔۔اس نے خود کو آنکھوں میں تقسیم کیا اور سرتابی کرنے والیوں کے بے نام بدن، اس کی کوکھ میں اترتے گئے۔

آسمان کو۔۔۔ڈرپورک، بزدل، چیخ اور آواز سے بچنے کو اس نے خود نیلاھٹوں کے نظر آنے والے فریب میں چھپا لیا۔

یشودھرا نے پوچھا۔۔۔"میں تیری اور اپنی کہانی سناؤں"

حوا نے کہا۔۔۔تیر آنکھ میں زخم ہو گیا تو ہوا کے گھاؤ کے تیروں کی بارش کو کیسے گن سکے گی۔

قزوین کی بیٹی زریں تاج قرۃ العین نے کہا۔۔۔میں نے تیری جیسی زندگی کرنے کی سعی کی۔ مری رسم وراہ قلندری کو، ہر زمانے کے شاہ قاچار، جلاد کے حوالے کر دیتے ہیں۔

یونانی اسطیری دیوی Danec نے کہا "مجھے تیری سزا بھگتنے کے لیے کشتی میں بٹھا کر سمندر میں چھوڑ دیا گیا تھا اور میری کشتی نامعلوم جزیروں سے ساری عمر ٹکراتی رہی۔ میں اپنی کتھا سناؤں گی۔

سیفو اور اینا اخماتودا نے کہا "ہم سے تو ہمارے شاعری کے مسودے چھینے گئے، ہماری شاعری کو ملک کے لیے شرمناک سمجھا گیا۔ ہمیں اپنی کہانی سنانے دو۔

اندھی صفیہ بی بی نے کہا۔۔۔میں نے تو تم سے پوچھے بنا تمہاری کہانی سنا دی۔ حرام کا بچہ جننے کا قصور بھی میرا تھا اور کوڑوں کی سزا بھی میرے لئے تھی۔

حوا بلبلا اٹھی۔۔۔"کس نے دی تھیں سزا۔ کیا اس عمل میں تم اکیلی تھیں، بالکل اکیلی۔"

قدیم عہد ناموں میں واقعات کی تفصیل نہیں ملتی ہے۔ سبق سکھانے کے لئے فیصلوں اور سزاؤں کا ذکر ملتا ہے۔

اٹلی میں ویلنٹین خاندان کی ماریہ بولی "لوگ کہتے ہیں۔ کومو جھیل گلیشیر سے نکلتی ہے۔ سینکڑوں دیہات اور ہزاروں لوگ اس کے کنارے آباد ہیں، کون جانے جھیل میں کس کا کلیجہ عرق عرق ہوا۔ مجھے تو میلانو کے 48 سالہ شہزادے سے بیاہ دیا گیا تھا۔ کسی کو میری 20 سالہ جوانی نظر نہیں آئی تھی۔ سب کو وہ دولت اور طویل عریض عمارت نظر آئی تھی۔ جو آج تک شربولانی ولا کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔

میرے اندر کے شخص کو صرف ویری سمجھ سکا تھا۔ وہ ایک معروف ادیب تھا۔ اس نے جب مجھے فرانس کے مشہور ڈرامہ نگار، دیشوز کے ڈرامے ترجمہ کرنے کو دیئے تو مجھے لگا میرے اندر کی رگوں کو بولنا آ گیا ہے۔ لفظ اور ذہن کے تعلق کو بھی گناہ کی جھولی میں ڈالا گیا اور میں نے خود اپنے لئے تنہائی کی دیواریں بنا ڈالیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ مجھے تاوان کے طور پر شاہی نوادرات اور سرمایہ جذبہ جز واپس کرنے کا حکم بجالانا پڑا۔ میرے نام سے موسوم محل میں ظلم کی کہانیاں جنم لیتی رہیں۔ کلارا اور مسولینی کو بھی ہیں ولیریو نے گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔"

سرگودھا میں 8 سالہ جیکب حوالات میں بند ہے۔ وہ مجرم ہے۔ وہ مسجد کی دیوار پر کچھ لکھ رہا تھا۔ کیا پتہ کچھ لکھ بھی رہا تھا۔ مسجد کی حفاظت کرنے والوں کو جلال آ گیا۔ انہوں نے نہتے شہریوں کی حفاظت کرنے والوں کو پکارا، حوا، حوالات، جیکب

ج، چ، ح، خ۔۔۔خ سے خدا مگر ب سے بندہ۔۔۔نہیں بندر، بوزنہ بڑ۔ بےھودہ، بے ادب، باولا، بدکردار، بدبو، بے چارہ، بددعا اور بادشاہ ۔۔۔بہادری کرنے والوں، دوسروں کا بے دریغ خون بہا کر تمغے سجانے والوں کو باادب باملاحظہ بادشاہ کہتے ہیں۔

بادشاہ کی ایک بیوی ہوتی ہے۔ یشودھرا بیوی ہی تو تھی، سیتا بھی بیوی تھی اور نور جہاں بھی بیوی تھی مگر قرۃ العین طاہرہ اور امراؤ جان ادا کسی کی بیوی نہ تھیں۔ کتنوں سے ان کے متعلق داستانیں اختراع کی گئیں مگر کسی نے ان کو یاد کیا ملکہ این کی طرح۔۔۔وہاں صرف ولیم بادشاہ کے شاندار انقلاب کی بات نہیں کی جاتی ہے۔ سپین میں فرڈی لنڈ بادشاہ کے ساتھ اس کے حوالے ملتے ہیں۔ کہ عربوں کا تسلط کم کرنے میں ازابیلا کی خدمات بھی تھیں۔ روس کی کیتھرین اور آسٹریا کی تھریسا کی کامیابیوں کو کسوٹی جھولی میں ڈالا گیا۔

حوا! تم نے نام بھی بہت بدلے ہیں۔ کبھی تم نے اپنا سیکلٹن اپنا نام رکھا اور 29 سال کی عمر میں اپنی صحیح پیدائش کا اعلان کیا۔ کبھی تم فروغ فرخ زاد بنیں کبھی سارا شگفتہ اور کبھی میری ماں!

کیسی عجیب بات ہے وہ سب لوگ جو زندہ نہیں ہیں۔ ان کا احوال میں ان کے نام سے سنا رہی ہوں اور جب بھی ذکر آئے گا ان کا کہ جو بظاہر زندہ ہیں۔ وہ سب پری زادوں کی طرح بیان پائیں گے۔ ہم لوگ تو آئینے میں بھی اپنا سراپا دیکھتے ہوئے شرما جاتے ہیں۔ لفظوں میں بیان کا بوجھ کیسے اٹھا پائیں

گے! ہاں واقعی اس زمانے میں جبکہ لارنس بھی پیش پا افتادہ لگتا ہو اور ہنری ملر بھی۔نفسیاتی ناول کے دن بھی لد چکے ہوں، طویل نامختتم ناول بھی اب نہ بار پاتا ہو اور یار لوگ ناول اور افسانے کو تکنیک کی خودکاری اور لفاظی سے نجات دلانے کے لیے سرگرم ہوں۔وہاں سچ بھی لکھو تو افسانہ لگے گا۔

آج کے شخص کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ نہ فطرت کو مانتا ہے نہ تاریخ کو، نہ اپنے آپ کو۔۔۔ وہ ہے کون۔۔۔ اس کے وجود کو کون دریافت کرے گا۔ حالانکہ آج کا شخص۔۔۔ساری دنیا میں کہیں بھی تو اپنے نظریات کے باعث نہ پھانسی چڑھ رہا ہے نہ زہر کا پیالہ پی رہا ہے۔

گلیلیو، بیکن، نیوٹن، ڈیکارٹ۔۔۔کلیسیا نے ان سب کی مذمت کی تھی۔ابن الہیثم سے ابن سینا تک سبھی معتوب قرار پائے تھے۔

معتوب تو بی اماں، خالدہ ادیب خانم اور میری ماں بھی قرار پائی تھیں اور بیتا تو ان کی بھی کسی نے رقم نہیں کی جو قلعہ والیاں شہزادیاں تھیں مگر زمانے کے بدلنے پر انہوں نے لوگوں کے گھروں کے برتن مانجھے اور بالا خانے آباد کئے۔وقت اپنے آپ کو کتنے درجوں میں منقسم کرتا ہے۔

ایک تقسیم تو وہ بھی تھی جب ابا ہاپڑ سے گلاؤٹھی اماں کو بیاہنے گئے تھے۔ تین بی بیاں بیاہ کر تو آئیں مگر زیادہ دیر آباد نہ رہ سکیں۔ایک اولاد، دو اولادیں، اپنی نشانیاں دیں اور رخصت ہوئیں۔چوتھی بی بی۔۔۔ وہ سید زادی جو نو بہن بھائیوں کے خاندان میں سب سے بڑی تھیں، سمندر میں نیم جمانے کو آئی تھی، دس بارہ سال کی عمر تک اماں کی گود میں بیٹھنے والی کو منہ دکھائی میں گود میں بیٹھنے والیاں سوتیلی بیٹیاں ملیں اور ڈھیر سارے باغ، کہارنیاں، نائنیں۔ابا Court of ward میں ملازم تھے۔راج گھاٹ نرودا کے منیجر تھے۔آٹھویں کلاس میں پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔تایا نے میٹرک کیا اور پولیس سروس میں کمشنر ہو گئے تھے۔

ابا کے بارے میں سنا ہے کہ شاعری بھی کرتے تھے۔میں نے اپنے ہوش میں انہیں شعر پڑھتے، شعر سنتے یا شعر لکھتے کبھی نہیں دیکھا۔البتہ خطوں کے ذریعہ، مربوط تحریر اور جامع نفس مضمون، اس شکستہ خط تحریر میں نظر آیا، جو منشی فاضل کے امتحان میں ایک پورا پرچہ ہوتا تھا۔میرے اور ہمارے سارے بہن بھائیوں کے لیے شکستہ خط تحریر بالکل مانوس اور آسان خط تھا کہ وہ ہمارے ابا کا طرز خط تھا۔

یہ طرز خط جب میں نے ونیس کے میراث الاسلام عجائب خانے میں دیوان حالی کی شکل میں دیکھا تو دونوں صفحے جو سامنے کھلے تھے پڑھتے ہوئے بہت سکون ملا۔وہیں میرا ڈھیروں خون بڑھا جب میں نے فریدالدین عطار کے ہاتھ کا لکھا مسودہ منطق الاطیار، نظامی گنجوی کی کتاب کا مسودہ، ہاتھ سے لکھا شاہنامہ اور جامی ہی کی لکھی ''یوسف زلیخا'' سارے قلمی نسخے جس میں تاریخ طبری کا اصل نسخہ، ابن تیمور کے زمانے کے خط، ہاتھی دانت پہ ابوحاتم کی تحریر، سسلی میں لکھا گیا کلام پاک، ''کتاب النخل'' آخر یہ سب چیزیں میری میراث تھیں۔کہ میرے ابا اسی خط شکستہ میں لکھا کرتے تھے۔

اماں، مولوی سید گھرانے کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ننھیال میں سب مرد، سرسید کے پیروکار تھے۔لڑکے سارے علی گڑھ پڑھتے تھے۔ ہر ایک کو اجازت تھی جس مضمون میں چاہے ماسٹرز کرے۔علی گڑھ ہوسٹل میں لڑکوں کو چھٹیوں کے بعد کالج جانے کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔میٹھی ٹکیاں، تل کے لڈو، دیسی گھی کا گاجر کا حلوہ، نشاستے کا حلوہ، کنستروں میں بھر بھر کے ساتھ کیا جاتا تھا۔رہا لڑکیوں کا تعلیم کا مسئلہ تو وہی سرسید کا تتبع۔۔۔''لڑکیوں کو صرف قرآن ناظرہ اور بہشتی زیور پڑھایا جائے''۔میری ماں کو بھی اتنی ہی تعلیم ملی تھی۔کیا اماں نے لڑکوں کی طرح پڑھنے کی ضد کی تھی! اس کا بظاہر ثبوت تو بہن بھائیوں کے رویوں اور باتوں میں نہیں ملتا ہے۔البتہ ہماری پرورش اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ضد، اس زخم کی بازگشت لگتی ہے جہاں اماں کو پڑھنے سے روکا گیا ہوگا۔اماں کے اندر، بہت غصہ تھا، بہت ملال تھا۔ یہ ملال ان کے مزاج کی شیرینی کو مسلسل زہر آلود کرتا رہتا تھا۔اماں کی تیرہ سال کی عمر میں شادی ہوئی تھی، اماں پہلوٹھی کی اولاد، بہت چہیتی بیٹی کو بہت چہیتا شوہر نہیں ملا۔بلکہ معاملہ سیر اور سوا سیر کا ہو گیا۔بیاہ کی مہندی ابھی ہاتھوں پہ تھی، صبح کو دودھ کا پیالہ لا کر دیا، دودھ گرم تھا، غصہ اور اس حد تک کہ طلاق کے لفظ نے دودھ بھرا پیالہ ہی توڑ دیا۔اماں کمرے میں بند ہو گئیں اور آخر نانا ابو نے آ کر ہی دروازہ کھلوایا اور گھر لے گئے۔

اسی ماں کو اپنی زندگی کو نئے صحن میں تین سوتیلی جوان بیٹیوں کے ساتھ گزارنے کی پل صراط سے گزرنا پڑا۔تینوں بیٹوں کی مائیں مختلف تھیں۔ تینوں کے مزاج مختلف تھے۔گھر میں شروع ہی سے کوئی گھر والی انسیت نہ تھی۔ صبر کے کٹورے کا پانی بار بار ختم ہو جاتا تھا۔

ابا کے کم پڑھے لکھے رہ جانے کا ردعمل اس شکل میں نظر آتا ہے کہ انہوں نے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کی مخالفت کی۔اس حد تک کہ بچوں کی تعلیم کے لیے اضافی رقم دینے سے انکار کیا، گھر کا خرچ بڑھانے سے انکار کیا، ہماری ماں نے ہمیں دو کی جگہ ایک روٹی دی۔ایک لالٹین کے گرد پانچ بہن بھائیوں کو پڑھنے کے لیے بٹھایا اپنے ہاتھ سے ایک بوٹی اور شوربہ ڈال کر دیا۔بڑے، بہن بھائیوں کے چھوٹے کپڑے، بعد کے آنے والے چھوٹوں کو پہنائے۔کھانا بناتے ہوئے چولہے کے گرد سب کو بٹھا کر، اردو اور حساب سکھایا۔ہمارے ننھے ننھے ہاتھوں میں بھاری پتھر تھما کر ثابت لال مرچیں پسوائیں، جھاڑو دلوائی، روٹی پکوائی مگر کتاب سے آنکھ نہ اٹھانے کی ضد کی۔

دھولانا۔۔۔میری ننھال کا آبائی گھر اور گلاؤٹھی ننھیالی گھرانوں کا مسکن، نانا ابا نے بیٹیوں کے پڑھانے سے گریز کیا۔مگر گلاؤٹھی میں سکول کھولا تھا۔گوہر گرلز سکول، گوہر بانو۔۔۔ہمارے نانا کی والدہ کا نام تھا۔نانا فضل الرحمان خود وکیل تھے۔ایسے وکیل جن کا دفتر بالکل الگ حویلی میں تھا۔حویلی کے سامنے لمبی راہداریوں والے کمرے جن میں پیشی پہ آنے والے لوگ، محرر اور زمینوں پر مقرر قانون گو رہا کرتے تھے۔نانی اماں آمنۃ الاسلام، محلے بھر کے

بچوں کو قرآن پڑھاتی تھیں پڑھنے والے بچوں کو جاتے وقت، فصل کے آئے ہوئے پھل، خربوزے، آم، سنگھاڑے ٹوکریوں میں بھر بھر دیا کرتی تھیں۔ بچپن میں کبھی کسی کو پھل خریدتے نہیں دیکھا تھا اس خوشحالی کے باوجود، صبح کا ناشتہ، رات کی بچی روٹی اور چائے یا گھر میں بنی چھاچھ ہوتا تھا سوئیوں سے لے کر، منگو چھیوں اور بڑیوں تک، سب گھر پہ بنتی تھیں۔ دال اور سبزی کے علاوہ، تمام گھروں میں گائے کا گوشت استعمال ہوتا تھا۔ بیماروں کے لیے البتہ بکرے کا گوشت منگوایا جاتا تھا۔ مرغی اور مچھلی کا تو رواج ہی نہیں تھا۔

ہر دوپٹہ گھر میں رنگا جاتا تھا۔ ہر کپڑا گھر میں سلتا تھا، سارے مصالحے تازہ پستے تھے۔ گیہوں اور چاول گھر میں کہارنیاں صاف کیا کرتی تھیں۔ کوئی کپڑا چند دھلائیوں کے بعد ضائع نہیں کیا جاتا تھا۔ مردانہ پاجاموں کو پیوند لگنا ایک عام بات تھی۔ پرانی چادروں کے تھیلے، تکیہ غلاف اور دستر خوان بننا بھی سگھڑاپے کی نشانیاں تھیں، عروسی کے دوپٹے، دولائیوں کے ابروں کی شکل میں اور غرارے گوٹ کی شکل میں استعمال کیے جاتے تھے، ساری خوشحالی کے باوجود روٹی پہ سالن رکھ کر کھالینا، عام بات تھی۔ کفایت کا فلسفہ ہر جگہ کارفرما نظر آتا تھا، کبھی کسی ہانڈی میں سے سالن نکالنے کے بعد پانی نہیں ڈال جاتا تھا۔ باقاعدہ روٹی سے ہنڈیا پونچھی جاتی تھی۔ ماچس کی تیلی کا استعمال تو خال خال تھا۔ صبح سویرے، ہم چھوٹے بچوں کے ہاتھ میں کرچھا پکڑا دیا جاتا تھا۔ کتابوں کی جلد بندی تک گھروں میں ہوتی تھی کہ سال بھر بعد، یہ کتابیں دوسرے بچے کے کام آسکیں۔

تنگ پاجامے سردیوں میں اور ہر موسم میں ساڑھیاں اور غرارے پہنے جاتے تھے۔ زیادہ تر عورتیں وکٹورین سٹائل کے کنگورے بنا کر بال بناتی تھیں۔ بچیوں کو تو بس چنا ہوا ابرق لگا دوپٹہ مل جاتا تو بہت خوش ہوتی کہ نئے اور اچھے کپڑے اور نئے جوتے تو بس عید کے عید ہی خریدے جاتے تھے۔ جبھی تو ساری چاند رات نئے کپڑوں کو دیکھتے اور یہ سوچتے گزر جاتی تھی کہ صبح کو یہ کپڑے ہمیں پہننے کو ملیں گے۔

پریوں کی کہانیاں سنانے کا ہماری ماں کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا تھا۔ اور کوئی بڑی بوڑھی سناتی تو ملکہ وکٹوریہ کی تاج پوشی کے قصے سناتی، پہلی جنگ عظیم کی باتیں بتاتی یا پھر جنوں اور بھوتوں کے قصے سناتیں۔ اس زمانے میں ہر گھر میں کوئی نہ کوئی بھوت کا ہیولہ ضرور ہوتا تھا۔

پردے کا یہ عالم تھا کہ ہماری نانی اور ایک عمر تک ہماری اماں بھی اپنے دامادوں کے سامنے نہیں آتی تھیں۔ ڈولی دوباری میں رکھی جاتی۔ اس میں ایک پتھر رکھا جاتا، اماں اس میں بیٹھتیں، پھر کہاروں کو اندر بلایا جاتا، وہ ڈولی نانی اماں کے گھر اسی طرح دوباری میں رکھتے اور یوں مختصر سے مختصر سفر بھی طے ہوتا۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ خاتون کا اصل وزن چھپانے کے لئے ڈولی میں پتھر رکھا جاتا تھا۔ آٹے میں ہاتھ لپیٹ کر نبض دکھانا اور سقے کے گھر میں پانی بھرنے پہ، بچیوں تک کا پردے میں چھپ جانا۔۔۔ ایک معاشرتی فعل تھا۔

پردے کے سلسلے میں ہندو مسلم گھرانوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔ ہندو گھرانوں کی تمام عورتیں بھاری چادریں اوڑھ کر باہر نکلتی تھیں۔ کبھی کسی خاتون کی شکل دروازے یا کھڑکی سے نظر نہیں آتی تھی۔ جب ڈولیوں کا رواج کم ہوا تو تانگے پہ سفید چادر باندھی جاتی تھی۔ مسلمان ہندو عورتیں اسی طرح سفر کرتی تھیں۔ گھر سے گلی تک آنے کے لیے بھی دونوں طرف سے سفید چادریں پکڑے لڑکے کھڑے ہوتے اور یوں بیبیاں تانگے میں سوار ہوتیں۔

ہاپڑ۔۔۔ دھدیالی قصبہ تھا۔ ابا اپنی نوکری کے سلسلے میں شہر شہر گھومتے رہے۔ اماں اور بچے ساتھ ہوتے تھے۔ ہماری سوتیلی بہنیں بھی اماں کے ساتھ ہی ہوتی تھیں۔ ابا کو بہت اچھے کھانوں، بہت خوبصورت کپڑوں اور گہنوں کا بہت شوق تھا۔ خود فوٹو گرافی کرتے تھے۔ فلمیں ڈویلپ بھی کرتے انلارج بھی کرتے۔ اس دھن میں اماں اور بچوں کو ہر طرح کے لباس پہننے کی فرمائش کرتے، نورتن سے بازوبند تک اور ست لڑے سے پیروں کے لچھوں اور جھانجھروں تک، ہر رنگ میں انہوں نے اماں کی فوٹوز اتاری تھیں۔ اماں کے پاس اشرفیاں اور چاندی کے روپے، میں نے اپنے بچپن میں دیکھے ہیں۔ اماں وہ روپے تول کر دیا کرتی تھیں۔ اسی زمانے میں سنا تھا کہ نانا کے کمرے میں گھڑا گڑا ہوا ہے جس میں سونے چاندی کی اینٹیں بھری ہوئی ہیں۔

ریزگاری میں آنہ اور پیسہ کے علاوہ دھیلا بھی ہوتا تھا، جس کے عوض ڈھیر ساری مٹھائی مل جاتی تھی۔

گھروں میں پانی بھرنے کے لیے سقے، مشکوں میں پانی لایا کرتے تھے، باہر دروازہ بجا کر اعلان کرتے ''پردہ کرلو سقہ آیا جی'' ساری عورتیں اندر پردے میں چلی جاتیں۔ سقہ سارے گھڑوں میں پانی بھر کر چلا جاتا۔

سینما کے ابتدائی دنوں میں خاموش فلمیں چلتی تھیں۔ ہم چھت پر چڑھ کر سامنے دیوار پر خاموش چلتی فلمیں دیکھا کرتے تھے مگر وہ بھی امی ابا سے چھپ کر۔

باغوں کے بیاہ ہونے کی رسم بھی یاد ہے۔ باغ پہ پہلا پھل آنے سے پہلے، باغ کا بیاہ کیا جاتا اور سارے کا سارا پہلا پھل غریبوں میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ اماں اور ابا دونوں خودسر تھے۔ شاید جوانی میں یہ خودسری دونوں کی ادائے دلبری تھی۔ مگر ہمارے ہوش سنبھالتے کہ میں گھر میں پانچویں نمبر پر زندہ اولادوں میں سے تھی۔ دو سب سے بڑے بھائی پیدا ہوتے ہی مر گئے تھے۔ ایک بیچ کا بھی اس طرح کوچ کر گیا تھا۔ اس طرح میں آٹھویں تھی اور ابھی میرے بعد ایک بھائی اور ایک بہن آئے اور شاد آباد ہیں،

ہم نے گھر دو حصوں میں آباد دیکھا، مردان خانہ جہاں مکمل طور پر ابا کی عملداری تھی۔ دوسرا گھر کہ جہاں سب گھر والے رہتے تھے۔ بھائی جب علی گڑھ سے واپس آتے تو مردان خانے میں سوتے تھے۔ بلند شہر آنے کے بعد، ابا نے نوکری چھوڑ کر، دہلی اور بلند شہر کے درمیان بسیں چلانی شروع کر دی

باقی صفحہ نمبر ۱۵ اپر ملاحظہ کیجیے

''رنجشوں کا رفیق''

کشور ناہید

یوسف کامران نے مجھ سے شادی نہیں کی تھی۔ میں نے یوسف کامران سے شادی کی تھی۔ میری ضد پہ یہ شادی ہوئی تھی کہ مجھے خاندان والوں نے دھمکی دی تھی کہ کل سے تمہیں یونیورسٹی سے بھی اٹھالیا جائے گا اور ہم اپنی مرضی سے کل تمہاری شادی کر دیں گے۔ میں اس اعلان سے خوفزدہ تھی۔ اس لیے میں نے ہاتھ پیر جوڑ کر یوسف کو تیار کیا کہ وہ میرے ساتھ شادی کر لے، چاہے تو اس دہلیز سے باہر نکل کر مجھے چھوڑ دے کہ میں نہ اپنی پڑھائی چھوڑنا چاہتی تھی اور نہ خاندان کی مرضی سے شادی کرنے کو تیار تھی مگر یوسف بیچارے کے لیے یہ اچانک کا امتحان تھا۔ وہ ایک کھلنڈرا لڑکا تھا۔ بہت خوبصورت، بہت ہنس مکھ۔ وہ میرے ساتھ ساتھ یونیورسٹی تک پیدل چلنے کو، صوفی صاحب کے گھر کے قریب آ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ سائیکل اس کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ میں گھر سے برقعے میں نکلتی، اس کو منتظر دیکھ کر میں بھی نہال ہو جاتی۔ ہم دونوں باتیں کرتے اپنی کلاس میں صبح سات بجے پہنچ جاتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری آمدورفت کا پورا ریکارڈ میرا چھوٹا بھائی ''پل پل'' گھر پہنچا رہا ہے۔

اس زمانے میں دن یونورسٹی، برٹش کونسل لائبریری اور پھر کافی ہاؤس میں گزرتا۔ شام ڈھلے میں گھر پہنچتی تو سارے گھر والوں کی چبھتی نگاہیں مجھے ان کے منہ پر آئی باتیں، بغیر کسی گفتگو کے، سمجھ میں آ جاتی تھیں۔

یوسف میرے ساتھ ہر ڈبیٹ اور مشاعرے پر جاتا۔ مجھے یوں لگتا میں محفوظ ہاتھوں میں ہوں۔ اس نے مجھے اپنے سارے دوستوں، سارے گھر والوں سے بھی ملایا تھا۔ وہ اس وقت تو بظاہر بہت خوش ہوئے تھے مگر اچانک شادی سے وہ بھی پریشان ہو گئے تھے۔ پورا خاندان جمع ہو کر اس کوشش میں رہا کہ یوسف کسی طرح مجھے طلاق دے کر، کشمیریوں کی دہلیز پر واپس آ جائے۔ مجھے فوراً ملازمت میر نسیم محمود نے دلوادی تھی۔ میں دفتر میں تھی، یوسف آفس آ کر مجھے گھر واپس لے گیا اور کہا کہ ''مجھے بتاؤ میں کیا کروں، میرے گھر والوں نے اپنی پگ میرے پیروں میں رکھ دی ہے کہ میں تمہیں طلاق دے دوں۔ بتاؤ تو تم کیا کرو گی اس کے بعد۔'' معلوم نہیں میرے اندر کونسی طاقت آ گئی میں نے کہا ''چاہے گھر میں رہوں کہ کوٹھے پر، تمہیں کیا۔ جہاں چاہو جاؤ۔'' یہ کہہ کر میں سیدھی مسز فیض کے پاس آ گئی۔ ان سے سفارش کروائی کہ وائی ڈبلیوسی اے میں کمرہ دلوا دیں۔ اڑھائی سو روپے ایڈوانس دے دیں۔ وہ سب کچھ سنتی رہیں۔ بولیں ''تم دفتر جاؤ، میں سارا انتظام کر لوں گی'' میں دفتر ٹانگے پہ واپس پہنچی۔ دو گھنٹے بعد پھر یوسف دفتر میں موجود تھا۔ چونکہ چھٹی کا وقت ہو گیا تھا میں نے خاموشی سے ساتھ چلنے کا فیصلہ کیا۔ گھر آ کر بتایا کہ مسز فیض گھر آئی تھیں۔ بہت ڈانٹ ڈپٹ کی شرمندہ کیا اور جب بتایا کہ وہ وائی ڈبلیوسی اے منتقل ہو رہی ہے جاؤ اور جا کر روک لو۔ تو پھر ہوش ٹھکانے آئے اور واپس بلانے کو آئے۔

ابھی تو زندگی نے منظر دکھانے شروع کیے تھے۔ ہم باہر جاتے، میری نند آتیں گھر کی سب چیزیں لے جاتیں۔ تنگ کرنے کو لحاف تک لے جاتیں۔ ہم واپس گھر آتے، تالا ٹوٹا ہوتا، صبر کر کے پھر ایک دیگچی اور ایک کفگیر اگلے دن خرید لیتے مگر پھر بے گھری مقدر ہو گئی۔ ہم جس کمرے میں رہتے تھے، پورے خاندان نے ہمیں نکالنے کا فیصلہ کیا۔ آخر ناچار صوفی تبسم کے گھر پہنچے، ان کے ایک نوکر کی دکان میں سات دن گزارے۔ پھر گھر کرائے پر ملا۔ وہ بھی ترس کھا کر، کرشن نگر کے ایک مالک مکان نے اس لیے گھر دیا کہ میری شادی کا فسانہ تو گھر گھر مشہور ہو چکا تھا۔

یوسف نے زندگی گزارنے کے لیے بڑے راستے اختیار کیے۔ وہ خوبصورت تھا۔ امریکی قونصلیٹ میں اس کو ملازمت مل گئی۔ شکر خورے کو شکر مل گئی۔ دن میں بھی امریکی اور پاکستانی ایڈوانس لڑکیاں، بالکل اس طرح ڈریس اپ ہوتیں، جیسے آج کل ہوتی ہیں اور رات تو پھر ہوتی ہی تھی پارٹیوں کے لیے۔ ابھی بہت پینترے بدلنے نہیں آئے تھے۔ اس لیے میں بھی پارٹیوں میں شریک ہوتی۔ ہم اکثر ہفتے کی رات کو ہوٹل جاتے، میوزک ہوتی، ڈانس کرتے، رات کو دیر سے گھر آتے، میں دوسرے بچے کی پیدائش سے پہلے، پورے دنوں پہ تھی، شام کو ہم ہوٹل حسبِ دستور ڈانس پارٹی سے واپس آئے تو میں نے کہا ''مجھے درد ہو رہا ہے۔ چلو ہسپتال'' یوسف نے کہا ''آرام کرو۔ تم نے ڈانس بہت کیا ہے اس لیے درد ہو رہا ہے۔ پھر آدھے گھنٹے بعد میں نے شور مچا دیا۔ ہسپتال پہنچے تو ڈاکٹر بھی حیران کہ ابھی تو ایک ہفتہ ہے۔ بہرحال داخل کیا اور دو گھنٹے میں فیصل میاں سامنے آ چکے تھے''۔

یوسف نے میری بہت باتیں مانیں۔ میں نے دوسرے بچے کے بعد کہا کہ ''میں اور بچے پیدا نہیں کروں گی۔ میں نے کہا میں نوکری جاری رکھوں گی، شاعری نہیں چھوڑوں گی، عورتیں اور مرد، دونوں میرے دوست ہیں اور رہیں گے۔'' اس نے میری پہلی بات مان لی، دوسری بات سے ہر چوتھے دن منکر ہو جاتا تھا۔ اسے مضمون یعنی تنقیدی مضمون لکھنے کا بے حد شوق تھا۔ کئی ڈبی سگریٹ اور کئی دن کی محنت کے بعد مضمون تیار کر لیتا تھا۔ حکم ہوتا تھا کہ گھر میں شور نہ ہو، صاحب مضمون لکھ رہے ہیں۔ میں ہنڈیا پکاتے، بچوں کو پڑھاتے، سلاتے اور دفتر کی فائلیں دیکھتے ہوئے شعر لکھتی جاتی، نہ کسی کو دکھاتی نہ بتاتی کہ جب کبھی ابتدا میں خوشی خوشی تازہ تخلیق دکھائی، جواب میں اتنا کسیلا ذائقہ ملا کہ یہ شوق بھی نہ رہا کہ کسی کو تازہ تحریر دکھائی جائے۔

کچھ موڑ زندگی کے ایسے تھے جو بہت خوشگوار تھے۔ میں ذرا بھی بیمار ہو جاؤں یوسف نے دفتر سے چھٹی کرنی ہے۔ میرے لیے خود سوپ بنوانا ہے، میرے کپڑے استری کرنے ہیں۔ میرے نہانے کا بڑی خوبصورتی سے اہتمام کرنا ہے۔

میری سالگرہ کا دن ہے۔ چاہے رات کو شدید لڑائی ہوئی ہو۔ صبح سے بچوں کو ساتھ ملا کر، سارا دن میری سالگرہ کے انتظامات، شام کو دوستوں کا جمگھٹا اگلے دن پھر وہی لڑے ہوئے، روٹھے ہوئے شخص سے ملاقات، یہ آتش بازی روز جاری رہتی۔

جس زمانے یعنی 71-1970ء میں یوسف کو پی ٹی وی پر "سخنور اور داستان گو" پروگرام ملے۔ اس نے واقعی بڑی محنت سے پروگرام تیار کیے۔ اس زمانے میں میرے مشورے بڑی اہمیت کے حامل ہوتے تھے۔ سارے پروگرام اتنی لگن سے کیے کہ پروگرام کی ایڈیٹنگ کے لیے بھی رات رات بھر سٹوڈیو میں کام کیا۔ ادیبوں کے ساتھ کئی دن پہلے بیٹھ کر، ان کو ذہنی طور پر انٹرویز کے لیے تیار کیا۔ وہ زمانہ یوسف کے لیے بہت مقبولیت اور خوشی کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں روز روز کے نئے معاشقوں کے فسانے بھی بھول گئے تھے۔ بس ایک بات یاد تھی کہ کبھی گانے والوں کا تلفظ دیکھنا ہے، کبھی شاعروں، ادیبوں کے گھر جانا ہے۔

میں نے ایک زمانے میں یوسف کی جیبیں ٹٹولنا بند کر دی تھیں کہ میں جانتے بوجھتے، انجان بن جانے کی کوشش میں بہت عرصہ مصروف رہی مگر میرے اندر کی کمینگی نے مجھے اچھا اور انجان بننے نہیں دیا۔

ہم دونوں دوسرے دوستوں کے سامنے بہت اچھے دوست بن جاتے تھے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ میاں بیوی کو ایک عمر کے بعد، ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے، کسی تیسرے بندے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمیں اکثر ہی ایسی ضرورت پیش آ جاتی تھی۔ ہمارے دوست کامن تھے۔ ہمارے بچوں کو بھی یہ احساس تھا کہ ہمارے والدین اپنے دوستوں کے ساتھ اکٹھے ملتے ہیں مگر وہ کامن دوست خاص کر مرد دوست، جب رات کو جام ٹکراتے تھے تو ان کے ہاتھ میں الٹی چھری ہوتی تھی میری شخصیت کو ادھیڑ پھینکنے کے لیے۔ مجھے یہ معلوم تھا۔ مجھے تو بہت کچھ معلوم تھا۔ اس کے باوجود میرے اندر کی بزدل عورت نے، علیحدگی چاہنے کے باوجود، اس عمل کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچایا کہ میرے بچے، اس علیحدگی کو ناپسند کرتے تھے۔ بچوں کو باپ، ماں سے زیادہ پسند تھا۔ وہ بہت لاڈ پیار کرتا، میں پڑھنے لکھنے میں ڈسپلن کرتی، وہ دوست بن کر، ان سے لڑکیوں کی دوستی کی ہنسی ہنسی میں بات کرتا، میں ایسی باتوں پہ ڈانٹ دیتی۔ بس یہ ہی فاصلے یہی رنجشیں تھیں کہ آج بھی میرے بچے، میری ڈانٹ ڈپٹ کو دہراتے، مذاق اڑاتے اور اپنے باپ کی محبت پہ ان کی آنکھیں چھلک پڑتی ہیں۔

یوسف نے ہر نوکری میں ہر کس و ناکس طریقے سے خوب پیسہ بنایا، اڑایا اور پھر نئی نوکری کے لیے میرے ساتھ خوشگوار تعلقات کرنے کے بعد، پھر نئی منزل مقصود کی جانب روانہ ہو گیا۔

ریس کے گھوڑوں پہ پیسے لگانے ہوں کہ لڑکیوں کو عیش کرانے، اس وقت حاتم طائی بن جاتا تھا۔ یہی رویہ زندگی کے آخری کنارے تک رکھا۔ میں جب اس شطرنج میں شامل ہونے سے منکر ہوتی، جواب ملتا "پھر کسی مولوی سے شادی کر لینی تھی"۔

میں نہ مولوی تھی نہ ملحد، پھر بھی محنت کی کمائی کو آبرو سمجھتی رہتی تھی۔ میں یوسف کے ساتھ گزارے 24 سالوں کو بھی زندگی کے آنے والے سالوں کے لیے ٹھوکروں کا ہدایت نامہ سمجھ کر، سنبھلتی، پھسلتی اور پھر ڈگمگاتی کھڑی ہو جانے کا نسخہ سمجھتی رہی ہوں۔

وہ مجھے بہت چاہتا تھا۔ اس لیے کبھی چھوڑنے کا حوصلہ نہ کر سکا۔ وہ مجھے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے رنجشوں نے تہہ بہ تہہ زندگی رقم کی۔ بھولنے کے لیے ایک لمحہ بھی گراں ہوتا ہے۔ یاد رکھنے کے لیے ایک عمر ناکافی ہوتی ہے۔

Jan 14, 1994

Dear Ms Naheed,

Happy New Year, I hope you and your sons had a wonderful time togather. Dason and I had a tiring and exciting five weeks in the west of italy. I have to say venice was the best. It was like living on a fantacy island. I hope the new year has brought you only worderful things thus far. I am sending the materials you asked for. My lovely creations you made Bellagio an even more especial place to live and inspired me to create something beautiful. Thank you from the bottom of my soul.

Love Donna Nagew

''بدن کی اوکھلی''

کشور ناہید

مجھے یقین ہے تم نے میرے اندر اپنا وجود بنانے کی کوشش کی تھی۔ کٹ کٹ گرنے والے لوتھڑے ایسا وجود نہیں ہوتے ہیں کہ پہچانے جا سکیں مگر موجود ہجوم میں بھی کتنے چہرے ہوتے ہیں کہ پہچانے جا سکیں۔

میرا یقین صرف میری ذات کی حد تک نہیں ہوتا۔ زمانے کی بدلتی رُتوں کو میں آنکھوں کی البم میں رکھتی ہوں۔ اپنے اندر، اپنی کوکھ کے شکوؤں کو سامنے رکھوں تو سمجھ میں آ جاتا ہے کہ تم نے میرے اندر، اپنا وجود بنانے کی کوشش کی تھی۔

وہ زمانے بھی تو پرانے تھے۔ کوئی ٹیسٹ یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اب نئی منزل شروع ہے۔ وہ تو مہینہ پر مہینہ چڑھتا تھا۔ دو مہینے تو بس اسی شک میں گزر جاتے تھے کہ شاید اس دفعہ خون بدن میں کم تھا یا کوئی اور گڑبڑ تھی۔ تین مہینے بعد یا پھر صبح سے دوپہر تک الٹیاں بتاتی تھیں کہ بدن میں کوئی اور پنپ رہا ہے۔

مجھے تم سے نفرت تھی! نہیں اگر ایسا ہوتا تو پھر میں اپنی ذات پہ فخر کیسے کرتی۔

مجھے تم سے ڈر لگتا تھا! شاید۔۔۔ مگر اس وقت تک تو نہیں جب تک میں نے بچے پیدا کیے۔ پہلے بچے کی پیدائش کی خبر ہی نہیں ہوئی۔ پتہ ہی نہیں چلا۔ نہ مجھے پہلے کچھ پتہ تھا نہ اس کو جو باپ بننے والا تھا۔ انگریزی کی کتابوں میں کچھ کچھ سمجھا اور تجربے کے ہر لمحے کو کتاب کے نئے ورق کی طرح پڑھتی چلی گئی۔ اپنے اندر یہ بھی تلاش نہیں کیا کہ ہمیں لڑکی چاہیے یا لڑکا۔ البتہ دوسری دفعہ بس روایتاً یقین کر لیا کہ اس دفعہ لڑکی ہوگی۔ اب کے خاص کر لڑکی کے لیے رنگوں اور کپڑوں کا انتخاب کیا گیا۔ اس دفعہ غربت بھی اتنی نہیں تھی۔ گھر میں گھڑ دوڑ کا مال آگے پیچھے ہوتا تھا۔ تم اگر آ جاتیں تو تم بھی دیکھتیں کیسے ٹانگے سے رولز رائس کے خواب بنے جاتے۔ کیسے جوکیوں اور گھوڑوں کی خدمت ہوتی رہی۔ کس طرح عورتیں مردوں کے لیے طرح بہ طرح کے کھانے بنا کر اس لیے پیش کرتی رہیں کہ جیت گئے تو اس محبت کے صدقے' آدھے پیسے تو میں لے کر چندن ہار بنا لوں گی۔

جب تمہاری جگہ بیٹا آ گیا۔ میں اس وقت تو ذرا سی اداس ہوئی، مگر زندگی بھر' آنے والے سالوں میں اس کا شکریہ ادا کرتی کہ تم نہیں پیدا ہوئیں۔ لڑکوں کو تو مرد نوکر کے حوالے کر کے دفتر چلی جاتی تھی۔ لڑکوں کو تو چچا اور دادا کے سر پر بھی چھوڑ کر باہر کے ملکوں میں چلی جاتی تھی۔ لڑکی ہوتی کیا کرتی۔ میری بہو اپنی بچی کو اپنی نانی کے پاس بھی اس لیے نہیں چھوڑتی کہ نانی کا منہ چڑھا کُتّا، کہیں بچی کو نقصان نہ پہنچا دے۔

میں تمہارے پیدا نہ ہونے پر بہت شکر گزار ہوں۔ میں نے اپنی جیسی کام کرنے والی، لوگوں میں جانی پہچانی ماؤں کو بڑی ہوتی بیٹیوں کے ہاتھوں بڑا مجبور پایا ہے۔ کیا ساس نے کچھ کرنا تھا جو کہ جوان ہوتی بیٹیاں اپنی ماؤں کے ساتھ کر گزرتی ہیں۔ ''ایسے بھڑکیلے کپڑے آپ کی عمر کو سوٹ نہیں کرتے۔'' ''مردوں سے ذرا سنبھل کر ملا کریں''۔ ''آپ اتنا اونچا قہقہہ کیوں لگاتی ہیں۔'' ''کیا کتابوں کے علاوہ بھی آپ کو کچھ پسند ہے۔'' ''بہت کر لیا آپ نے گھومنا، پھرنا، عیش، اب گھر بیٹھیں''۔ کیوں خضاب لگاتی ہیں۔ چہرے سے صاف آپ کی عمر کا پتہ چل جاتا ہے''۔

ویسے تو کچھ مائیں، سہیلیاں جیسی ہوتی ہیں، مگر وہ زیادہ تر مائیں صرف گھر میں رہتی ہیں۔ لڑکیوں اور مردوں کو قابو کرنے کے گُر سکھاتی ہیں۔ جوان بچیوں کو امیر زادے پھنسانے کے طریقے بتاتی ہیں۔ ان کو بننا، سنورنا اور بات کرنا سکھاتی ہیں۔ اپنے پیسے الگ رکھنے کا حساب سکھاتی ہیں اور مرد کے سامنے جا کے راتوں کو بہانے بنانے کے طریقے بھی بتاتی ہیں۔

میں تو دونوں طرح کی ماں نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے تو بیٹے بھی اس لیے باہر بھیج دیئے کہ اس ملک میں جو سفارش چلتی ہے اور سفارش کی جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے وہ صلاحیت مجھ میں نہیں تھی۔ دل جلے کہتے ہیں کہ تم اپنی من مانی زندگی گزارنا چاہتی تھیں اس لیے اکیلے رہنا پسند کرتی ہو۔ ان کو یہ خبر نہیں کہ اکیلے میں اپنے سانس کی آواز کتنی اونچی سنائی دیتی ہے۔ گھڑی کی آواز پتھروں کی طرح کانوں کو لگتی ہے۔ ٹیلی فون اٹھا کر دیکھنا پڑتا ہے کہ کہیں خراب تو نہیں اور ان کی طرح کے مردوں کو بتانا پڑتا ہے کہ اپائنٹمنٹ لے کر آؤ۔ سیدھے منہ اٹھائے اپنا فالتو وقت گزارنے مت چلے آؤ۔ تم پوچھتی ہو میں نے تمہیں پیدا کیوں نہیں کیا۔ لوتھڑے لوتھڑے باہر کیوں کر دیا۔ میں نے تو پہلا بیٹا، ماں بننے کے تجربے کے لیے اور دوسرا اس پیدائشی غلطی کے باعث ہو گیا، جہاں لڑکی کو بتایا ہی نہیں جاتا کہ وہ خود نہال ہوئے بنا ہی حمل ٹھہرنے کے عمل سے گزر سکتی ہے۔ تمہیں میں بتاؤں اس ملک کی اسّی فیصد عورتیں، نہال ہوئے بنا اور جانے بنا، بچے اپنی کوکھ میں پالتی رہتی ہیں۔ میرا دوسرا بیٹا بھی بالکل اسی طرح میرے اندر پلا۔ اس دوران مجھ پر اپنی بپتا پڑی، اتنے خواب ٹوٹے، سوتن نہ ہوتے ہوئے بھی کئی کئی سوتنوں کا دکھ سہا۔ یہ Humiliation کہ دنیا کہے تم کیا چیز ہو اور میرا مرد دوسری عورتوں کے عشق میں رات گئے واپس گھر آئے۔

دوسرے بیٹے کے پیدا ہوتے ہی عقل کی چوکھٹ پہ میں اپنے شوہر کو لے کر کھڑی ہو گئی اور کہا کہ بس دو بچے بہت ہیں۔ اس کو بھی اپنی آزادی کی ضرورت کے علاوہ اپنی بندشوں میں کمی محسوس ہوئی۔ مان گیا۔ سچ جانو تمہارے

زمانے میں ایسے مرد بہت کم ہیں۔اس نے بہت کم دفعہ احتیاط سے گریز کیا۔ورنہ میں تو روز ہی ڈاکٹروں کے پاس دوڑی پھرتی۔

مجھے اپنے بیٹے پسند تھے۔ بہت پسند تھے،مگر میں ان کو پالنے کے لیے بس کچھ بھول جاتی۔نوکری چھوڑ دیتی۔ملنا جلنا چھوڑ دیتی۔صرف اور صرف ان کے لیے زندگی گزارتی۔۔۔میرے اندر ایسی ماں نہیں تھی۔ میں جس طرح بیک وقت سارے فرائض ادا کر رہی تھی۔ان میں سے ایک فرض ماں کا بھی تھا کہ میرے سامنے یہ امتحان تھا کہ عورتیں۔۔۔مردوں کی طرح نوکری پہ دھیان نہیں دیتیں۔ میں اس جنون میں مبتلا تھی کہ میں دفتر اور دوسرے کاموں کو وقت دیتی ہوں اور دیکھوں کہ میں بچوں کو بھی باقاعدہ وقت دے رہی ہوں۔ مجھے شاعری اور کتابوں سے عشق تھا۔ میں بچے کو دودھ پلاتے ہوئے اور سلاتے ہوئے بھی ادب کے قصے ہی بچوں کو سناتی،شعر پڑھتی۔ میں نے کہانیاں لکھنی بچوں کے لیے اسی زمانے میں شروع کیں۔ سارے امتحانوں کے باوجود، میں نے سکون کا سانس لیا۔ بہت خدا کا شکر ادا کیا۔ بہت بوجھ سے خدا نے مجھے بچا لیا۔ مجھے روایتی ڈرپوک، بزدل اور گھر میں رہنے والی ماں ہونے سے بچا لیا۔

وہ اس طرح کہ تم پیدا نہیں ہوئیں۔ وہ اس طرح کہ وہ تمام کپڑے جو لڑکیوں کی طرح کے میں نے بنائے تھے۔وہ دوسری سہیلیوں اور بہنوں میں تقسیم کر دیئے۔ گویا وہ خواب جو لڑکی کی پیدائش کا دیکھا تھا۔اس کو وہیں بند کر دیا۔ یہ عادت میں نے شروع سے ڈال لی تھی یا مجبوراً ڈالنی پڑی تھی۔ وہ زمانہ جب میرے میکے کے دروازے میرے بیاہ کے فوراً بعد مجھ پہ بند ہوئے تھے۔تو میں ایک دن بلکہ ایک شام روئی تھی۔ جی بھر کے۔ پھر اپنے آپ کو کڑا کر لیا تھا۔ اس طرح ہر رشتہ ٹوٹتے ہوئے چھما چھم روتی ہوں۔ بالکل ایسے بین کرتی اور روتی ہوں جیسے ''رودالی'' فلم کے آخر میں ڈمپل کپاڈیہ روتی ہے۔ بلک بلک کر۔ پھر اپنی آواز کو گھونٹ دیتی ہوں کہ اس آواز کو دوسرے مرحلوں پہ اور دوسرے امتحانوں میں بھی آزمانا ہوتا ہے۔

تم پیدا ہو جاتیں تو میں ان ساری عورتوں کو اپنے اندر کیسے پالتی جو آج تک الگ الگ شخصیات ہیں۔ کوئی شاعر ہے، کوئی دفتری بابو ہے، کوئی ڈپلومیٹ ہے، کوئی گھرداری والی عورت ہے، کوئی رضاکارانہ کام کرنے والی ہے، کوئی سب عورتوں سب مردوں کی دوست ہے۔ پھر تو میں تمہاری عصمت، تمہارے بدن، تمہارے نام، تمہارے ایک ایک لمحے کے تحفظ کی خاطر، در بند ایک خاتون ہوتی۔ منہ بسور کر گھر رہنے والی یا مردکو رجھا کر، زندگی کرنے والی۔

تم ہنس رہی ہو کہ آخر کو میری کینچلی اتر گئی۔ میرے اندر کی وہی ماں والی پرانی عورت باہر نکل آئی ہے۔ نہیں یہ بات نہیں۔ آج کی عورت کے مسائل پرانی عورت سے دُگنے ہو گئے ہیں۔ پرانی عورت وہ آپ بیتی دہراتی نہیں تھی جو آپ بیتی ہم سب کو سنا کر ہمنوا بناتے ہیں۔ ابھی ہم اس مقام پہ تو نہیں آئے کہ مغربی عورت کی طرح، ہمارے بدن کے ساتھ جو سلوک ہو۔ ہم اس کو ٹیلی ویژن پر بیان کریں۔ ہاں اس منزل تک ضرور آ گئے کہ ہم سوچیں اور زیادتی کو زیادتی کہہ سکیں۔

لڑکیوں کے ساتھ زیادتی کے واقعات کی لمبی فہرست، میرے ذہن پہ بدن کی طرح تحریر ہے۔ تمہیں ان کا احوال منٹو کی کہانیوں کی شکل میں سناتی ہوں۔ بہت سی لڑکیاں سوگندھی جیسی ہوتی ہیں۔ ان کی زندگی کتنی بے مصرف، کتنی اکیلی، کتنی اُداس، کتنی ہولناک، کتنی بے معنی، ہر شے خالی جیسے مسافروں سے بھری ریل گاڑی، سب سٹیشنوں پر مسافروں کو اتار کر لوہے کے شیڈ میں اکیلی کھڑی ہو۔

مُردہ بدن عورتوں کی لاشیں قبر سے نکال کر جنسی جبر کرنے والوں کی خبریں، مجھے منٹو کا ''سرکنڈوں کے پیچھے'' میں ایشر سنگھ کا مردہ جسم سے مباشرت کو یاد کراتا ہے تو مجھے پرانے زمانے کا پنجابی محاورہ یاد آ جاتا ہے۔''لڑکی کی تو لاش کی بھی تین دن تک حفاظت کرنی پڑتی ہے۔'' بس سچ سمجھو! مجھے بھی اندر سے یہی خوف تھا کہ میں تمہاری حفاظت کیسے کروں گی۔

اب تم پوچھو گی! تمہاری حفاظت کیسے تمہاری ماں نے کی! ہم لڑکیوں کو تم ہاتھ کے آبلے کی طرح پالا گیا۔ بچپن سے ہی تو جھاڑو برتن کی طرف لگا دیا۔ لڑکوں کو پڑھائی کی طرف۔ کھیل کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ یو پی میں اکھاڑے میں بھی جانے والوں کو شرفاء نہیں بلکہ کم ذات کا کہا جاتا تھا۔ لڑکیوں کو بس گڑیاں کھیلنے، گڑیوں کا بیاہ رچانے اور ہمسایوں کی طرح گھر گھر کھیلنے کی اجازت تھی۔

مائیں برقعہ پہنتی تھیں تو بیٹیاں بھی برقعہ اوڑھتی تھیں۔ مائیں گھر میں اتنے کام نکال لیتی تھیں کہ فرصت کا کوئی لمحہ بچتا ہی نہیں تھا۔ موسم اور تہوار کے مطابق کام ہیں کہ نکلے چلے آ رہے ہیں۔ سردی ہے تو نشاستے کا حلوہ بنانے کے لیے پہلے گندم بھگوئے جا رہے ہیں، اکھوے پھوٹنے کے بعد، ان کو چھیلا جا رہا ہے۔ اوکھلی میں کوٹا جا رہا ہے۔ پھر نشاستے کا حلوہ بن رہا ہے۔

اب تم کہو گی کیسے کیسے اجنبی لفظ استعمال کر رہی ہوں۔ واقعی اب کہاں اوکھلی۔ ہر گھر میں نجانے کیسے زمین میں دبی اوکھلی نکل ہی آتی تھی۔ اس کو بہت صاف رکھا جاتا۔ گندم، جو، جوار، مکئی یہ سب چیزیں کوٹ کر طرح طرح کے حلوے بنتے۔ ٹکیاں بنا کر مرتبان میں بند کر کے رکھے جاتے۔ سب کو ایک ایک ٹکی ملتی۔

بھلا ایک ایک ٹکی کیوں۔ بھئی خاندان ہی اتنے بڑے ہوتے تھے۔ جب تک عورتیں بچے پیدا کر سکتی تھیں، اس وقت تک مسلسل بچے پیدا کرتی تھیں۔ ادھر پہلا کپڑا سر رخ ہوا اُدھر بیاہ دی گئیں۔

تم کہو گی اب کونسا ماحول بدلا ہے۔ اب بھی صرف چند شہروں کے چند پڑھے لکھوں کو چھوڑ کر، آج بھی ہر گھر میں 9 سے 11 تک بچے ہی بچے ہیں۔ لڑکیوں سے بنا پوچھے شادی ہوتی ہے۔ طلاق کا حق قانون ہونے کے

باوجودنہیں دیا جاتا۔اٹھارہ گھنٹے کام کرکے، بچا کھچا کھانے کے بعد،شکر سے سو جانے والی یابستر گرم کرنے کی خواہش پوری کرکے، تھک ہار کے سوجانے والی عورت اب تک وہی ہے۔

تو اب تم سمجھو گی کہ میں تمہارے پیدا نہ ہونے پہ مطمئن کیوں ہوں۔تم میری طرح کب تک ٹھنڈے پسینے کالیپ کرتیں۔تم میری طرح کب تک ملک کی عورتوں کے حالات ٹھیک کرنے کے لیے، مردوں کو اپنے خلاف بولتے سن سکتیں۔تم کیسے زندہ رہتیں میری طرح بے حسی کے قہقہے لگاتی۔

یوں تو ہرآدم، حوّا سے پیار کرتا ہے، مگر حوّا کو پیار مانگنے اور ثابت کرنے کے لیے، اپنے بدن کی زکوٰۃ سے گزرنا پڑتا ہے۔اور پھر شروع سے ہوتا آیا ہے کہ کسی کوڑے کے ڈھیر پر، کسی درگاہ، کسی چبوترے، کسی باغ میں، کبھی کپڑے میں لپٹی اور کبھی برہنہ نوزائیدہ کا اکڑا ہوا معصوم بدن، اس انسانیت کو آواز دیتا نظرآتا ہے، جس کی تہذیب کے لیے سارے مذہبوں کے مبلغوں اور رسولوں کو زمین پر بھیجا گیا تھا، مگر آج ہمارے پاس کوئی منٹو ہے کہ جو''سڑک کے کنارے''قسم کی کہانی پھر لکھ ڈالے۔

تم اگر ہوتیں اور لکھنے والی ہوتیں تو کیا لکھ سکتیں۔آج کے زمانے میں بھی ایسی باتیں، ایسے ادیبوں کی طرح جیسے لوگ براڈسکی یا یوتے شنکو سے محبت کرتے تھے۔ایک دفعہ روس میں رائے شماری میں عام آدمی سے کسی نے پوچھا''آنے والے انتخابات میں آپ کی کیا امیدیں ہیں'' عام آدمی نے جواب دیا''مجھے سیاست کی کوئی پروانہیں۔میں تو بس براڈسکی کی طرح پرائیویٹ زندگی گزارنا چاہتا ہوں''۔

تم اگر لکھنے والی ہوتیں تو دیکھتیں کہ علامہ شبلی نعمانی کی تحریروں کے اقتباسات شائع کرنے پہ بزرگ صحافیوں کو ہتھکڑیاں لگ رہی ہیں اور اپنے آپ کو بالغ کہنے والی قوم، یعنی امریکی، ایک چھوکری لونسکی کے قصے کو مزے لے لے کر اُچھال رہی ہے۔ابھی تک پوری دنیا میں لڑکی ہونے کو کس کس طرح **Exploit** کیا جاتا ہے۔ساری دنیا میں سنسنی خیز ادب کی مانگ ہے۔کیا تم بھی اس طرح لکھنے لگتیں! اچھا ہی ہوا پھر کہ تم پیدا ہی نہیں ہوئیں۔

مگر یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ تم پیدا ہوتیں اور بابرا جانسن کی طرح لاتشکیلیت کی اہم نقاد مانی جاتیں یا ملارمے اور رولاں بارت کی طرح یہ تصور پیش کرتیں کہ تحریر کو مصنف کے اثر اور نفسیات کے بوجھ سے آزاد ہوکر سامنے آنا چاہیے کہ لوگ تمہاری ماں کی تحریروں میں صرف شخصیت کی کڑواہٹیں تلاش کرتے رہے ہیں۔تمہاری ماں ہی کیا، ہر مختلف لکھنے والے کی تحریر کو کم دیکھا گیا اور شخصیت کے بخیے زیادہ اُدھیڑے جاتے ہیں۔اب تم یاد مت دلاؤ کہ لوگوں نے تمہاری ماں کی خود نوشت سے جل کر کیا کیا نہ لکھا۔میں نے تمہیں بہت سمجھایا کہ سارے مختلف لکھنے والوں کے بہت سے بائیوگرافرز ہوتے ہیں۔سمجھو کہ یہ سب لوگ میرے بائیوگرافرز ہیں اور اپنے اپنے ذہن اور توفیق کے مطابق مجھے سمجھنے اور اپنے تئیں تولنے کی کوشش کررہے ہیں۔وہ تو شکر ہے کہ تم نے ذہنی طور پر ہی مجھ سے مکالمہ کرکے اس قدر پریشان کیا ہے۔فرض کرو اگر تم واقعی ہوتیں تو پرانے زمانے کی باحیالڑکیوں کی طرح کنویں میں چھلانگ لگا دیتیں یا مجھے تیل چھڑک کر آگ لگا دیتیں کہ ان بائیوگرافرز کی کتابیں پڑھ کر چند پرخلوص دوستوں کا بھی غصہ کے مارے یہی حال ہوا تھا۔میرا نہیں کہ مجھے تو مقابلے پہ آنے والی عورت سے نفرت کرتے مردوں کی نفسیات کا بہت اچھی طرح علم ہے۔مجھے تو غصہ نہیں آتا، ترس آتا ہے، ایسے مردوں پر۔

تم پھر کہو گی ماں تم نے کس کس قسم کے مردوں پر ترس کھانے کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے۔وہ جو ہر عمر کی عورت کے بدن پر ہاتھ پھیرنے کا موقع حاصل کرنے کی کوشش میں، بچی کھچی عزت بھی گنوا بیٹھتے ہیں۔وہ جو شراب کے دو پیگ کے بعد، رشتوں کے تقدس کی دھجیاں اڑا دیتے ہیں۔وہ جو بظاہر داڑھی رکھ کر، رشوت کا مال سنبھالتے ہیں۔وہ جو دفتروں میں کچھ بھی نہ کرکے، فرض شناسی کی قسمیں کھا کر ترقیاں مانگتے اور بے نام خط لکھ لکھ کر دنیا کے سارے دفتروں میں بھیج کر اپنی خباثت کو استعمال کرتے ہیں۔

کس طرح اپنی سیکرٹریوں اور دفتر میں چھوٹی ملازمت پہ کام کرنے والیوں پہ ڈورے ڈالتے ورنہ حرف گیری کرتے ہیں۔کس طرح گھروں میں کام کرنے والی بچیوں کی عصمت لوٹتے ہیں۔کس طرح جیل کی کوٹھڑی یا حوالات میں بند عورت، ہر ایک کے منہ کا نوالہ بنتی ہے۔کیسے کھیت سے گزرتی بچی، کسی بھی ہوس ناکی کا شکار ہوجاتی ہے۔

اگر تم پیدا ہوتیں تو تمہاری پیدائش بھی منحوس گردانی جاتی۔مجھے یاد ہے میرے دفتر میں ایک دائی کام کرتی تھی۔ایک دن وہ دوپہر کو کام پہ آئی اور آتے ہی بیٹھ کر رونے لگی۔میں نے سبب پوچھا تو اس نے ٹالتے ہوئے کہا ''میڈم ایسا تو روز ہی ہوتا تھا کہ بیٹی جس گھر میں پیدا ہو، وہ لوگ کام کروانے کے بعد کچھ نہیں دیتے ہیں بلکہ اکثر تو مجھے بھی منحوس کہہ دیتے ہیں، مگر آج جتنے گھروں میں بچے پیدا کروانے گئی ہوں وہاں لڑکیاں ہی ہوئیں۔میڈم! آج میں خالی ہاتھ لوٹی ہوں۔''

یہ کسی گاؤں کا نہیں، کسی گزشتہ زمانے کا نہیں، آج کے زمانے میں اندرونِ لاہور کا واقعہ ہے۔

میری پیدائش بھی کوئی خوشی کی بات نہیں تھی۔جبھی تو میری ماں اُکتا اُکتا کر پوچھا کرتی تھی''میں نے تجھے کیا کھا کے پیدا کیا تھا''۔تم بھی شاید یہی پوچھتیں، تم بھی اگر میری ماں بن کر، میری پہریداری کرتیں۔شاید یہی اندر کا خوف تھا کہ میں نے تمہیں پیدا نہیں کیا۔

تم پیدا ہوتیں اور کہنے کو بے نظیر بن جاتیں یا مہر النساء بن جاتیں یا پھر لیڈی ڈیانہ بن جاتیں یا پھر کشور ناہید ہی بن جاتیں۔بقول منو بھائی''لوگ ان کی ذہنی سوچ میں نہیں، ان سے متعلق کہانیوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔''

''تعاقب میں رات''

محترمہ کشور ناہید کی منتخب نظموں کے انگریزی تراجم

عروب شاہد (اسلام آباد)

میں کون ہوں

موزے بیچتی جوتے بیچتی عورت میرا نام نہیں
میں تو وہی ہوں جس کو تم دیوار میں چن کر
مثل صبا بے خوف ہوئے
یہ نہیں جانا
پتھر سے آواز کبھی بھی دب نہیں سکتی
میں تو وہی ہوں رسم ورواج کے بوجھ تلے
جسے تم نے چھپایا
یہ نہیں جانا
روشنی گھور اندھیروں سے کبھی ڈر نہیں سکتی
میں تو وہی ہوں گود سے جس کی پھول چنے
انگارے اور کانٹے ڈالے
یہ نہیں جانا
زنجیروں سے پھول کی خوشبو چھپ نہیں سکتی
میں تو وہی ہوں میری حیا کے نام پہ تم نے
مجھ کو خریدا مجھ کو بیچا
یہ نہیں جانا
کچے گھڑے پہ تیر کے سوہنی مر نہیں سکتی
میں تو وہی ہوں جس کو تم نے ڈولی بٹھا کے
اپنے سر سے بوجھ اتارا
یہ نہیں جانا
ذہن غلام اگر ہے قوم ابھر نہیں سکتی
پہلے تم نے میری شرم وحیا پہ خوب تجارت کی تھی
میری ممتا میری وفا کے نام پہ خوب تجارت کی تھی
اب گودوں میں اور ذہنوں میں پھولوں کے کھلنے کا موسم ہے
پوسٹروں پر نیم برہنہ
موزے بیچتی جوتے بیچتی عورت میرا نام نہیں

WHo Am I?

I am not that woman selling socks and shoes

I am the one you needed to bury alive
to feel fearless as the wind again
For you never knew
that stones can never suppress a voice.

I am the one you hid beneath
the weight of traditions
For you never knew
that light can never fear pitch darkness.

I am the one from whose lap you picked flowers
and then poured flames and thorns instead
For you never knew
that chains cannot hide the fragrance of flowers.

In the name of modesty
you bought and sold me
For you never knew
that Sohni cannot die braving the river on a fragile pot of clay
I am the one you gave away in marriage
So you could be rid of me
For you never knew
that a nation cannot emerge if the mind is enslaved.

For a long time you have profited by my shyness and modesty
Traded so well on my motherhood and fideltiy,
Now the season for flowers to bloom in our laps and minds is here.

Semi-naked on the posters-
I am not that woman - selling socks and shoes.

Translated by: Rukhsana Ahmed

We Sinful Women

It is we sinful women
who are not awed by the grandeur of those
who wear gowns
who don't sell our lives
who don't bow our heads
who don't fold our hands together.

It is we sinful women
while those who sell the harvests of our
bodies
become exalted
become distinguished
become the just princes of the material
world.

It is we sinful women
who come out raising the banner of truth
up against barricades of lies on the
highways
who find stories of persecution piled on
each threshold
who find the tongues which could speak
have been severed.

It is we sinful women.
Now, even if the night gives chase
these eyes shall not be put out.
for the wall which has been razed
don't insist now on raising it again.
It is we sinful women
who are not awed by the grandeur of those
who wear gowns
who don't sell our bodies
who don't bow our heads
who don't fold our hand togethers.

Translated by: Rukhsana Ahmed

ہم گنہگار عورتیں

یہ ہم گنہگار عورتیں
ہیں
جو اہلِ جبّہ کی تمکنت سے
نہ رعب کھائیں
نہ جان بیچیں
نہ سر جھکائیں
نہ ہاتھ جوڑیں
یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ جن کے جسموں کی فصل بیچیں جو لوگ
وہ سرفراز ٹھہریں
نیابتِ امتیاز ٹھہریں
وہ داورِ اہلِ ساز ٹھہریں
یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ سچ کا پرچم اٹھا کے نکلیں
تو جھوٹ سے شاہراہیں اٹی ملے ہیں
ہر ایک دہلیز پہ سزاؤں کی داستانیں رکھی ملے ہیں
جو بول سکتی تھیں وہ زبانیں کٹی ملے ہیں
یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ اب تعاقب میں رات بھی آئے
تو یہ آنکھیں نہیں بجھیں گی۔
کہ اب جو دیوار گر چکی ہے
اسے اٹھانے کی ضد نہ کرنا!
یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
جو اہلِ جبّہ کی تمکنت سے نہ رعب کھائیں
نہ جان بیچیں
نہ سر جھکائیں، نہ ہاتھ جوڑیں!

براہِ راست

براہِ راست کے عنوان سے مکالماتی سلسلے کی ابتداء اکثر کلماتِ حسن سے ہوا کرتی ہے۔سرِ دست ہمارا ارادہ کشور صاحبہ کی مدح سرائی کرنا ہرگز نہیں۔ اردو زبان وادب نے ایسے الفاظ اور تراکیب دریافت ہی نہیں کیں جن کی مدد سے محترمہ کشور ناہید کی تعریف کا حق ادا ہو سکے۔زیرِ نظر مکالمہ کشور صاحبہ کے شخصیت و فن کے مقابل ایک طرح سے نامکمل اور ناتمام تصور کیا جانا چاہیے! ایک سبب راقم الحروف کی کم علمی اور کم فہمی دوسرا ہمارے مزاج اور مذاق کا ناپختہ پن ہے!! ایک بات آپ کی توجہ ضرور چاہتی ہے کہ ناہید صاحبہ نے عام تصورات کے برعکس اس خاص اشاعت اور زیرِ نظر مکالمے کے لیے جس قدر تعاون، حوصلہ افزائی اور تحمل کا مظاہرہ کیا ہے وہ لائقِ ستائش ہے جس کے لیے ہم آج بھی اُن کے ممنونِ احسان ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے!!

گلزار جاوید

☆ اس امر سے ہم باخبر ہیں کہ آپ نے انٹر کالجیٹ مشاعرہ میں پہلی نظم لکھ کر اوّل انعام حاصل کیا تھا۔آپ ہمیں نظم لکھنے کے محرکات اور احساسات سے آگاہ کیجیے؟

☆☆ دیکھئے محرکات تو میں آپ کو اس لیے نہیں بتا سکتی کہ ہوا اپنا اثر نہیں چھوڑتی۔اس وقت جو نظم لکھی تھی وہ میری پرانی کتابوں میں شامل تھی۔ پرانی ڈائریوں میں تھی جو میں نے پھینک دی تھیں۔وہ رکھ کے میں نے کیا کرنی تھیں۔

☆ اس کے بعد کی صورت حال سے باخبری بھی لازمی ہے کہ آپ کا علمی، ادبی سفر کس طریق پر آگے کے مراحل طے کر سکا؟

☆☆ میں نے فسٹ ائیر سے لکھنا شروع کیا اور اب پچاس برس ہو گئے ہیں مجھے لکھتے ہوئے۔ جب آپ پہلی سیڑھیاں چڑھ رہے ہوں تو سانس نہیں پھولتا جب اوپر چڑھ جائیں تو آپ کا سانس بھی پھولتا ہے اور نظر بھی زیادہ آنے لگتا ہے۔تو مجھے نظر زیادہ آتا ہے۔لکھتی کم ہوں لیکن ابھی تک لکھ رہی ہوں اللہ کا شکر ہے۔

☆ اس تصور کو سادگی سے تعبیر کیا جائے یا انتہائے شوق سے تشبیہہ دی جائے کہ کائنات صرف آپ کے لیے بنی ہے؟

☆☆ کائنات تو ہر اس فرد کے لیے بنی ہے جو زمین پہ ہے یا زمین کے نیچے ہے یا زمین کے اوپر اُڑتا ہے اور میں نرگسیت کی شکار نہیں ہوں۔اور خدا نہ کرے کہ میں کبھی اس کا شکار ہوں۔

☆ یہ الزام ہے یا حقیقت کہ آپ کو اپنی محبت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا؟

☆☆ مجھے اپنی محبت نہیں دوستوں کی محبت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔جس قدر اس ملک میں خباثت بڑھ رہی ہے نفرتیں بڑھ رہی ہیں اتنا ہی مجھے محبت کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ یہ جو اچھے ہیں وہ کیوں سفر کریں۔میرے دوست جو ہیں وہ کیوں سفر کریں۔اب دیکھئے آج ہی شبیہ الحسن کا قتل ہوا ہے۔میں صبح سے اداس بیٹھی تھی۔تو یہ چیزیں جو ہیں ہماری زندگی میں بہت تکلیف دیتی ہیں۔

☆ آپ کی شاعری کو آپ کی ذات کا مرکز گرداننے والے اس غلط فہمی کا شکار کب اور کیونکر ہوئے؟

☆☆ دیکھئے عورت ہونا جو ہے وہ میری ذات کا مسئلہ نہیں ہے۔وہ ہر عورت کا مسئلہ ہے جو عورت ہے۔ میرے سامنے جتنی عورتوں کی جتنی تصویریں بن سکتی تھیں وہ میں نے بنانے کی کوشش کی ہے تو شاعری میں اتنی وسعت نہیں آئی جو میں لے آئی ہوں۔

☆ آپ کے ہاں ذاتی واردات کے اظہار کی خواہش کا جو ذکر ملتا ہے آج کی نشست میں اُس کے حوالے سے کچھ تفصیل بیان کیجیے؟

☆☆ دیکھئے میں ذاتی طور پر اس سید گھرانے سے ہوں جس نے سات سال کی عمر میں برقعہ اوڑھا۔پھر یونیورسٹی میں جانے اور شادی کے بعد برقعہ اتار دیا۔کالج میں برقعہ رکھ کے لیڈیز روم میں پڑھنے جاتی تھی واپس آ کے برقعہ کو آٹے کے کنستر میں رکھ کر چھپا دیتی تھی کہ اماں ناراض ہوتی تھیں۔شادی کے بعد کی جو زندگی ہے وہ آپس میں relationship ہے۔پھر بچوں کا ہونا اور پھر یہ کہ اس سماج میں زندہ رہنا جس میں جنگ بھی دیکھی جمال عبدالناصر کی موت بھی دیکھی اور پھر ہم نے cultural resolution چائنا کا بھی دیکھا کافی سارے مارشل لاء دیکھے پاکستان میں cultural generation جو ہے وہ کم ہے اور معاشرتی جنریشن زیادہ ہے۔

☆ آپ اپنی شاعری میں اس قدر مظلوم، بے بس اور عذاب میں جکڑی خاتون کیوں نظر آتی ہیں؟

☆☆ میرے معاشرے میں ستاسی فیصد عورتیں اسی حال میں زندہ ہیں۔ میں جب گاؤں جاتی ہوں تو وہاں کی عورتوں کو کہتی ہوں کہ تم سولہ گھنٹے کام کرتی ہو وہ ہنس کے مجھے کہتی ہیں باجی آپ ایک بات بھول گئی ہیں ہم کو مار بھی تو کھانی ہوتی ہے۔یہ چیزیں تو میں آپ کو ابتدائیہ بتا رہی تھی۔عورت جب تک اپنے معاشرے میں شعور نہیں حاصل کرے گی اور جب تک اس کا مرد کے ساتھ محبت کا رشتہ نہیں بنے گا اور وہ خادم، غلام اور آقا کا رشتہ ہے۔محبت میں برابر کا رشتہ ہوتا ہے جب تک ہمارے شعور میں یہ چیز نہیں آئے گی یہ خادم اور آقا کا رشتہ ہی قائم رہے گا۔اس وقت تک عورت مار بھی کھاتی رہے گی۔آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ

بہت سے علاقوں میں مرد، عورت کو گھر میں تالا لگا کے جاتے ہیں اور جب واپس آتے ہیں تو تالا کھولتے ہیں۔ بہت سے لوگ اپنی مرضی کے بغیر عورت کو گھر سے نہیں نکلنے دیتے۔ کہیں بھی نہیں جانے دیتے اپنی مرضی کے بغیر۔

☆ یہ خیال کس حد تک درست ہے کہ کشور ناہید کو تخلیقی عمل سے تسکین نہیں ملتی؟

☆☆ تسکین اگر مل جائے گی تو غالب کی طرح ہم تسکین کو کیوں روئیں گے۔ تخلیقی عمل کے علاوہ میں نے کام بھی شروع کیا عورتوں کے لیے ضیاء الحق کے زمانے میں کیونکہ اس وقت مجھے گھر بٹھا دیا گیا تھا اور میں گھر بیٹھ نہیں سکتی تھی تو اس لیے اس زمانے میں، میں نے عورتوں کے لیے ورلڈ سٹی لاہور میں کام شروع کیا۔ واپسی پہ جب نوکری دوبارہ لگ گئی تو میں نے عورتوں کے لیے کام کرنا نہیں چھوڑا۔ پھر جب میں نے لیلیٰ خالد کو ترجمہ کیا یا seventy war کا ترجمہ کیا جو کتاب آپ کے لیے آ گئی 'باقی ماندہ خواب' سارے رائٹرز کا ترجمہ کیا۔ یا پھر میں نے نظمیں ترجمہ کیں سو شاعروں کی تو جب میں نے یہ نظمیں ترجمہ کیں تو لوگوں نے کہا کہ یہاں کون جانتا ہے تم چاہو تو انھیں اپنے نام سے چھاپ دو۔ لوگوں نے کتنی کھڑکیاں کھولی ہیں کتنے راستے بنائے ہیں ہمارے شاعروں نے محبت کے علاوہ کوئی راستہ چھوڑا ہی نہیں۔

☆ آپ کی مضطرب روح کس چیز کی متلاشی ہے؟

☆☆ زندگی کی، ایسی زندگی جو محبت، اخوت اور سچائی کی امین ہو۔

☆ آپ کے ہاں جنس کا ذکر بڑے دلکش انداز میں کیا جاتا ہے انتہا مگر مرد کی بے وفائی پر ہوتی ہے؟

☆☆ دل کش کا کیا مطلب ہے؟ اپنا اپنا واسطہ اور اپنا اپنا طریقہ اور تجربہ ہے۔ دیکھیے ہمارے ملک میں ہی نہیں ساری دنیا میں میل شاونزم جاری ہے اس کو ختم نہیں کیا گیا میل شاونزم کا مطلب ہے کہ عورت کو جب چاہا استعمال کیا جب چاہا اسے ڈسٹ بن میں پھینک دیا جب چاہا اس کے ساتھ محبت کی جب چاہا اس کو پیروں کے نیچے رگڑ دیا۔ کچھ لوگ جو جگہ جگہ نظر آتے رہے اس کو میں بیان کرتی رہی پھر میں نے ساری دنیا میں دیکھا اور پاکستان کے ہر گاؤں میں دیکھا۔ پاکستان کا کوئی گاؤں نہیں چھوڑا جہاں میں نہیں گئی۔ تو وہ تجربے جو ہیں وہ میری زندگی کا حاصل ہیں۔ نثر میں بھی آئے ہیں اور شاعری میں بھی۔

☆ مغرب میں جنس تعلیم کے طور پر استعمال ہوتی ہے جبکہ ہمارے ہاں جنس کا ذکر آتے ہی حجاب اور شرمندگی لازمی تصور کی جاتی ہے اس کے باوجود آپ نے پاکستان جیسے پسماندہ ملک میں سمون دبورا کو متعارف کرانے کا بیڑا اٹھایا؟

☆☆ سمون دبورا کو میں نے تین سال پڑھا اور پھر دو سال اس کو ترجمہ کرنے میں لگے۔ کتاب کا نام تھا Second Sex ہمارے ہاں پردے میں رکھ کر سب کچھ کیا جائے تو ٹھیک ہے نیک پروین ہے لیکن اگر پردے سے باہر ہو تو برائی ہے۔ کل کا واقعہ ہے کہ پندرہ لڑکیاں ہائی کورٹ سے اپنے چاہنے والوں یعنی اپنی پسند کے لڑکوں کے ساتھ چلی گئی ہیں اور ماں باپ کا ساتھ نہیں دیا۔ ان کے ماں باپ نے تو کچھ نہیں کہا۔ اس منزل تک ہماری لڑکی کو نہیں پہنچنا چاہیے۔ ہماری لڑکی کو اگر گھر میں ہی اتنی آزادی مل جائے کہ وہ اپنی پسند کے لڑکے سے اپنے ماں باپ کے ہاتھوں شادی ہو کے نکلے تو پھر اچھی بات ہوتی ہے۔

☆ تیسری دنیا بالخصوص پاکستان میں یہ طریقہ مشکل نظر نہیں آتا؟

☆☆ میں نے اپنی بہو کی ماں یعنی اپنی سمدھن سے پوچھا کہ آپ کی شادی آپ کی مرضی سے ہوئی تھی تو کہنے لگی ہاں۔ تو میں نے کہا آپ کی والدہ کی تو اس نے کہا کہ ہاں اُن کی مرضی سے ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ کوئی ایسی جنریشن یاد ہے جس کی شادی اس کے والدین نے کرائی ہو کہنے لگی کہ میری زندگی میں تو کوئی نہیں۔ تو مرضی استعمال کرنی جو ہے اس کی اجازت نہ لڑکی کو ہے نہ لڑکے کو، صرف لڑکی کی بات نہیں ہے، لڑکے کو بھی نہیں ہے۔ بھاگ کے شادی کر لیں تو اس کو قبول کر لیتے ہیں جو کہ شرمندگی کی علامت ہے۔ مگر وہ اپنی مرضی سے کر لیں تو اس کو قبول نہیں کیا جاتا۔ مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ آج نہیں تو کل ہمارے ہاں تعلیم کی روشنی عام ہو گی جس سے لوگوں کے سوچنے سمجھنے کا انداز بھی بدلے گا۔

☆ ''کوکھ شاستر'' کی طرز پر اجسام کے استعمال کو شاعری میں برت کر آپ نوجوان نسل کو کس راہ پر لے جانا چاہتی ہیں؟

☆☆ کوکھ شاستر میں کیا ہے؟ میں نے کبھی اسے استعمال ہی نہیں کیا۔ میری کتاب کے کسی پیراگراف کا حوالہ دیں تو پھر میں آپ کو جواب دوں۔ آپ کی اطلاع کے لیے بتلاتی چلوں 'کوکھ شاستر' سب سے زیادہ بکنے والی کتاب ہے۔ ہمارے ہاں لاشعوری طور پر کوشش کی جاتی ہے کہ جنس کے بارے میں نہ بتایا جائے ہمارے ہاں کوشش کی جاتی ہے کہ کورس میں بھی نہ پڑھایا جائے۔ ہمارے ہاں کوشش کی جاتی ہے کہ زندگی میں ہم کسی چیز کو بھی نہ بتائیں۔ ہمارے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ اللہ میاں نے جھولی میں ڈال دیا تھا۔ بچے پھر کہنے لگتے ہیں کہ ہمارے ہاں تو کوئی بھی نیچرل طریقے سے پیدا نہیں ہوا۔

☆ آپ کے خیال میں پاکستان کے اندر سیکس کی تعلیم کس عمر سے ہونی چاہیے؟

☆☆ جب باڈی میں changes شروع ہوتے ہیں لڑکے اور لڑکی کے اس عمر سے ہونی چاہیے۔ تیرہ چودہ سال کی عمر کے بعد۔

☆ ''سکینڈ سیکس'' کے ترجمے کو فحش کیوں گردانا گیا اور آپ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے والے کون تھے۔ اس سارے عمل کے دوران آپ کو کن مراحل سے گزرنا پڑا اور اس مہم جوئی کا انجام کیا رہا؟

☆☆ یہ ضیاء الحق کے زمانے کی مہم جوئی ہے۔ جب یہ مقدمہ withdraw کیا گیا تو اعجاز بٹالوی وکیل تھے۔ اس میں انہوں نے حوالہ دیا انسا

ئیکلوپیڈیا برٹینکا کا کہ second sex کو سوشیالوجی قرار دیا گیا ہے۔ پھر یہ مقدمہ withdraw کیا گیا۔ تھانے میں مقدمہ بنایا گیا تھا۔ ایک نہیں، دو نہیں، تین مقدمے بنائے گئے تھے۔ اس کو second sex سوشیالوجی کہہ کر انھوں نے یہ مقدمہ ختم کیا۔ تب انھوں نے کہا کہ پاکستان کا پی رائٹ ایکٹ کا سیگنٹری نہیں ہے۔ اور اس کے بعد یہ کہا گیا کہ یہ سرکاری ملازم ہیں یہ ترجمہ نہیں کرسکتیں۔ پھر اس کا جواب یہ تھا کہ ادب کے بارے میں preseption ہوتی ہے۔ میرے خلاف کافی ایشوز تھے اور جب مقدمہ درج ہوا تو ایس پی میرے دفتر میں آ گیا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ اپنے دفتر لے گیا اور شرمندہ ہو کے بیٹھ گیا تھا اور پھر میری ضمانت قبل از گرفتاری خود ہی انھوں نے کروائی تھی لیکن کتاب کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ جو کتاب ایک دفعہ بین ہو جاتی ہے وہ کبھی آزاد نہیں ہوتی۔

☆ Wolf Gang Leader کے اس قول سے آپ کی زندگی کو کس طرح تشبیہہ دی جاسکتی ہے ''اکثر عورتیں خود کو مار کر آرٹ میں ڈھال لیتی ہیں''؟

☆☆ خود کو جو نہیں مارتے۔ لکھنے کے لیے آپ کا وجود اندر سے زندہ ہوتا ہے۔ لیکن بہت سے مسائل ہوتے ہیں۔ آپ کو اپنی زندگی پہ اعتماد اس طرح رکھنا پڑتا ہے کہ اب میں شاعری کرتی ہوں میں نے خودکشی نہیں کی ہے۔ اس میں آپ کو اپنے احساسات پر قابو رکھنا پڑتا ہے اور منتقل کرنا پڑتا ہے احساسات کو شاعری کو یا افسانے کو ملانا نہیں پڑتا۔ آپ کے خیال میں مارنے کا مطلب ہوتا ہے نیک پروین بننا اور وہ میں نے بننا نہیں۔

☆ ورجینا وولف کے بقول ''اس سے پہلے کہ ہم عورتیں لکھنا شروع کریں اپنی فرشتہ صفتی کو ختم کردیں'' اپنے قاری کو آپ اس حوالے سے کس طرح مطمئن کرنا چاہیں گی؟

☆☆ میں نے دنیا کو آنکھیں کھول کے دیکھا ہے آنکھیں بند کر کے نہیں دیکھا۔ پہلی بات تو یہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے ملک میں راشد الخیری سے لے کر زبیدہ خاتون تک عورت پہ ٹھپا لگا دیا گیا ہے، اپنے ذہن کا اظہار کرتی عورت نہیں ہے۔ میں نے اپنے ذہن کا اظہار کرتی عورت کو وجود دیا ہے۔

☆ امریکی شاعر ڈورتھی نے خواتین شاعرات پر موضوع، مزاح، جمالیات، اخلاقی کمیابی، حقیقی کرب سے چشم پوشی کے الزامات کے علاوہ ایک ہی موضوع کو بار بار دہرانے کی جو بات کی ہے آپ اُس کا دفاع کس طرح کریں گی؟

☆☆ دفاع میں کسی چیز کا نہیں کروں گی اس لیے کہ لکھنا ایک الگ عمل ہے اس پر تبصرہ کرنا لوگوں کا حق ہے آپ کسی چیز کا دفاع تب کرتے ہیں جب کوئی چیز غلط ہے۔ لکھنے کے انداز میں اس کو آپ critise کرسکتے ہیں۔ الزام مت لگائیے آپ، آپ کوئی جج نہیں ہیں، آپ کو حق نہیں پہنچتا جج بننے کا۔ آپ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ آپ تجزیہ کریں۔

☆ ناکام عشق کے ردِعمل میں کئی طرح کی پیچیدگیاں مشاہدے میں آتی ہیں مگر کامیاب عشق بھی عورت کو نفسیاتی طور پر غیر محفوظ بنا دیتا ہے یہ پہلی بار آپ کے حوالے سے سننے میں آیا ہے؟

☆☆ ردعمل! وہی بات آپ بار بار کر رہے ہیں۔ ردعمل نہیں ہے وہ عورت اور مرد کے رشتے کی ایک کہانی ہے۔ اس میں کچھ نزاکتیں ہوتی ہیں جو عورت accept کرتی ہے عورت اور مرد میں فرق کرتی ہیں۔ عورت اور مرد میں فرق جسمانی نہیں ہے ذہنی فرق ہے اور ذہنی فرق میں، میں یہ سمجھتی ہوں کہ جب ہم اس فرق کو محسوس کرتے ہیں تو فرق بہت نہیں ہوتا۔ وہی تو ایک دوسرے کے لیے atraction ہوتی ہے۔

☆ یوسف کامران سے تعلق، شادی، اختلاف اور اُن کی موت کی نسبت آپ کی پوزیشن متنازعہ کیوں ہے؟

☆☆ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ کچھ چیزوں کے جواب میں اپنا دفاع کرنے کے لیے نہیں بیٹھی ہوں۔ میں آپ کے سوالوں کا جواب دینے کے لیے بیٹھی ہوں۔ آپ نے سارے کے سارے سوال ایسے بنائے ہیں جو کہ دفاع کرنے کے لیے ہیں۔ میری پوزیشن میری کتابوں میں موجود ہے۔ دفاع کس کے لیے کروں یا تو میں غلط کام کر رہی ہوں تو دفاع کروں۔ میری شاعری میں آپ کے ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ سمجھانا یا نہ سمجھنا قاری کا مسئلہ ہے یا آپ کا مسئلہ ہے۔ میرا مسئلہ تو نہیں ہے۔ میں ابلاغ عامہ کی سٹوڈنٹ نہیں ہوں کہ آج کل کے طریقوں کے ابتدائی عشق کی کہانی سناتی پھروں۔

☆ کہنے والے اکثر کہا کرتے ہیں کہ آپ کی شہرت اور ناموری میں یوسف کامران مرحوم کا بڑا حصہ ہے کیونکہ وہ خود کو پس منظر میں رکھ کر اپنے حصے کی شہرت و ناموری آپ کے آنچل میں ڈالتے رہے؟

☆☆ کس قدر مردانہ سوال ہے۔ یوسف کامران خود بھی شاعر تھے۔ اس کی کتابیں میں نے ہی چھاپیں۔ وہ تو اکتالیس سال کی عمر میں مر گیا تھا اور اب میری عمر بہتر سال ہے۔

☆ یوسف کامران کی بیاض گم ہونے کی کہانی بھی طرح طرح کے افسانوں سے پُر ہے؟

☆☆ وہ کوئی چور لے کر گیا تھا اور ساری چیزیں گھر ہی پھینک گیا تھا ان میں وہ بیاض بھی تھی۔ جو بعد میں مل گئی تھی۔

☆ ذات کے دہرے پن کا ذکر آپ کے ہاں کثرت سے آیا ہے۔ واضح نشان دہی نہیں ملتی؟

☆☆ ہر ایک کی ذات میں دو شخص ہوتے ہیں۔ ایک منفی اور ایک اثبات کا۔ کسی میں منفی احساسات زیادہ ہوتے ہیں کسی میں اثبات کے زیادہ ہوتے ہیں۔ میں نے کوشش کی، دونوں کو ہم پلہ تو نہ کر سکی وہ تو فرشتے بھی نہیں کر سکتے۔

کوشش کی ہے کہ دونوں کو بیانیہ دے سکوں۔

☆ آزادنظم،نثری نظم برِصغیر کی حدتک اپنی ابتداء سے متنازعہ رہی۔اس جانب آپ کی توجہ کے اسباب اور فنی طور پر اس صنف کے حوالے سے آپ کی رائے اہمیت کی حامل ہوگی؟

☆☆ متنازعہ تو کچھ بھی نہیں رہا۔احسان دانش کہا کرتے تھے کہ بھئی تم تو آزادنظم کہتے ہو۔غزل میں تو کوئی ساتواں شعر سنا سکتا ہے۔آزادنظم میں کیسے ساتواں شعر سناؤ گے۔یہ تو کوئی طریقہ نہیں ہے کسی پہ اعتراض کرنے کا۔نثری نظم میں ٹی۔ایس ایلیٹ سے شروع ہو کے آپ بارڈن تک آجائیں بڑی نثری نظمیں ملیں گی اور ساری دنیا میں موجود ہیں۔یہ آپ کے ہاں دفاع بہت ہو رہا ہے۔کہیں یہ دفاع پاکستان کونسل کے بنائے ہوئے سوالات تو نہیں ہیں۔

☆ ہر چند شاعری میں اپنا لہجہ تراشنے کے باوجود آپ کے ہاں کئی غیر ملکی شعرا کے علاوہ راشد کا اثر نمایاں کیوں ہے؟

☆☆ میرے ہاں آپ کو بے نام مسافت کا راشد اور مختار صدیقی دونوں نظر آئیں گے۔ایک طرح سے وہ میرے استاد تھے۔

☆ نظیر صدیقی مرحوم کی اس رائے میں کس قدر وزن ہے کہ جدیدیت کے جنون میں آپ شاعری سے دور ہوتی گئیں؟

☆☆ نظیر صدیقی اب جا چکے ہیں اس پر کیا تبصرہ کرنا ہے۔میں نے جو فقرہ کہنا تھا کہہ دیا۔میں نے آپ کی انٹرویوز کی کتاب میں بہت تفصیلی جواب دیکھے ہیں جہاں فلسفہ پورا بیان ہو رہا ہے۔ایک سوال کے جواب میں اور زمین وآسمان کے قلابے ملائے جا رہے ہیں میں نہیں کہوں گی۔میں شاعر ہوں۔میں مختصراً بات کروں گی میں تفصیل میں نہیں جاؤں گی۔ اس طرح سے جواب میں نہیں دوں گی۔

☆ ڈاکٹر محمد علی صدیقی آپ کو اردو نظم کا پورا آدمی کن معنوں میں گردانتے ہیں؟

☆☆ اُنھوں نے سلیم احمد کی نظم پورا آدمی اور آدھی نظم کے حوالے سے لکھا ہے۔آدمی نہیں شخص جس میں مرد اور عورت دونوں پنہاں ہیں۔

☆ آپ کے ہاں عورت پن کے شدید احساس کا جو ذکر جا بجا ملتا ہے اُس کی آسان لفظوں میں تشریح کیا ہے؟

☆☆ اس کی تشریح کے لیے میرا نکاح نامہ کتاب میں موجود ہے اس کی کاپی آپ چھاپ دیجیے اس پر میرے گواہوں کے بھی دستخط ہیں اور میرے وکیلوں کے بھی دستخط ہیں اور دستخط نہیں ہیں تو میرے نہیں ہیں۔تو یہ عورت کی پوزیشن تھی جو آج بھی انگوٹھا لگاتی ہے۔میں نے لکھا ہے کہ انگوٹھے کی مہر پر رخصت ہونے والی عورت۔

☆ آپ باقر رضوی صاحب کی اس رائے سے کس حد تک متفق ہیں کہ تمام نظریات،تصورات اور نصب العین مردوں کی بنائی ہوئی خرافات ہیں؟

☆☆ میں خرافات نہیں کہتی۔ایک زمانے نے ترقی کی ہے۔اور اس نے اپنے آپ کو بدلا ہے۔ میری ماں نے قرآن ناظرہ پڑھا تھا اور ہمیں دسویں تک پڑھانے کی تحریک باپ سے ناراضگی مول لے کر دی۔وہاں پڑھائی کا ایک شعبہ جو تھا وہ دسویں تک تھا۔میں نے وہ قسم توڑی اور میں نے کہا کہ میں کالج بھی جاؤں گی تو ہر عمل کا ایک ردعمل ہوتا ہے تو اس وقت پریشانی جو تھی کہ دوسری بہنوں نے تو نہیں کہا میں کالج جاؤں گی۔کالج میں جانے کے بعد یونیورسٹی جانے کی بڑی مصیبت تھی۔لیکن پھر وہ چیزیں ہوئیں کہ جن کو آگے چل کر معاشرے نے قبول کیا۔پھر اس کے بعد یہ نہیں ہوا بس میں تھی کہ جس نے ذرا سا پڑھنے کی کوشش کی تو میرے خلاف سب کچھ ہوا۔

☆ کچھ تفصیل شادی کے حوالے سے بتلایئے؟

☆☆ شادی کے سلسلے میں ساری تفصیل فردوس حیدر اپنے مضمون میں بتلا چکی ہے۔ہم سید تھے وہ کشمیری تھے۔سیدوں کا یہ رونا تھا کہ کشمیری کہاں سے آ گئے اور کشمیریوں کا یہ رونا تھا کہ سیدوں میں کہاں چلے گئے۔اس کے بعد کسی نے رولا نہیں ڈالا۔سب کی شادیاں مختلف ذاتوں میں ہوئیں۔کسی نے کوئی مصیبت نہیں ڈالی۔

☆ آج کی نشست میں وضاحت سے اُن روّیوں کی نشان دہی کیجیے جو مردوں کے معاشرے میں آپ کو اکثر رہا کرتی ہیں؟

☆☆ ایک بات تو یہ ہے کہ پہلے کوشش کرتے تھے کہ ایک پیراگراف میں ساری شاعرات کے نام آجائیں۔ایک پیراگراف میں ساری نثر نگار کے نام آجائیں۔باقی وہ ابتداء سے جب شروع کرتے تھے تو ختم ہی نہیں ہوتا تھا لیکن آخرکار جب ہم لوگوں نے شور مچایا سب سے پہلی بات جارج ایلیٹ نے کہی تھی۔جب تک عورتیں اپنے بارے میں نہیں لکھیں گی اس وقت تک عورت کے بارے میں کچھ نہیں لکھا جائے گا۔تو پھر عورتوں نے بھی لکھنا شروع کیا خالدہ حسین نے بہت اچھا لکھا اور اس سلسلے میں یہ چیزیں بہت سامنے آئیں۔ممتاز شیریں نے لکھا کہ عورت کے ایشوز کے اوپر وہ لکھتی ہیں کہ اس کو کھولنے کے لیے ہمیں ازار بند کی ضرورت نہیں ہوتی۔نہ ہمیں لحاف کو پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ہمیں اس جذبے کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس میں لحاف لکھا گیا۔

☆ بُری عورت کی کتھا،بُری عورت کے خطوط وغیرہ جیسے عنوان پڑھنے کے بعد یہ سوال ذہن میں آنا فطری بات ہے کہ آپ کو اردو ادب کی اس قدر بُری عورت کیوں گردانا گیا؟

☆☆ انھوں نے نہیں گردانا میں نے خود گردانا ہے۔میں نے اس لیے بتایا،میں نے اس لیے لکھا بار بار کہ بُری ہر وہ عورت ہوتی ہے جو اپنے خاندان سے تھوڑی سی بغاوت کرتی ہے اس کو برا کہا جاتا ہے اس کے بعد کوئی بُرا نہیں رہتا۔میں نے صرف چونکہ بغاوتیں کیں۔جو در بند تھے ان کو کھولا سب لوگوں نے مجھے بُرا کہا۔بعد میں ٹیلی ویژن میں بھی جانے لگے۔ریڈیو میں بھی جانے

لگے۔ میری چھوٹی بہن نے ڈاکٹری کی اور میرے بھائی نے اپنی پسند کی شادی کی اور میری چھوٹی بہن نے بھی اپنی مرضی سے شادی کی۔ ان میں سے کسی نے ان کو غلط نہیں کہا۔ صرف میں ہی غلط تھی۔

☆ آزادیٔ نسواں کا جو تصور آپ کے ہاں پایا جاتا ہے تیسری دنیا بلخصوص پاکستان کے موجودہ منظر نامہ میں اُس کے روبہ عمل آنے کے کتنے امکانات ہیں؟

☆☆ اس کا روبہ عمل کافی حد تک ہو چکا ہے۔ ایک تو فیملی لاز کے ہوتے ہوئے ذہنی طور پر دوسری شادی کرنے کے سلسلے میں شعور آ گیا ہے۔ لڑکیوں میں اور لڑکوں کے ہاں بھی ذہنی طور پر شعور آ گیا ہے کہ اپنے آپ کو یہ پہچاننا کہ ان کا رشتہ کس کے ساتھ کیسا بنے گا۔ یہ چیز جو ہے یہ بڑی حد تک آپ کو احساس دلاتی ہے کہ ہمارے ہاں معاشرے میں عورت اور مرد میں تفاوت کم ہوتا جا رہا ہے۔

☆ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے کہ ایک زمانے میں کچھ لوگ اپنی عورتوں کو آپ سے پردہ کرانے لگے تھے۔ منیر نیازی مرحوم نے دوسری شادی کے بعد آپ کا تعارف بھائی جان کشور ناہید کہہ کر کراتے ہوئے بیگم کو پردے کی تاکید کی تھی؟

☆☆ دونوں چیزیں غلط ہیں منیر نیازی نے کہا تھا جب صغریٰ سے ان کی شادی ہوئی تھی کہ اگر مجھے اپنی عورت کو کسی سے پردہ کرانا پڑا تو میں کشور ناہید سے کراؤں گا۔ دوسری بیگم سے تو ملانے کے لیے خود لے کر گئے تھے۔

☆ کیا آپ اُن لوگوں اور حلقوں کی نشان دہی فرمائیں گی جنھوں نے آپ کی سرکشی کے باعث آپ کو نظر انداز کیا۔ یہ سرکشی کس قسم کی تھی اور کس کے خلاف تھی؟

☆☆ ادب میں سرکشی ہر اچھے لکھنے والے نے کی میں اپنے آپ کو اچھا لکھنے والا نہیں کہہ رہی۔ راشد نے سرکشی کی، فیض صاحب نے سرکشی کی انقلاب اور محبت کو اکٹھا ملا کر پیش کیا۔ تصدق حسین نے بہتر شاعری کی۔ مختار صدیقی نے سرکشی کی کہ انھوں نے انقلابوں کے اوپر نظمیں لکھیں۔ میراں جی نے سرکشی کی کہ انھوں نے گیت اور نظم دونوں کو ملا کے آپ کے سامنے پیش کیا۔ فراز نے سرکشی کی کہ اس نے محبت اور انقلاب کو ملا کے پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس لیے جو بھی سرکش ہو گا وہ اپنے انداز کو ایک نئے انداز سے ملا کے پیش کرے گا۔ اپنے عہد میں غالب نے بھی سرکشی کی تھی کہ فارسی میں شاعری کی جا رہی تھی اس نے اردو میں غزل کہہ کر اپنے آپ کو نمایاں کیا۔ میر نے سرکشی کی تو اس زمانے کے آشوب کو آج تک ہم پڑھتے ہیں اس کے حوالے سے معاشرے کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

☆ کچھ تفصیل اپنی ترقی پسندی اور ترقی پسندوں کے افعال و اشغال کی بیان کیجیے اور اس نظریہ کے ماضی، حال، مستقبل کی بابت اپنا حسنِ ظن بھی بتلایئے؟

☆☆ ترقی پسند اپنے آپ کو کہنے سے تو کوئی ترقی پسند نہیں ہوتا جس معاشرے میں اور جس ماحول میں میں نے آنکھ کھولی ایک طرف سبطِ حسن، ایک طرف اردو میں شاعر احسان دانش تھے۔ فیض صاحب تھے اور ایک طرف ہمارے سامنے سجاد ظہیر تھے۔ دو ملاقاتیں سجاد ظہیر سے بھی میری ہوئیں۔ یہ لوگ جو تھے اس کے بعد عبداللہ ملک ہیں، آئی اے رحمٰن ہیں۔ اللہ ان کو زندگی دے۔ ان لوگوں کے ساتھ ہمارا بچپن گذرا ہے۔ ہم نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے اور مزدور رہنما ابراہیم صاحب تھے۔ ہمارے لیے تو یہ لوگ بہت بڑے لوگ تھے۔ بچپن ہی سے ہم نے ان چیزوں کو دیکھا۔ ان سے سلیقہ سیکھا۔ چیزوں کو بدلنے کے لیے کچھ تو کرنا چاہیے۔ کچھ کرنے میں اگر آپ سو فیصد بھی کچھ کرتے ہیں معاشرے کے لیے تو آگے جا کے دو سو فیصد ہو جاتا ہے۔

☆ ادب اور سیاست کا تال میل کس طرح ہو سکتا ہے۔ اس حوالے سے اپنی کاوشات اور تجربات میں ہمیں اور ہمارے قارئین کو ضرور شریک کیجیے؟

☆☆ ادب اور سیاست کو الگ کرنے سے آپ کو کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا۔ آپ نے بہت کوشش کی ادب کرنے کی لیکن ادب نہیں ہوا اور آپ نے بہت کوشش کی ادب اور سیاست کو الگ کرنے کی تو کوئی شخص جو تھا وہ نمایاں مقام حاصل نہیں کر سکا۔ سیاست جو ہے وہ اسی طرح شامل ہے جیسے کہ زندگی میں ہوتی ہے۔ ہمیں یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ پاکستان میں سیاست اس لیے زیادہ ہے کہ ہمارے ہاں اس پر پابندیاں رہی ہیں۔ آپ نے تو شاید وہ زمانہ دیکھا ہے یا نہیں میں نے تو سنسر کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب قرآن کی آیتیں بھی سنسر ہوتی تھیں۔ میں نے وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب میں ''ماہِ نو'' کا مسودہ لے کے جاتی تھی سنسر کے لیے تو وہ کہتے تھے رات کا لفظ آیا ہے، اس کو کاٹ دیجیے۔ میں نے کہا ہاں اس کی جگہ دن کر دوں۔ ہاں میڈم کر دیں۔ میں نے کہا دن میں رات شامل ہوتی ہے اور بھی بہت کچھ ہے سوچ سمجھ لیں آپ۔ ان لوگوں کا یہ طریقہ تھا کہ فہمیدہ ریاض کی جگہ میں زرینہ ریاض لکھ دیتی تھی بعد میں چٹ اتار کے فہمیدہ کی جگہ زرینہ لکھ دیتی تھی ان کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ فہمیدہ ریاض ہے یا زرینہ ریاض ہے۔ تو سنسر شپ کا اتنا سخت ماحول ہم نے دیکھا ہوا ہے اس لیے ہم سے کیا پوچھتے ہیں ہمارے زخموں کا جو ہمارے اندر چھپے ہوئے ہیں۔

☆ کہا جاتا ہے کہ کشور ناہید تیسری دنیا کی عورتوں کے دُکھ، درد سمیٹنے میں کوشاں نظر آتی ہیں۔ اوّل آپ اپنی کوشش میں کس قدر کامیاب رہیں دوئم یہ کہ مغرب کی عورت تمام دُکھ اور پریشانیوں سے مُکت ہو چکی ہے کیا؟

☆☆ میں نے کبھی نہیں کہا کہ مغرب کی عورت کے تمام مسائل حل ہو چکے ہیں۔ مغرب کی عورت کو آپ اس طرح نہیں دیکھتے کہ وہ صبح ساڑھے پانچ بجے اٹھتی ہے۔ وہ ٹرین سے جاتی ہے پھر ایک بس سے جاتی ہے۔ پھر دوسری بس سے جاتی ہے۔ جب وہ لنچ کے لیے نکلتی ہے تو ایک ہاتھ میں اس کے کافی کا کپ ہوتا ہے اور سینڈوچ ہوتا ہے اور گاڑی چل رہی ہوتی ہے اس کو شاپنگ کرنی ہوتی

ہے رات کے کھانے کے لیے اُن کی مصروفیات کو تو آپ نے شاید دیکھا ہی نہیں۔

☆ ورجینا وولف کی ایک بڑی خواہش شیکسپیئر کی بہن بننا تھا۔آپ کے ہاں کبھی اس طرح کی کسی خواہش نے سرنہیں اُبھارا؟

☆☆ میں نے کسی کی بہن نہیں بننا ہے۔جب مجھے قاسمی صاحب نے لکھا تھا کہ میری بہن تو میں نے کہا تھا کہ میں اپنے بھائیوں کی بہن نہیں ہوئی آپ کی کیا ہوں گی۔

☆ آپ کو سارتر کی رفیقۂ حیات سے تشبیہہ دینے والے کہنا کیا چاہتے ہیں؟

☆☆ سارتر کی رفیق حیات نہیں تھی،اس کی دوست تھی۔

☆ آپ کا امیج بہادر خاتون کا ہوتے ہوئے یہ تصور کیوں کیا جاتا ہے کہ گردوپیش کے خوف نے آپ کو اپنی شخصیت کے اظہار سے روک رکھا ہے؟

☆☆ میرے اردگرد خوف نہیں ہے مگر معاشرے میں اتنا خوف ہے کہ جب میں بھاری بوٹوں کا ذکر کرتی ہوں تو اخبار والے ڈر جاتے ہیں،جب میں داڑھی کا ذکر کرتی ہوں تو بھی اخبار والے ڈر جاتے ہیں کہ ہمارے دفتر کو آ کے جلا دیں گے۔ان کے اندر بھی ایک سپاہی بٹھا دیا ہے مارشل لاء کے زمانے سے ان ساری باتوں سے خوف آنے لگ جاتا ہے۔

☆ آپ کو اپنے بے باکانہ بلکہ باغیانہ طرزِعمل کے باعث کسی طرح کا Guilt،پچھتاوا یا ملال تو نہیں؟

☆☆ نہیں،ہرگز نہیں! آپ کو حق ہے کہ میرے طرزِعمل کو Guilt،بے باکانہ،باغیانہ یا کوئی نام دیں۔میں اسے سچ کا نام دیتی ہوں جو میں نے پوری دیانتداری سے رقم کیا ہے۔

☆ حالات کے جبر اور اظہارِ رائے کی پابندی کے سبب کبھی آپ کے دل میں سمندر پار آزاد معاشرے میں بسنے کا خیال نہیں آیا؟

☆☆ کبھی نہیں،کبھی بھی نہیں! میرا تخیل،میری تحریر،میری تہذیب، سب اسی معاشرے کی دین ہے۔میں جب سخت حالات سے گزر رہی تھی تو میں نے بچوں کو باہر بھیج دیا تھا۔اپنے ماحول اور اپنے لوگوں سے کٹ کر میں نے رہ سکتی ہوں اور نہ لکھ سکتی ہوں۔

☆ دنیا کی سیاحت کے بعد آپ کو کس ملک کے ادیب،ادب،زبان اور ثقافت نے زیادہ متاثر کیا؟

☆☆ ویسے تو ساری دنیا میں اچھا ادب بھی ہوتا ہے اور بُرا ادب بھی ہوتا ہے۔وہ تیسری دنیا کے ادب کو عجیب وغریب سمجھتے تھے۔وہ کہتے تھے کہ پاکستان میں ان مسائل کا سامنا کرنے والی عورتیں ہیں جو مسائل کا شکار ہیں۔جب میں نظمیں پڑھتی تھی تو کہتے تھے کہ یہ نظمیں تمھارے ملک میں چھپتی ہیں۔میں نے کہا کہ کتابی شکل میں بھی چھپی ہوئی ہیں۔میں نے کہا اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہنے لگے ہاں اس سے فرق تو نہیں پڑتا۔آپ کے ملک میں عورت اور مرد کو برابر کی تنخواہ نہیں ملتی۔آپ نے کبھی احتجاج کیا ہے۔احتجاج مغرب کی عورت کو عجیب سا لگتا ہے۔ جب سے نائن الیون ہوا ان کی زندگی میں احتجاج کا لفظ آیا ہے ورنہ ان کے ہاں احتجاج آیا ہی نہیں۔

☆ اردو ادب کا عالمی ادب میں کیا مقام،معیار اور اعتبار ہے اور آنے والے دنوں میں کس طرح کی صورت حال بنتی نظر آرہی ہے؟

☆☆ اردو ادب کو اصل میں دوسری زبانوں میں منتقل نہ کرنے کی ذمہ داری حکومتی اداروں پر آتی ہے اور پھر ہمارے ہاں کوئی بھی دارالترجمہ نہیں ہے۔ہندوستان میں دارالترجمہ الگ ہے اور ہر صوبے کی زبان الگ ہے اور ساہتیہ اکیڈمی الگ ترجمہ کرتی رہتی ہے۔ہمارے ہاں ترجمے کی نوبت ہی نہیں آتی۔اب میں گئی ہوں ارجنٹینا تو پہلے کولمبیا میں میری نظموں کے ترجمے ہوئے تھے وہ ترجمے انھوں نے دیکھے ان کو دیکھ کر انہوں نے کہا کہ ایک لڑکی ہے ایک خاتون ہے کشور ناہید اس کی نظموں کے ترجمے ہوئے ہیں،ہمیں ملا دیجیے ان کو اور اگر ترجمے نہ ہوئے ہوتے تو مجھے ارجنٹینا نہیں بلایا جاتا۔سپینش میں ترجمے میرے موجود تھے۔ہماری زبانوں کے اگر ترجمے ملیں گے تو آشنائی ہوگی نا۔اردو بڑی زبان ہے لیکن دنیا کی بڑی زبانوں کے درمیان نہیں آ کے بیٹھی۔اور پھر فرنچ سپینش اور انگریزی بڑی زبانیں ہیں جن کے درمیان ہمیں بیٹھنا چاہیے۔

☆ آپ کا،کام مختلف جہات کا حامل بھی ہے اور معیاری بھی۔جاننا ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ کو اپنی جدوجہد کا صلہ توقعات کے مطابق ملا کہ نہیں گر نہیں تو اس کا قصور وار کون ہے اور اس کا ازالہ ہونے کے کس قدر امکانات ہیں اور یہ بھی کہ آپ ادبی مورخ سے کس مقام کی طلب گار ہیں؟

☆☆ دیکھئے غالب کو اپنے زمانے میں پتہ تھا کہ مجھے کوئی عزت نہیں ملی مگر اس کو سو سال بعد عزت ملی۔اللہ میاں ہر ایک کو عزت دے،زمانہ اخبار نہیں ہوتا یہ ادب کی بہت بڑی مشکل ہے کہ اسی وقت آپ ترازو میں تولنا چاہتے ہیں۔یہ کوئی ہرے ہرے کریلے نہیں ہیں یا کوئی سبزی نہیں ہے۔منٹو کو ان کے مداحوں نے اس کے مرنے کے بعد بھی پسند کیا۔راشد کو،اقبال کو بھی پسند کیا مگر ان کو زمانے سے گلہ نہیں رہا۔مجھے اپنی محبت اور ادیبوں کی خدمت کرنے کا موقع ملا ہے۔بہت عزت ملی ہے ان کے ساتھ محبت سے پیش آنے کی۔مجھے زمانے سے کبھی کوئی گلہ نہیں رہا۔

☆ نوجوان لکھنے والوں کو اپنی جانب سے کوئی پیغام دینا چاہیں گی؟

☆☆ نئے لکھنے والوں سے یہ کہوں گی کہ ہمیں بہت سوچ سمجھ کر شاعری کے مجموعے چھپوانے چاہئیں۔جذباتی شاعری تیس سال کی عمر تک ہوتی ہے۔اس کے بعد شاعری آپ کو جھنجوڑتی ہے اور شاعری میں پختگی آنا شروع ہو جاتی ہے۔یہیں سے شاعر کا امتحان شروع ہوتا ہے، وہ چاہے تو گردوپیش کی دیانتدارانہ عکاسی کر کے سرخرو ہوسکتا ہے۔

''رشکِ گناہ''

(کشور ناہید صاحبہ کے غزلیہ کلام سے مختصر انتخاب)

پنہاںؔ (یو۔ایس۔اے)

○

سنبھل ہی لیں گے، مسلسل تباہ' ہوں تو سہی
عذابِ زیست میں رشکِ گناہ' ہوں تو سہی

کہیں تو ساحلِ نایافت کا نشاں ہوگا
جَلا کے خود کو تقاضائے آہ ہوں تو سہی

مجال کیا کہ نہ منزل بنے نشانِ وفا
سفیرِ خود نگراں، گردِ راہ ہوں تو سہی

صدا بدشت بنے گی نہ یہ لُہو کی تپش
لُہو کے چھینٹے مگر گاہ گاہ ہوں تو سہی

ہے رات کھولے ہوئے بال' دلفگار کہ اب
طلوعِ صُبح کے آثارِ راہ ہوں تو سہی

خود اپنے عکس سے نالاں پھریں گے یہ خود بیں
فریب و مکر، مجسّم پناہ ہوں تو سہی

یہ خود فریبیٔ احساسِ دلبری ہے سراب
مقامِ حشر ہو، باہم گواہ ہوں تو سہی

○

دِل بُجھ گیا ہے زِشت کو مختار دیکھ کر
لب سِل گئے سلاسلِ اظہار دیکھ کر

شعلہ ہے دل تو جل بھی بجھے، سرد بھی تو ہو
پھُونکے ہمیں نہ رونقِ عیّار دیکھ کر

رُکتی ہے سانس، قدغنِ اظہار کے سبب
بڑھتے ہیں دام، شوقِ خریدار دیکھ کر

اندیشہ ہائے گفتنی، نا گفتنی کے بیچ
ہنستے ہیں جام قحطِ قدح خوار دیکھ کر

لرزو نہ پانیوں میں پڑے عکس کی طرح
پیچھے ہٹو نہ سطوتِ آزار دیکھ کر

☆

''چہار سُو''

○

غموں کی جلتی چِتا تھیں جوانیاں اپنی
بزعمِ خویش تھیں تازہ کہانیاں اپنی

خمارِ شوق نہ تھا شب کے گنبدوں پر رقم
نژادِ شبنم و گُل تھیں نشانیاں اپنی

مِلے جو تم سے مُلاقات ہوگئی خود سے
ستیزِ عجز تھیں، شعلہ فشانیاں اپنی

ہر ایک لفظ تھا منسوب، جو کسی نے کہا
نہ کام آئیں کبھی بے زبانیاں اپنی

خمارِ رنج سے آتش زدہ تھے گیسو بھی
زوالِ شوق کی تھیں بدگمانیاں اپنی

یہ زعم تھا کہ چھپالیں گے حالِ دل اس سے
ملے تو روئے، سُنائیں کہانیاں اپنی

کہیں چراغ، کہیں گُل، کہیں پہ زُلف دوتا
تری گلی میں تھیں طُرفہ نشانیاں اپنی

وہ روشنی ہو، اماوس کی رات گھبرائے
مِلا دو خاک میں ایسے جوانیاں اپنی

○

اُترا غبارِ درد والم مُدّتوں کے بعد
آئی ہے موجِ بادِ کرم مُدّتوں کے بعد

پھر دل کو ہوگئی ہے وہی رہگزر عزیز
پھر آ گئے فریب میں ہم مُدّتوں کے بعد

پھیلی ہے سطحِ زمین پہ ہلکی سی چاندنی
لپٹے ہیں تیری یاد سے ہم مُدّتوں کے بعد

دل میں رکھیں کہ سر سے لگائیں کہ چُوم لیں
دیکھا ہے ایک نقشِ قدم مُدّتوں کے بعد

ہم تو وفا شعار رہے ہیں تمام عُمر
تم نے جفا بھی کی تو صنم مدّتوں کے بعد

ناہیدؔ خونِ دل میں قلم کو ڈبو کے آج
لکھّی ہے داستانِ الم مدّتوں کے بعد

☆

○

ہرمرحلہ پہ شوق تماشائی چاہیے ہے
عشقِ نمود پیشہ بھی رسوائی چاہیے ہے

گھلنے لگا ہواؤں میں مایوسیوں کا زہر
پھر جی اُداس ہے وُہی پُروائی چاہیے ہے

ڈھونڈے ہے اپنی ضِد کے مقابل کی کوئی شے
شوقِ جنوں شعار تو رسوائی چاہیے ہے

خوبی ہے لاکھ وصفِ تحمّل، شکیب وضبط
لیکن نگارِ شوق پذیرائی چاہیے ہے

یہ دل نہ چل سکا کبھی اُڑتی ہوا کے ساتھ
یہ دل تعلّقات کی گہرائی چاہیے ہے

جلوہ نہ ہو تو موجِ جُنوں تیز کیسے ہو
آنکھیں نہ ہوں تو کون تماشائی چاہیے ہے

وہ کون ہے جو ساتھ ہمارے بھی چل سکے
وہ کون ہے جو غم سے شناسائی چاہیے ہے

رکھو تو زندگی میں شریکِ الم کوئی
ناہیدؔ، عرضِ حال بھی شنوائی چاہیے ہے

☆

○

کہتے ہیں مَیں سوتے سوتے چلتی ہوں
ہنستا دیکھ کے لوگوں کو رو دیتی ہوں

خواہش میرا پیچھا کرتی رہتی ہے
مَیں کانٹوں کے ہار پروتی رہتی ہوں

گرمی کی بیکار دوپہروں میں اکثر
جلتی ہوئی زمین کی دھڑکن سُنتی ہوں

جب میرا چلنے کو جی نہیں چاہتا ہے
پاؤں کی دیوار بنا کے بیٹھتی ہوں

کھال پرانی ہاتھ سے گرتی رہتی ہے
بات پرانی پیٹ میں پالتی رہتی ہوں

دیکھ کے باہر منظر نئے بُلاوے کا
میں کھڑکی کو اینٹوں سے چُن دیتی ہوں

فاختہ بن کے اُڑنے کو جی چاہتا ہے
پَر آجائیں تو گھر میں چھپ جاتی ہوں

جاگتے میں لکڑی کی طرح سُلگتی ہوں
اورسوتے میں چلتی ہوا سے لڑتی ہوں

اپنا نام بھی اب تو بھول گئی ناہیدؔ
کوئی پکارے تو حیرت سے تکتی ہوں

☆

○

پہن کے زخم کا ملبوس، اپنے گھر جانا
سمیٹ لو کہ ہے پھر شام کو بکھر جانا

ملی نہ لاش زمیں اور پانیوں میں کہیں
اسے ہی سارے زمانے سے خوش خبر جانا

پرندے سارے اُڑے جارہے ہیں کس جانب
تمھیں خبر ہو تو دریا کے پار ، اُتر جانا

وہ جس کی آنکھ میں سچ اور زباں پہ جھوٹ بھی ہے
وہ پاس آئے تو آنکھوں ہی میں اُتر جانا

لرز رہی ہے زمیں، سہمی لڑکیوں کی طرح
پُکارتی ہے کہ تنہا نہ چھوڑ کر جانا

بندھے ہیں پیٹ سے بچّے بھی اور پیسے بھی
زمیں کی بیٹی کی تصویر دیکھ کر جانا

وہ جس کا شوق ہے کھلتے گلاب مَل دینا
گلے مِلو تو اسے بھی اُداس کر جانا

☆

○

ستم شناس ہوں لیکن زباں بریدہ ہُوں
مَیں اپنی پیاس کی تصویر بن کے زندہ ہُوں

طلب کی زشت نے دیوانگی مقدر کی
شفق کے روپ میں، مَیں رنگِ بریدہ ہُوں

زباں ہے قرمزی حدّت سے میرے سینے کی
میں مثلِ سنگ چیخ کے بھی سنگ خوردہ ہُوں

علاج حرفِ شنیدہ کا کِس سے ہو پائے
ورق ورق ہوں مگر حسرتِ رمیدہ ہُوں

شہید جذبوں کی قبریں سجا کے کیا ہوگا
کھنڈر ہوں، قامتِ شب ہوں، بدن دریدہ ہُوں

وہ ماہ وسال کی شاخوں میں چھپ کے دیکھتا ہے
مَیں آئینے میں اسے دیکھ کے تپیدہ ہُوں

☆

○

علاجِ زخم بھی تھا بندشِ زبان کے عوض
ہمیں نے قید نہ مانگی مگر اماں کے عوض

نہ مانگیں شب کہ جسے چادرِ سحر نہ ملے
نہ پہنیں خلعتِ جاں، یارِ مہرباں کے عوض

زمیں پہ موسمِ خوں اس برس ہی آیا ہے
لگی ہے قیمتِ جاں، طلعتِ سناں کے عوض

خلا میں بیٹھ کے تنہائیاں بٹورتے ہیں
تلاش کرتے ہیں پہنائیاں، مکاں کے عوض

سراغ دیتا ہے لہجہ ، شکستہ پائی کا
فراخیٔ لبِ احساس ہے زیاں کے عوض

وہ قیدِ کوہ میں رہ کے بھی شہر شہر میں ہے
ہوئی ہے ہم سخنی کارِ بے زباں کے عوض

ہر ایک شب وہ نئے پیرہن میں ظاہر ہو
تلاشِ شعلۂ جاں لب بہ لب فغاں کے عوض

وہ سرو قد بھی تو زنجیر ہو گئے ناہید
زمیں کو اوڑھ کے بیٹھے جو آسماں کے عوض

☆

○

سلگتی ریت پہ آنکھیں بھی زیر پا رکھنا
نہیں ہے سہل ، ہوا سے مقابلہ رکھنا

اُسے یہ زعم کہ آغوشِ گُل بھی اُس کی ہے
جو چاہتا ہے پرندوں کو بے نوا رکھنا

سُبک نہ ہو یہ نگہداریٔ جنوں ہم سے
یہ دیکھنے کو اُسے سامنے بٹھا رکھنا

بکھر نہ جانا جراحت نوازیٔ شب پر
مشامِ جاں کو ابھی خواب آشنا رکھنا

وہ فرصتیں کہ جنہیں آہٹوں کی خواہش ہو
انہیں جرس کی تمنا سے ماسوا رکھنا

تمام منظرِ جاں اُس کی خواہش سے بنا
وہ خواب ہے تو اُسے خواب میں سجا رکھنا

اُداسیوں کو تو آنگن ہی چاہئیں خالی
چھتوں پہ چاندنی راتوں کا سلسلہ رکھنا

وہ جب بھی آیا بہت تیز بارشوں جیسا
وہ جس نے چاہا مجھے سرمئی گھٹا رکھنا

بس اِک چراغ، مسافت کا بوجھ سہہ لے گا
سُخن کے پیچ، طلب گاریٔ وفا رکھنا

☆

○

مقابرِ خواب دان عجب انتظار میں ہیں
کہ اس کی بیگانگی کے قصے شمار میں ہیں

حساب کرتے ہُوئے مرے خواب پوچھتے ہیں
وہ مرحلے آرزو کے ، کس اعتبار میں ہیں

محیط رکھتا ہے میرے اشکوں کو میرا دامن
یہ وہ خزینے ہیں جو مرے اختیار میں ہیں

وہ خلعتِ اجتناب میں بھی قریب ہی تھا
یہ میری آنکھوں کے قوس! شہرِ مزار میں ہیں

مجھے درِ علم کی فضیلت بتا نہ پائی
کہ جینے والے بھی موت ہی کے مدار میں ہیں

جزیرہ باتوں کا خواب بستا تھا، لوگ خوش تھے
زمیں ہلی تو خبر ہوئی کس شمار میں ہیں

قیامتیں مجھ کو ڈھونڈتی میرے گھر پہ پہنچیں
یہ دیکھنے کہ سراب کس انتشار میں ہیں

خوشا کہ زخموں کے خشک پیڑوں نے رنگ پہنا
خوشا کہ ماتم گسار لمحے قطار میں ہیں

ابھی تو اے اخترِ ہزیمت چمک اُفق پر
ابھی تو ماتم گساریاں، اختیار میں ہیں

ابھی نہ کر رُخ پریشاں جانی، عدم روی کا
ابھی بہت ڈوبتے سفینے کنار میں ہیں

☆

○

کبھی وہ آنکھ کبھی فیصلہ بدلتا ہے
فقیہہ شہر، سفینہ بدست چلتا ہے

وہ میری آنکھیں جنہیں تم نے طاق پر رکھا
انہیں میں منزلِ جاں کا سراغ ملتا ہے

اب اگلے موڑ کی وحشت سے دل نہیں ہارو
زوالِ شام سے منظر نیا نکلتا ہے

مجھے سوال کی دہلیز پار کرنی تھی
یہ دیکھنے کہ اِرادہ کہاں بدلتا ہے

شکستِ ساعتِ جاں، ورنہ زمیں تو نہیں
بھنور کا پاؤں سوادِ سفر نکلتا ہے

ہزیموں کی صلیبوں کو شب چراغ کرو
کہ آندھیوں کا سفینہ یونہی سنبھلتا ہے

گلی گلی میں خموشی کواڑ پیٹے ہے
یہ کون ہے جو نئی کونپلیں مسلتا ہے

بس اب تو آنکھ بھی، آئینہ بھی، سبھی حیراں
کہ اس کا عکس دُھواں سا گھروں پہ ملتا ہے

مری زباں پہ کوئی ذائقہ ٹھہر نہ سکا
کہ مجھے میں اور کوئی پیرہن بدلتا ہے

☆

○

نہ فصلِ جاں پہ، نہ احساسِ جاں پہ زندہ ہیں
یہ لوگ ڈوبتے شہرِ اذاں پہ زندہ ہیں

نظامِ کوچۂ قاتل ہی بار پائے گا
کہ اہلِ شوق، فصیلِ گماں پہ زندہ ہیں

یہ تیغِ شب ترے زندانیوں کو خوش آئے
کہ اہلِ شوق فصیلِ گماں پہ زندہ ہیں

بدن بدلنے چلا ہے خمارِ شب اب کے
مسافتیں گلِ خواہش بیاں پہ زندہ ہیں

وہ زخم جن پہ لہو زعمِ تازگی دیکھے
وہ آئینے ہیں جو آبِ رواں پہ زندہ ہیں

نمائشوں میں رکھی آنکھ ڈھونڈتی ہے انہیں
جو لوگ اپنے لہو کے نشاں پہ زندہ ہیں

سفر سے پہلے سفر کی تھکن سے عاجز ہیں
وہ تیر جو ابھی خوابِ کماں میں زندہ ہیں

☆

○

اس موسم کی پہلی بارش ہی سیلاب ہوئی
صحرا سے ڈرنے والوں کی شام عذاب ہوئی

فاختہ بھی وحشت پہنے تھی، بلبل بھی چپ تھی
کس بارود کی بُو تھی جس سے ہستی آب ہوئی

فریادوں کو اوڑھنے والے چہرہ کھولیں کیا
یہ وہ آئینہ ہے جس میں شکل خراب ہوئی

سودا تھا جلدی چلنے کا، آنکھ بھی رکھنی تھی
ان نیزوں پہ جن کی کماں گردن محراب ہوئی

آنکھ کو خواب ملیں اور سائے کو انسان ملیں
ورنہ یہ ساری بستی تو محرمِ آب ہوئی

ہونٹوں پہ اندیشے رکھے، بول سکو گے کیا
بُوجھ سکو گے دیش کی مٹی کیوں زہراب ہوئی

اس دیوار کی پچھلی جانب پھُولوں کی خوشبو
پُوچھ رہی ہے اس آہٹ کا جو سیماب ہوئی

☆

''رت جگوں سے آشنا''

سید سبط حسن

(۵)

قدرت کی سب سے حسین اور معنی آفرین تخلیق عورت ہے۔ شاید اسی سبب سے دُنیا کی بیشتر شاعری کا موضوع عورت کی ذات ہے۔ وادیٔ دجلہ وفرات کی عشتار، ایران کی ناہید وشیریں، بخد کی لیلیٰ، مصر کی ازلیس وقلو پطرہ، وادیٔ گنگ وجمن کی سیتا اور درو پدی، یونان کی ہیلن، اٹلی کی بطریس، پنجاب کی ہیر اور سوہنی اور سندھ کی سسّی، غرضیکہ بے شمار فرضی اور تاریخی عورتیں جن کے گیت شاعروں نے گائے ہیں لیکن عورت جس کو ہم سراپا شعر سمجھتے ہیں جب خود شاعر کے رُوپ میں ظاہر ہوتی ہے تو ہمارے جذبات کا راویتی آہنگ بگڑ جاتا ہے۔ چنانچہ اب بھی یہ حال ہے کہ مشاعرے میں اِدھر خاتون شاعر کا نام پکارا گیا اُدھر عینک کے شیشے صاف ہونے لگے اور ٹائی کی گرہ ٹھیک کی جانے لگی۔ عورت کو ہم نے ابھی تک انسان تسلیم نہیں کیا ہے۔ وہ ہنوز ایک جنس ہے۔

اردو ادب میں خاتون شاعر ہمیں خال خال ملتے ہیں۔ کیونکہ شعر وسخن ابھی نصف صدی پہلے تک مردوں ہی کا مشغلہ تصور ہوتا تھا۔ اس لیے تو شاعر نے کہا تھا:

لڑکی وہ لڑکیوں میں جو کھیلے
نہ کہ لڑکوں میں جا کر ڈنڈ پیلے

مگر پرانے اقدار اب بدل چکے ہیں۔ اب تو حضرت اکبرالہ آبادی کی پھبتیوں کے باوجود لڑکیاں انگریزی پڑھ رہی ہیں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں مردوں کے دوش بدوش مصروفِ عمل ہیں اور اَدب کے میدان میں تو اب اُن کی ریل پیل ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ سخن شناسوں کا روّیہ اُن کی جانب ہنوز مشفقانہ یا عاشقانہ ہے۔ وہ خاتون شاعروں کے کلام کا جائزہ لیتے وقت اُن کی نسوانی شخصیت کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ ہم ہوئے، تُم ہوئے کہ میر ہوئے، اس بدعت سے کوئی بری نہیں ہے۔

''لبِ گویا'' میں اُن ادبی سراغ رسانوں کے لیے بڑا مواد موجود ہے جو تحلیلِ نفسی کے شوقین ہیں جو فن کار کی تخلیق سے اُس کی آپ بیتی مرتب کرنے کے درپے ملتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''لبِ گویا'' کسی ایک شاعر کی آپ بیتی نہیں ہے بلکہ پوری ایک نسل کی آپ بیتی ہے۔ اُس نسل کی جس نے گزشتہ بیس بائیس برس میں ہوش سنبھالا ہے۔ ''لبِ گویا'' اسی نسل کے حِسّی تجربوں کا ہلکا سا پرتو ہے۔ مگر ان حِسّی تجربوں کو نوعیت کیا ہے اور نئی نسل کی سرشت سے ان تجربوں کا کیا تعلق ہے؟

نئی نسل کی سرشت کے بارے میں ان دِنوں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور اب تو یہ سرشت ایک عالمگیر مسئلہ بن گئی ہے۔ اربابِ اختیار اندیشہ ہائے دُور ودراز میں مبتلا ہیں۔ علم ودانش کے بزرجمہر ہیں اور بزرگانِ دین وملّت چراغ پا لیکن کوئی تدبیر بن نہیں آتی۔ نئی نسل کی برہمی اور بیزاری ہر روز ایک نئے رنگ میں نمودار ہوتی ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ نئی نسل کی سرشت کا خمیر صنعتی تہذیب سے بنا ہے۔ اس تہذیب کی نعمتوں اور برکتوں سے کون کافر انکار کر سکتا ہے لیکن یہ تہذیب دیارِ مغرب میں رُوحِ عصر کے تقاضے پورے کرنے سے جان بُوجھ کر گریز کر رہی ہے۔ اس گریز کی وجہ سے اس کا داخلی تضاد اور شدید ہوتا جاتا ہے نئی نسل کی حرکتیں اسی تضاد کا ردِّعمل ہیں۔

یہی صنعتی تہذیب اب ہمارے ملک میں بھی فروغ پا رہی ہے اور اس کا اثر ہمارے کردار، مزاج، سوچ کے انداز اور احساس کے تجربوں پر پڑ رہا ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ مغرب کی صنعتی تہذیب ہمارے ملک میں چور دروازے سے آئی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہم اب تک اپنے روایتی فلسفۂ زیست، اقدارِ حیات اور جذبات واحساسات کا رشتہ صنعتی تہذیب سے جوڑ نہیں سکے ہیں۔ ہم اس تہذیب کو اپنانے پر مجبور بھی ہیں مگر یہ تہذیب ہمارے ملک میں جو گُل کھلا رہی ہے اُس پر دل ہی دل میں کُڑھتے رہتے ہیں کیونکہ اس تہذیب کی بدولت ہمارے ذاتی رشتے تک غیر شخصی رشتوں میں بدل گئے ہیں۔ بردہ فروشی کے بازار میں ہر شے خریدی اور بیچی جا رہی ہے اور ساری قدریں روپے آنے پائی کی ترازو میں تلتی ہیں۔ شوہر بیوی کا رشتہ ہو یا والدین اور اولاد کا، بھائی بہن کا رشتہ ہو یا ہمسایوں اور ہم پیشہ لوگوں کا، سب کا انحصار دولت پر ہے۔ دوست بنائے جاتے ہیں تو ذاتی مفاد کے پیشِ نظر، ازدواجی رشتے استوار ہوتے ہیں تو ذاتی منفعت کی خاطر، قرابت داریاں تلاش کی جاتی ہیں تو ذاتی فائدے کے خیال سے۔ مہانوں کی تواضع کی جاتی ہے تو ذاتی مطلب سے۔ حتیٰ کہ فلاحی اور اصلاحی کام کیے جاتے ہیں تو وہ بھی ذاتی نام ونمود کے لیے۔ غرضیکہ ہر طرف نفسا نفسی کا عالم ہے۔ کوئی کسی کا ہمدم اور غمگسار نہیں۔ لوگ بہ ظاہر یگانہ لیکن بہ باطن ایک دوسرے سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں۔

اور جو شہر جتنا بڑا ہے اس بیگانگی کی چھاپ اُس پر اُتنی ہی گہری ہے۔ کراچی اور لاہور جیسے شہروں کا باشندہ تو لاکھوں کے ہجوم میں بھی تنہائی محسوس کرتا ہے۔ یہ تنہائی اس کی تقدیر بنتی جا رہی ہے۔ چائے خانے اور ریستوران آباد ہیں لیکن اُن کو نوازنے والوں کا کوئی ذاتی رشتہ وہاں کے بیروں، خانساموں تک قائم نہیں ہوتا چہ جائیکہ چائے کے باغوں میں کام کرنے والے کھاسیوں سے۔ ڈپارٹمنٹ سٹوروں میں اشیاءِ فروخت کی فراوانی ہے اور کھوے سے کھوا چھلتا ہے لیکن اُن میں کام کرنے والے سیلز مین گاہکوں کے لیے فقط سیلز مین ہیں، انسان نہیں۔ ہم ٹیکسی، موٹر رکشا اور ہوائی جہاز میں دِن رات سفر کرتے ہیں لیکن ہمیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ منزلِ مقصود تک

پہنچانے والا کس قوم، کس نسل، کس خطے کا باشندہ ہے۔ ہم اب دکانوں سے سلے سلائے کپڑے خریدتے ہیں اور لانڈریوں میں اُنھیں دُھلواتے ہیں۔ چنانچہ درزی اور دھوبی سے بھی ہماری راہ ورسم ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ہم سینما دیکھنے جاتے ہیں تو اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے انسان سے بات چیت کرنا بھی خلافِ تہذیب سمجھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ مصنوعات کی سہولتیں جس رفتار سے بڑھتی جاتی ہیں ہمارے رشتے دوسرے انسانوں سے اُسی نسبت سے کم ہوتے جاتے ہیں:

بھرے ہیں جس قدر جام وسبوے خانہ خالی ہے

اور دَور کے حسّی تجربے خواہ نئی نسل کے ہوں یا کشور ناہید کے، صنعتی تہذیب کی اِنھی گم کردہ راہوں سے تشکیل پاتے ہیں۔ آسمان سے نازل نہیں ہوتے۔ ان حسّی تجربوں میں سب سے موذی اور جان لیوا تنہائی کا تجربہ ہے:

میرے اندر کی تنہائی ، میری ذات کا دُہرا پن
دیمک بن کر چاٹ رہا ہے، سب ذاتوں کا ایک ہی رنگ

احساسِ تنہائی کی یہ فضا پُورے ''لب گویا'' پر چھائی ہوئی ہے۔ کشور ناہید دفتر میں کام کرتی ہے۔ دوستوں اور رشتہ داروں سے ملتی ہے۔ شوہر اور بچوں کے ساتھ وقت گزارتی ہے۔ بظاہر اُس کو اکیلے پن کا بالکل احساس نہیں ہونا چاہیے لیکن اس کا کیا علاج کہ اُس کی روح تنہا ہے۔ کشور ناہید اس تنہائی کا اظہار کبھی خالص عورت کی زبان سے کرتی ہے:

آنکھ رکھّو رت جگوں سے آشنا
گود میں سُوں چاٹتی خلوت بھرو

ہماری عُمر کہ ہے بیل عشق پیچاں کی
ڈھلک پڑے گی اگر کوئی آسرا نہ مِلا

کبھی رات کے منظر کے تنہائی کی علامت بنا کر کہتی ہے:

تمام رات منڈیروں پہ چاندنی دہکی
تمام رات کِسی گھر میں رت جگا نہ ملا
تمام رات رہا آندھیوں کا شور مگر
کِسی مکان کی کھڑکی کا در کھُلا نہ ملا

ہے سرِ شام ماہتاب اُداس
کوئی لڑکی کہیں اکیلی ہے

شہر کے سارے دروازے کیوں بند ہیں
خونِ موجِ صبا دے رہا ہے صدا

اور کبھی محبت کے اُن رشتوں کا ذکر کرتی ہے جنھوں نے تنہائی کی شدت اور بڑھا دی ہے:

کریدتا ہے تعلق کی گرم بھُو بھل کو
بدن سے چمٹے ہوئے پیرہن کی آنچ نہ دو

رُوح بھی تشنہ رہے گی ریگِ ساحل کی طرح
جسم بھی شوقِ تعلق میں اُجڑتا جائے گا

لیکن تنہائی تو قربت کے باوجود ممکن ہے۔ اگر دو شخصیتیں ہم آہنگ نہ ہوں یا وہ ایک دوسرے پر غلبے ہی کو محبت تصور کرنے لگیں تو اُن کی قربت بھی دُوری اور تنہائی بن جاتی ہے۔

دِل کی دُوری ہو تو مِلنا بے معنی ہو جاتا ہے
بن جاتی ہے بیچ میں اکثر اِک دیوار ہوا

یہ دل نہ چل سکا کبھی اُڑتی ہوا کے ساتھ
یہ دِل تعلقات کی گہرائی چاہے ہے

مگر شاعر دِل شکستہ نہیں ہے۔ اُس کی شامِ تنہائی میں یادوں کے چراغ جلتے ہیں اور پیار کے پھول مہکتے ہیں:

پھیلی ہے سطحِ ذہن پہ ہلکی سی چاندنی
لپٹے ہیں تیری یاد سے ہم مدتوں کے بعد

وہ شخص رنگ ہے، نکہت ہے روشنی ہے مری
وہ جس کے بعد زمانے میں کچھ بھلا نہ لگے

یاد آئی تو اُجڑی ہوئی راہ میں
پھُول، صہبا، صبا، چاندنی مل گئی

اُس کی یادوں کے اُجالے لے کر
غم کی محراب سجانی سیکھو

پھول سا جسم دہکنے لگا شعلوں کی طرح
دِل تری یاد کو بھی وصل کا ساماں سمجھا

شب کے سُوکھے ہوئے گالوں پر وفا کی سُرخی
شمعِ غم پھر تری یادوں سے بہلنا چاہے

کشور ناہید نے ذات کے دہُرے پن کا ذکر بار بار کیا ہے۔ گو پُورے معاشرے کی منافقت مکر اور ریا ان کے دائرۂ فکر سے خارج ہے۔ لیکن اس معاشرت میں عورت کو اپنی مجلسی اور خلوتی زندگی میں جس جس طرح اپنے باطن پر ظاہر کا پردہ ڈالنا پڑتا ہے۔ کشور ناہید نے اُس کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ اس معاشرے میں جہاں اخلاق کی سب قدریں مرد کی وضع کردہ ہیں،

عورت مرد کی مرضی پر چلنے پر مجبور ہے۔ اُسے مرد کی ہر خوشی اور ناخوشی کو برداشت کرنا پڑتا ہے بلکہ زہر کا پیالہ ہنس ہنس کر پینا پڑتا ہے۔ کشور ناہید نے اُس دُہرے پن کا مطالعہ عورت کی نظر سے کیا ہے اور خوب کیا ہے:

مَیں کہ ہُوں شوخ طبیعت ناہید
کتنے طوفاں مرے اندر ٹھہرے

دیکھ کر جس شخص کو ہنسنا بہت
سر کو اُس کے سامنے ڈھکنا بہت
برف کی مانند جینا عُمر بھر
ریت کی صورت مگر تپنا بہت
خستگی ناہید بن جائے نہ جُرم
کُچھ نہ ہو لیکن بھرم رکھنا بہت

اور حدتو یہ ہے کہ:

ہنستے چہروں کی آنکھوں میں خون جما ہے یادوں
سب شکلیں ہیں حجلۂ حسرت، باراتوں کا ایک ہی رنگ

لاکھ ہو بیزاریٔ خود آگہی
اپنی بربادی میں بھی رنگ بھرو

میرے ہنسنے پر نہ جاؤ دل زدو
میرا چہرہ دیکھ کر رنگت بھرو

محسوس کر چھلکتے ہوئے شوق کی جلن
یخ چاندنی میں جسم کو جلتا ہُوا بھی دیکھ

کشور ناہید کا جذبہ اندروں تصوّف کی اصلاح نہیں ہے اور نہ کوئی ذہنی کیفیت ہے۔ وہ تو عورت کا جذبِ صادق ہے جو بھر پُور اور والہانہ محبت کا قائل ہے۔ اس کی شریعت میں سپردگی ہی عین ایمان ہے۔ اُس کی محویت کا یہ عالم ہے کہ اُس کو دُنیا میں اپنی محبت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا:

مَیں نظر آؤں ہر اک سمت جدھر سے چاہوں
یہ گواہی میں ہر اِک آئینہ گر سے چاہوں
مَیں ترا رنگ ہر اِک مطلعِ در سے چاہوں
مَیں ترا سایہ ہر اِک راہ گزر سے چاہوں
صحبتیں خوب ہیں خوش وقتی غم کی خاطر
کوئی ایسا ہو جسے جان وجگر سے چاہوں
میں بدل ڈالوں وفاؤں کی جنوں سامانی
مَیں اُسے چاہوں تو خود اپنی خبر سے چاہوں

☆

☆ براہِ راست لکھنا ☆

''مجھے لکھنے کا شوق اور جنون اسرائیل کے ناجائز قیام کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ میں نے براہِ راست لکھنے سے گریز کیا سوائے اپنی سوانح حیات کے۔ شروع شروع میں، میں فطرت، محبت اور اپنے اکلاپے کو بیان کرتی رہی۔ پھر اسرائیل کی مسلسل جارحیت میری رگوں میں غصہ بن کر تیرنے لگی۔ میں نے کسی ایسے آزمائشی موقع سے خوفزدہ ہو کر فلسطین چھوڑ کر بھاگ جانا نہیں چاہا۔ میں نے تمام تر مشکلات کے باوجود نابلوس ہی میں قیام رکھا۔ میں نے انتفادہ پر بھی نظمیں لکھیں۔

میں نے زندگی اور شادی کو اسیری کی طرح گزارا۔ پہلے ہی سکول نہ جانے کی بندش دیکھی تھی۔ سوچتی کہ خود کو جلا ڈالوں مگر پھر بعد میں اُٹھنے والی کہانیوں کے خوف سے، میرے اندر سارے ماحول، سب رشتوں سے لاتعلقی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی مگر پھر لکھنے کی قوت نے اس لاتعلقی کی جگہ لے لی۔ حقیقی دنیا سے علیحدہ ہو جانے اور دن میں سپنوں میں کھو جانے کی میری یہ صلاحیت بڑھتی چلی گئی۔ میں ان خوابوں کے طفیل، اپنے زندان کی سلاخیں توڑ کر گلیوں میں گھوم سکتی تھی۔ اَن دیکھے ملکوں کا سفر کر سکتی تھی۔ جہاں اجنبی لوگ تھے جو مجھ سے اور میں ان سے محبت کرتی تھی۔ اپنی ان تصوراتی مسافتوں میں، میں اپنے خاندان کے لوگوں کو منہا کر دیتی تھی کہ خاندان ہی تو وہ زندان تھا جس کے مقفل دروازوں سے میں فرار ہونا چاہتی تھی۔''

فدویٰ طوقان

(۱۹۱۷ء تا ۲۰۰۳ء)

۔ باقی ماندہ خواب سے منتخبہ ۔

''مہندی لگے ہاتھ''

مختار صدیقی

(●)

دو آنکھیں تو خُدا نے دی ہیں۔ یہ دیکھنے کی آنکھیں ہیں۔ جو ظاہری ہیں۔لیکن پرکھ اور جانچ کا راستہ بنانا، انسان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔اس راستے پر چلنے کے لیے،ایک تیسری آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے جو ذہن انسانی کی بصیرت کہلاتی ہے۔

اس تیسری آنکھ سے دیکھو تو شعروں کے اس ہجوم میں پہلا رنگ گوشت پوشت کا ہے۔ کیونکہ ''میں'' کا رنگ ایسا ہی ہوتا ہے۔اس کے بعد رنگوں میں کہیں ہلکے اور کہیں گہرے پن کی تجلیاں ہیں۔ کیونکہ ''میں'' کے رنگ کے بعد ''احساس''،''شعور'' اور وجدان کا رنگ ہے، پھر دُلار اور مٹھاس کے نورانی مرغولے ہیں، کیونکہ یہ عورت، ماں، ساتھی اور اس شاعرہ کے رنگ میں جو کہتی ہے:

مَیں شاعرہ نہ رہوں، مشتِ خاک رہ جاؤں
مرا حریف اگر جذبِ اندروں نہ رہے

کشور ناہید کی شاعری، شیشے کے ہزار رنگ ٹکڑوں کی طرح ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ ٹکڑے کتنے ہیں اور کیوں ہیں۔ کیونکہ سانسوں اور تجربوں کی ہر گھڑی میں یہ ٹکڑے بڑھتے رہتے ہیں، جڑتے رہتے ہیں اور پھر ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں اور اس طرح تعلق کی پرچھائیاں بڑھتی اور گھٹتی رہتی ہیں۔

ہر طلب ، ذِلّت خودداری تھی
تم نہ تھے ساتھ، یہ اچھا ہی ہوا

کچھ اُس قدر تھی گرمیٔ بازارِ آرزو
دِل جو خریدتا تھا اُسے دیکھتا نہ تھا

دلچسپ بات یہ ہے کہ شاعری کے لیے محرومی ضروری ہے۔ کہیں یہ محرومی دل کی اس بے چینی کا نام ہے جسے شوق کا پردہ کہا جاتا ہے۔ کہیں ناصبوری اور کہیں سیدھے سبھاؤ۔ یہی وہ بات تھی جس نے کشور ناہید کو خود سوختگی کی رمز بنا دیا۔ یہ رمز اس نے خود ہی وضع کی۔ خود اسے سیکھا اور اپنے اشعار میں اس کے پیکر سجائے۔

رمزِ خود سوختی ، بے طلبی
ہر گلِ تر کی زبانی سیکھو

تخلیق کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس سے کرب بھی آسودہ ہوتا ہے۔ کشور ناہید کے یہاں تخلیق کا کرب لفظوں میں آسودہ ضرور ہے لیکن اس کی روح کو یا اس کے جذبات کو اس سے کوئی تسکین نہیں ملتی ہے:

رُوح بھی تشنہ رہے گی ریگِ ساحل کی طرح
جسم بھی شوقِ تعلق میں اُجڑتا جائے گا

بحر اور وزن کے ہزار رنگ نقابوں میں، آپ کو کھُلتی چھپتی شخصیت نظر آئے گی۔ اس کی سب سے اہم چیز ''میں'' ہے۔ کشور ناہید یہ سمجھتی ہے کہ کائنات اس کے لیے بنائی گئی ہے۔ اس سمجھ ہی سے اس میں وہ بات پیدا ہوئی ہے جسے روشنیٔ طبع کہیں گے۔ اس کا منبع بھی وہ خود ہے اور معراج بھی، چنانچہ اس کی گواہی یہ ہے

مَیں نظر آؤں ہر اِک سمت جدھر سے چاہوں
یہ گواہی میں ہر اِک آئینہ گر سے چاہوں

جب میں نہ ہوں تو شہر میں مجھ سا کوئی تو ہو
دیوارِ زندگی میں دریچہ کوئی تو ہو

کشور ناہید کو اپنے عورت پن کے شدید احساس کے ساتھ یہ بھی خیال ہے کہ میں تخلیق کی شخصیتوں کا خزینہ ہوں اور مجھے ہی کبھی کارکن، کبھی کارکشا اور کبھی کارساز یعنی بیٹی، بہن اور بیوی کی ذمہ داریوں کو گلے لگانا ہوتا ہے۔ اسی لیے ان آنکھوں میں ہر ساعت، نئی نئی زیست کو شہادت نصیب ہوتی ہے۔ کبھی بچے کا دمکتا چہرہ، ہر رگِ گُل میں دکھائی دیتا ہے، تو کبھی گھر کے دھندے نمٹتے نہیں، تو کبھی بھائی کا پردیس سدھارنا قیامت بن جاتا ہے۔ یہاں خودی کا ہر پہلو خُدا ہے اور خدا کی خدائی میں کچھ نہیں، اس دُنیا کا درد، اذیت ہی سے عبارت نہیں، اس میں جو لذّت اور سرمستی ملتی ہے، وہ کسی اور طرح ممکن نہیں۔ یہاں ہار اور جیت کچھ مطلب نہیں رکھتے ہیں، کبھی سپردگی کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ سب کچھ لے لیا، اور کبھی سب کچھ لے کر بھی یہ مطلب ہوتا ہے کہ زندگی اور اس کا جو ہر ہار دیا۔ اسی لیے کشور ناہید کی شاعری میں کئی چیزیں پُرانی ہونے کے باوصف، نئی طرزِ ادا، اور لہجے کے باعث اردو شاعری میں اضافہ معلوم ہوتی ہیں۔

دیکھ کر جس شخص کو ہنسنا بہت
سر کو اس کے سامنے ڈھکنا بہت

دل میں ہے ملاقات کی خواہش کی دَبی آگ
مہندی لگے ہاتھوں کو چھپا کر کہاں رکھوں

لبِ گویا میں کشور ناہید کی غزلیں اور دوہے شامل ہیں۔ وہ نظم بھی کہتی ہیں لیکن نظم کا حصہ اس مجموعے میں شاید وحدتِ تاثر رکھنے کے باعث، شامل نہیں کیا گیا ہے۔ لبِ گویا کی تمام غزلیں، دورِ جدید میں غزل کی بدلتی ہوئی شکل کی آئینہ دار ہیں۔

''نئے زمانے کی برہن''

انتظارحسین
(لاہور)

شاعری پر قلم اٹھاتے ہوئے میں جھجکتا ہوں۔سوچا کہ شخصیت پر لکھتے ہیں۔مگر جب قلم اُٹھایا تو اچانک خیال آیا کہ لکھنے والی عورت ہے۔عورت بھی کون سی کشور ناہید۔سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالنا چاہیے۔اسی جھجک میں واپس شاعری کی طرف ہولیا۔اب میں جتنا ''ملامتوں کے درمیان'' کو پڑھتا جاتا ہوں اُردو شاعری سے دور ہوتا جاتا ہوں یہ تو مجھے ہندی شاعری کی کتاب لگتی ہے اردو شاعری کی روایت سے تو اس کا کوئی علاقہ نظر نہیں آیا۔

اس کے ساتھ مجھے اپنے وہ نقّاد یاد آتے ہیں جنھوں نے اردو شاعری اور ہندی شاعری کا موازنہ کر رکھا ہے۔ہر ایسے موازنے میں یہ بات بہت فاتحانہ انداز میں کہی گئی کہ ہندی کے گیتوں میں اظہارِعشق عورت کی طرف سے ہوتا ہے جو غیر فطری بات ہے جب کہ غزل میں اظہارِعشق مرد کی طرف سے ہوتا ہے ان نقّادوں نے ہمیشہ یہ داؤں مار کر ہندی شاعری کو چت کر دیا۔

واقعہ کے طور پر یہ بات غلط نہیں ہے۔غزل کی روایت مردانہ روایت ہے،مرد کے جذبے کے اظہار کی روایت اس میں ہجر کا مارا عاشق تو بہت نظر آتا ہے مگر دُکھیا برہن کہیں دکھائی نہیں دیتی۔اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ غزل کی گاڑی اب تک ایک پہیّے پہ چلتی رہی ہے۔

اُردو ادب میں دوسرا پہیہ فکشن کے راستے سے داخل ہوا۔اُردو افسانے میں باغی عورت کی آواز جانی بوجھی چیز ہے۔شاعری میں اب کہیں آ کر یہ آواز سنائی دی ہے۔مگر کشور ناہید کی شاعری میں جو آواز سنائی دیتی ہے۔وہ کس قسم کی آواز ہے۔صحیح کہ اس واسطے سے اُردو شاعری میں عورت کی آواز سنائی دی۔مگر برہن کی آواز سے اس کا کیا ناتا ہے۔وہاں تو دُور کا نوحہ تھا۔قرب کے لیے تڑپ۔ اسی سے برہہ کے گیت پیدا ہوئے۔مگر یہاں صورتِ حال الٹ ہے:

مگر جیتے جی
ایک ہی گھر اور ایک ہی چھت کے تلے
عمر بھر کی خاموشی
کس کی تکریم کی نشانی بنتی ہے
ماچس کی تیلیوں کی طرح
آتش گیر مادے کے باوصف
آپس میں بے چُوں وچرا منسلک
بقائے باہمی،کولڈ وار،ڈپلومیسی

لیجیے دوری ختم ہوگئی۔فاصلے سمٹ گئے۔مگر:

میرے تمہارے درمیان لاتعلقی کا جنگل
پھیلتا جارہا ہے

برہہ کی جگہ لاتعلقی نے لے لی۔دُکھ موجود رہا۔اس کی شکل بدل گئی۔ایک دوری ختم ہوئی تو دوسری دُوری پیدا ہوگئی۔یہ دُوری زیادہ بھیانک ہے۔اس دُوری میں ایک دوسرے سے دُور تھے مگر دِل قریب تھے۔اب یوں قرب ہے مگر دلوں میں دُوری پیدا ہو چکی ہے۔لاتعلقی کا جنگل درمیان میں بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔یہ ایک نئی طرح کا برہہ ہے۔

دو بستر
ایک ہی کمرے ایک ہی چھت کے سائے میں
ایک پہ بہتا نیند کا ساگر۔۔۔ایک پہ بے خوابی کا صحرا

یہ برہہ کیسے پیدا ہوا۔مرد تو وہی ہے۔شاید عورت بدل گئی ہے۔وہ عورت جو بنتی کرتی تھی کہ:

موہے جا کر را کھوجی

کتنی معصوم عورت تھی۔صحیح کہ جس مرد سے بنتی کی گئی ہے وہ اس کے لیے خدا ہے۔مگر اس تہذیب میں تو عورت کا اپنے مجازی خدا کے ساتھ بھی یہ ہی رویہ تھا۔وہ پتی کو اوتار اور اوتار کو پتی جانتی تھی۔سو اوتار پوجا کے ساتھ ساتھ پتی پُوجا بھی ہوتی تھی۔مگر پتی پُوجا اب ممکن نہیں ہے کہ عورت معصوم نہیں رہی۔وہ چاتر ہوگئی ہے۔اسے بہت سی باتوں کا پتہ چل گیا ہے:

تو کہ جس کی منکوحہ ہے
ایک بدن کے چالیس چہرے

تو اب مجھے اپنے پچھلے بیان میں تھوڑی تصحیح کر لینی چاہیے۔ ملامتوں کے درمیان،کو میں نے ہندی شاعری کی کتاب یُوں جانا تھا کہ مجھے اس شاعری میں پائے جانے والی عورت پر برہن کا شبہ ہوا تھا اب غور کرتا ہوں تو یہ برہن کچھ اور طرح کی برہن نظر آتی ہے یہ عورت ہندی گیتوں کی سادہ و معصوم عورت نہیں ہے۔ہمارے نئے زمانے کی عقل مند عورت ہے۔معصومیت کے اپنے دُکھ ہیں۔عقلمندی کی اپنی پریشانیاں ہیں۔افسوس کہ اُردو شاعری برہن کے سادہ و معصوم درد سے نا آشنا رہی۔اس کے نصیب میں آج کے زمانے کی عقل مند منکوحہ عورت کی پریشانیاں لکھی گئی تھیں۔یہ شاعری عشق کی گرم جنگ کی رزمیہ نہیں ہے۔ازدواجی زندگی کی کولڈ وار کی دستاویز ہے۔شاید اس سے یہ شک پیدا ہو کہ میں ان نظموں غزلوں میں کسی آپ بیتی کا کھوج لگانے کی نیت رکھتا ہوں۔ہرگز نہیں۔نئے زمانے کی عقل مند عورت آپ بیتی نہیں لکھ سکتی۔اسے جگ بیتی لکھنے کی پریشانی لاحق رہتی ہے۔

میں اکیلی تو نہیں
میرے اندر کئی عورتیں قید ہیں

کئی عورتیں تو انکساری سے کہا گیا۔کشور ناہید تیسری دُنیا کی سب عورتوں کے دُکھوں اور پریشانیوں کو سمیٹنے کے لیے کوشاں نظر آتی ہے۔

خیر تیسری دنیا کی حد تک کشور کا کرب میری سمجھ میں آتا ہے مگر یشودھا،نور جہاں، ممتاز محل کی ذمہ داریاں اپنے سر لینے کی اس بی بی کو کیا ضرورت تھی۔یہ عورتیں تو اپنے اپنے حال میں مگن تھیں۔

آپ بیتی بھی یہیں کہیں ہونی تو چاہیے۔آخر لکھنے والا لکھتے وقت اپنے نجی تجربوں کو پوٹلی بنا کر الگ تو نہیں رکھ دیتا۔مگر دقت یہ ہے کہ درمیان میں تیسری دُنیا آ کھڑی ہوئی ہے اور نیا شعور حائل ہو گیا ہے۔یُوں اس پر پردے پڑ گئے ہیں۔

چلو کسی طرح بھی سہی ہماری شاعری میں عورت کی آواز تو سنائی دی اور خاص طور پر غزل میں۔اس صنف کی مردانہ روایت میں ایک دراڑ تو پڑی۔رقیب کا احوال سُنتے سُنتے ہم تھک گئے تھے۔کشور ناہید کے آنے سے یہ ہوا کہ اب غزل میں سوکن کا ذکر بھی شروع ہو گیا ہے۔

وقفہ شاید تصنیف و تالیف میں بھی ضروری ہوتا ہو مگر کشور ناہید اسے ضروری نہیں جانتیں۔انھوں نے ہمارے آپ کے دیکھتے دیکھتے مضامین نو کے انبار لگا ڈالے ہیں۔اس کا خوشگوار پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی روانی کا سارا بوجھ اپنی شاعری پر نہیں ڈالا ہے۔اپنی شاعری کو تو وہ سستانے کا موقعہ دیتی ہیں۔مگر اپنے قاری کو وہ یہ سہولت فراہم نہیں کرتیں جب ان کی شاعری کی کتاب شائع نہیں ہوتی تو پھر ان کے ترجمے شائع ہوتے ہیں یعنی جو ارمان شاعری میں نہیں نکل سکتے وہ یہاں آ کر پورے ہوتے ہیں۔انہی دنوں ان کی آگے پیچھے تین کتابیں آئی ہیں سمون دبوار کی ’’سیکنڈ سیکس‘‘ کا ترجمہ اور تلخیص ’’باقی ماندہ خواب‘‘ لیلیٰ خالد کی آپ بیتی۔

سمون دبوار نے کچھ اچھے بھلے ناول بھی لکھے ہیں۔لیکن ہمارے یہاں وہ ایک ناول نگار سے زیادہ سارتر کی رفیقہ کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔پھر ان کی ایک کتاب نے بھی بہت شہرت پائی جو عورت کے معاملات کے بارے میں لکھی گئی سیکنڈ سیکس کشور ناہید کی ہمت ہے کہ اس نے اس کتاب پر ہاتھ ڈالا اور کمال بے تکلفی کے ساتھ۔یہ الگ بات ہے کہ اپنے حساب سے انھوں نے اس کتاب میں قطع و برید کر لی۔زیر نظر صورت میں ان کا ترجمہ سمون دبوار کی کتاب کا من وعن ترجمہ نہیں ہے کتاب کا ایک حصہ انہوں نے ترجمہ و تلخیص کے لیے چنا۔تلخیص اس طرح کی کہ اس میں مقامی رنگ شامل کر دیا۔سمون دبوار کے پیش نظر مغربی معاشرے کی عورت تھی۔کشور نے اپنے یہاں کی عورت کی مثالیں اس میں شامل کر دیں۔اس لیے کتاب میں یہاں کے قاری کے لیے ایک کشش پیدا ہو گئی۔مگر فرق صرف یہ ہے کہ سمون دبوار اور کشور ناہید گڈ مڈ ہو گئیں۔مختلف مقامات پر رُک کر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ یہ سمون دبوار بول رہی ہے یا کشور ناہید!

’’باقی ماندہ خواب‘‘ دوسری قسم کی کتاب ہے۔یہاں کشور ناہید نے ایک پُوری محفل سجائی ہے اور کیا کیا آدم جمع کیا ہے۔کوئی مغرب کا کوئی مشرق کا۔ مغرب کے زیادہ، مشرق کا اِکا دُکا! ژید، سارتر، اسکو کامیو، مالرو، لارنس، ایلیٹ، پاؤنڈ اور بورخس وغیرہ وغیرہ!

مگر یہ بزرگ کیوں جمع کیے گئے ہیں یہ تعین کرنا ذرا مشکل ہے۔

مجھے اصل میں اس کتاب کو پڑھتے ہوئے لاہور کی ایک ادبی محفل یاد آ گئی۔بیگم حجاب امتیاز علی نے ایک ماہانہ محفل کی داغ بیل ڈالی تھی جس کا نام تھا من وسلویٰ۔اس محفل کا طریقہ یہ تھا کہ اس کے شرکاء گنتی کے ہوتے تھے۔ہر شریک ایک ڈش لے کر آتا تھا۔اس طرح ایک رنگا رنگ دسترخوان ترتیب پاتا تھا۔اور چٹورے ایک وقت میں بہت سی ہنڈیوں کے ذائقے چکھ لیتے تھے۔کشور ناہید نے بھی بس من وسلویٰ کی محفل سجائی ہے۔مختلف نامی گرامی ادیبوں کو اپنی اپنی ڈش لانے کی زحمت دی گئی ہے۔پڑھنے والا ایک وقت میں کتنی ہنڈیوں کا پکّا چکھ لیتا ہے اور کتنے مصنفوں کی بانگی دیکھ لیتا ہے۔

کشور ناہید نے یہاں کسی کو موضوع کا پابند نہیں کیا ہے یا کہہ لیجیے کہ اپنے اوپر ایسی پابندی نہیں لگائی ہے جس ادیب کی جو تحریر انہیں بھا گئی اسے اپنی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور اس مجموعہ میں شامل کر لیا۔

انتخاب خوب ہے۔مگر ترجمہ میں ہم جا بجا اٹک بھی جاتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ کشور ناہید تو شاعرہ ہیں۔اب ان ترجموں کے واسطے سے انھیں نثر کے میدان میں اترنا پڑا ہے ان کا اشہب قلم اس میدان میں بھی دوڑتا تو خوب ہے مگر پٹخنی بھی خوب کھاتا ہے۔شاعری کے اپنے نشیب و فراز ہوتے ہیں اور نثر کے اپنے نشیب و فراز ہوتے ہیں۔ان نشیب و فراز سے آشنائی ہوتے ہوتے ہوگی۔

بہر حال ایسی تحریروں کا اُردو میں منتقل ہونا ایک اہمیت رکھتا ہے اور اس کتاب کا شائع ہونا ایک واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کتاب کو یوں بھی دیکھیے کہ تنقیدی نگارشات کے اس مجموعہ میں سکہ بند نقاد شامل نہیں ہیں۔یہ ایسے لکھنے والوں کی تحریریں ہیں جو پروفیسر اور نقاد نہیں ہیں بلکہ تخلیقی کام کرنے والے ہیں۔شاعر، ناول نگار، ڈرامہ نگار، تخلیقی عمل کے بارے میں ادب و شعر کی ماہیت کے بارے میں، اپنے بارے میں، کسی بھی مسئلہ کے بارے میں ان کا قلم اٹھا ہے اور بامعنی تحریر وجود میں آئی ہے۔پیشہ ور نقادوں کی تحریروں سے زیادہ بامعنی تحریر اور یہ زیادہ بامعنی اس وجہ سے ہیں کہ تخلیقی کام کرنے والا تو اپنے تجربے کے واسطے سے بات کرتا ہے۔وہ خود اس عمل سے گزر رہا ہوتا ہے اس لیے اس کا بیان ایک پروفیسر یا ایک پیشہ ور نقاد کے مقابلہ میں جو اس عمل سے گزر راہی نہیں ہے۔زیادہ بامعنی اور زیادہ جاندار ہوتا ہے۔

مگر پھر بھی ہمارے یہاں کیوں تخلیقی کام کرنے والا تخلیقی مسائل کے بارے میں خاموش رہتا ہے ان مسائل پر بولنے بات کرنے کی ذمہ داری صرف نقاد کی سمجھی جاتی ہے اور نقاد ہی کے بیانات کو معتبر سمجھا جاتا ہے۔کیا ہمارے یہاں شاعر اور افسانہ نگار ان مسائل کی شدبد نہیں رکھتے یا نقادوں نے ان میں احساس کمتری پیدا کر دیا ہے۔

''علاج حرف شناس''

سلیم احمد

(۵)

کشور ناہید کی شاعری میں نے بہت کم پڑھی ہے۔ بات یہ ہے کہ کشور کی شخصیت مجھے اپنے بارے میں اتنا کچھ بتا دیتی ہے کہ میں اس کی شاعری سے مایوس ہو جاتا ہوں۔ دراصل میرے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا ہے کہ کشور اپنی شخصیت اور اپنی زندگی کا اپنی شاعری میں اظہار کر ہی نہیں سکتی اس وجہ سے نہیں کہ اسے شاعرانہ قدرت حاصل نہیں ہے۔ بلکہ صرف اس وجہ سے کہ ہمارا ماحول ابھی کشور جیسی عورتوں کی سچائیوں کو قبول کرنے کے قابل نہیں بنا۔ میں نے کچھ مشاعروں میں اس کی جو غزلیں سُنیں یا کبھی کبھار رسالوں میں پڑھیں ان میں وہ مجھے بڑی بے ضرر سی عورت نظر آئی اب بے ضرر عورت کو دیکھنا ہو تو پروین فنا سیّد کیا بُری ہے، بلکہ پروین شاکر کے بارے میں بھی میں یہی کہوں گا کہ کاش اس کی رومانیت اتنی زیادہ قابل قبول نہ ہوتی۔ کشور بھی اپنی غزلوں میں ذرا سوشل ایڈجسٹمنٹ کرتی نظر آتی ہے۔ اور مُنہ بھر کر بات کرتے ہوئے ڈرتی ہے۔ بہرحال ''ملامتوں کے درمیان'' کی شاعری پڑھ کر مجھے اتنا اطمینان ضرور ہوا کہ کشور البتہ اپنے رنگ کو چھپانے کی خواہش سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ کتاب کا نام بھی یہ بتا رہا ہے کہ اب وہ معاشرہ سے دو چار ہاتھ کرنے کے لیے تیار ہو رہی ہے۔

ملامتوں کے درمیان کی غزلوں نے تو مجھے کچھ زیادہ متاثر نہیں کیا۔ ان میں تو وہ کچھ کہنے سے زیادہ کچھ نہ کہنے کی کوشش میں مبتلا رہتی ہے۔ لیکن اس کتاب میں اس کی نثری نظمیں کمال کی ہیں ان میں کشور ناہید کا سچا تجربہ اس زور سے بولا ہے کہ مجھے اس صنف میں کشور کے سوا اور کسی کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ بات یہ ہے کہ رومانیت بگھارنی ہے۔ یا نوجوانی کے کچّے پکّے جذبات لکھنے ہیں تو اس کے لیے نثری نظم کا تکلف کیا ضرور۔ یہ کام تو اب اتنا آسان ہے کہ اب اسے لونڈے بھی ردیف قافیے کی پابندیوں کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ کشور کی نثری نظمیں ایک بھری پُری عورت کے جذبات کا اظہار ہیں۔ یاد رکھیے میں نے عورت کہا ہے لڑکی یا دوشیزہ نہیں کہا ان لڑکیوں اور دوشیزاؤں سے میں اتنا تنگ ہوں کہ مجھے تو کشور کی نثری نظمیں ایک نعمتِ غیر مترقبہ معلوم ہوئیں۔ ورنہ وہ بیچاریاں تو صرف ضرورتِ رشتہ کا اشتہار رہتی ہیں۔

کشور کی نظموں کے تجربات میں وسعت بھی ہے۔ اور تنوع بھی۔ پھر وہ بہت نقوش کو ملا کر ایک نقش بنانا چاہتی ہے۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے تجربات مل کر ایک کل بن جاتے ہیں اور آخر میں نتیجہ وحدتِ تاثر کی صورت میں نکلتا ہے آپ اگر سنجیدہ شخصیت کے مالک ہیں تو کشور ناہید کی شاعری آپ کو بہت کچھ مطمئن کر سکتی ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ آپ کی شخصیت اکہری ہے تو کشور آپ کو مار کر چھوڑ دے گی۔ بلکہ چھوڑ کہاں دے گی۔ اور زیادہ مارے گی۔ جتنا آپ کو اس عورت سے ڈرنا چاہیے۔ جو اپنے اندر کے وحشی کو تنگ قمیصوں، کسے ہوئے بلاؤزوں اور ہائی نیک کے سوئٹروں سے آزاد کرنا چاہتی ہو۔

ایک بات میں آپ سے کہتا ہوں یہ بات نہیں ہے کہ میں کشور کی شاعری ہی کے تجربات کی مدّاحی کر رہا ہوں یہ تجربات اگر صرف تجربات ہوتے تو مجھے ان سے اتنی زیادہ دلچسپی نہ ہوتی۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ ان میں شاعری بھی بڑے زوروں کی ہے۔ شاعری سے میری مراد صرف خوبصورت لفظ جمع کرنا نہیں یہ کام تو دوسرے بھی کر لیں گے۔ کشور کی فنکاری میں اصل چیز اس کا اپنے تجربات کے اظہار پر کنٹرول ہے۔ جذباتیت خود رحمی اور جھنجھلاہٹ کے بغیر وہ ایسی باتیں کہہ سکتی ہے جو آپ کو چونکا ئیں بھی اور اداس بھی کر دیں۔ محبت، جنس، سیاست، معاشرہ کی پابندیاں اور ملامتیں جھوٹ اور منافقت کے خلاف احتجاج اس سارے مواد کو کشور نے شاعری بنا دیا ہے کشور کی یہ نظمیں پڑھ کر میں یہ بات بہت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اب اردو شاعری کسی عورت کو سہارنے کے قابل بن رہی ہے۔

کشور ناہید نے مادام سمون دبوار کی شہرۂ آفاق کتاب سیکنڈ سیکس کا عورت کے نام سے اُردو میں ترجمہ کر دیا ہے یہ کتاب میں نے پہلی بار جب پڑھی تھی۔ اب مجھے وہ تمام باتیں یاد تو نہیں رہیں۔ جن سے اس وقت متاثر ہوا تھا۔ مگر وہ تھرل ابھی تک یاد ہے جو مجھے اس کتاب کو پہلی بار پڑھنے سے محسوس ہوا تھا۔ یقیناً عہدِ جدید میں عورت اس کے مسائل کو سمجھنے کی جو وقیع ترین کوششیں ہوئی ہیں یہ کتاب ان میں ایک نمایاں اور اہم مقام رکھتی ہے۔ جہاں تک ہمارے ماحول کا تعلق ہے اس میں شاید یہ کتاب پسندیدہ نہ سمجھی جائے۔ کیوں کہ ہم عورتوں کو بیچ سکتے ہیں۔ اغوا کر سکتے ہیں۔ کلہاڑیوں سے قتل کر سکتے ہیں۔ مگر اسے سمجھنا نہیں چاہتے۔ یہ تو مغرب ہی کی رُوح ہے کہ زندگی کی ہر حیثیت کو دیکھنا چاہتی ہے اور اس کی تہوں میں اُتر کر اسے سمجھنا چاہتی ہے۔

کشور ناہید اس کتاب کے ترجمہ کے لیے بہت موزوں خاتون ہیں۔ صرف اس لحاظ سے نہیں کہ وہ ایک لکھنے والی شخصیت سے اس ذمہ داری کو نبھا سکتی ہیں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ جدید عورت جن مسائل سے دو چار ہے اور اپنے جس مقام کے حصول کے لیے کوشاں ہے کشور ناہید اس جدوجہد کا ایک حصہ ہیں۔ میرے خیال میں اپنے طرزِ زندگی کی حفاظت کے لیے کشور ناہید نے جتنے مصائب جھیلے ہیں اور جتنی قربانیاں دی ہیں وہ کسی اور عورت نے نہیں دیں مجھے اس طرز زندگی سے اختلاف ہے۔ اور میں ''جدید عورت'' کو ہزار طرح کی لعن طعن کرتا رہتا ہوں مگر اس اختلاف کے باوجود میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ''جدید عورت'' خود عورت نے ایجاد نہیں کی ہے۔ وہ ہمارے بے شمار تہذیبی،

باقی صفحہ نمبر ۶۸ پر ملاحظہ کیجیے

''ہر سانس میں نئی زندگی''

شمیم حنفی
(دہلی، بھارت)

کشور ناہید کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے یہاں میں اپنی ایک مجبوری کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔لفظوں کی کوئی ترتیب مجھ تک چاہے علوم وافکار کے حوالے سے پہنچے یا شعر اور کہانی کے حوالے سے، میری نگاہ سب سے پہلے اس ترتیب میں چھپے ہوئے کسی چہرے کو تلاش کرتی ہے۔ یہ چہرہ اچھا یا بُرا، خوبصورت یا بدصورت، اشتعال انگیز یا سکون بخش، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں اس پر پہلے سے نہ تو کوئی حکم لگاتا ہوں نہ اسے اپنی ترجیحات کا پابند بناتا ہوں۔ مجھے غرض اب اس بات سے ہوتی ہے کہ حواس اور آنکھوں کا واسطہ لفظوں کی جس ترتیب سے پڑا ہے اس کا کوئی چہرہ بھی ہے یا نہیں۔اس چہرے کے نقوش متعین ہوں یا مبہم، اس سے بہت زیادہ فرق نہیں پڑتا کیوں کہ اس تعین یا ابہام کی معنویت کا مسئلہ بعد میں پیدا ہوتا ہے، اس وقت جب میں اس کے تجزیے کی طلب سے دوچار ہوتا ہوں۔ بارہا ایسا ہوا کہ تجزیے کی اس طلب تک رسائی کے بغیر ہی یہ چہرہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور ایک طرح کے احساسِ زیاں نے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔ ایسے موقعوں پر مجھے ایک بے نام سی خفت اور خجالت کا تجربہ ہوتا ہے۔اور اس سے چھٹکارا پانے کے لیے لفظوں کی کسی اور ترتیب کی تلاش۔ ادب سے پیشہ ورانہ دلچسپی پڑھنے والے کو اس عذاب سے محفوظ رکھتی ہے۔ وہ بڑی سہولت کے ساتھ اپنے آزمائے ہوئے نسخوں کی مدد سے کسی بھی لسانی ترتیب کی تفہیم و تجزیے کے عمل سے گزرتا ہے۔ اور ان نتائج تک جا پہنچتا ہے جو اس نے پہلے ہی سے اپنے ذہن میں مقرر کر رکھے تھے۔ کشور ناہید سے اولین تعارف کے ساتھ ہی معاملہ مختلف نکلا۔ وہاں تو ہر شعر میں ایک مانوس آہٹ سنائی دیتی تھی اور ہر لفظ کے روزن سے جھانکتا ہوا، کچھ کہتا ہوا اور سوچتا ہوا ایک چہرہ۔اب اس تعارف کو کم سے کم بیس برس گزر چکے ہیں۔ رفاقت کا قصہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ ایک چھوٹی سی واردات بھی جب علامت بنتی ہے تو اس کا جغرافیہ اچانک تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کی حدوں میں کبھی کسی آبادی کے نشان دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی کسی خرابے کی خبر ملتی ہے۔ گویا کہ تعینات کی سرزمین سے ایک ایسی کائنات کا ظہور ہوتا ہے جو اپنی حدوں سے ماورا ہے۔ اس طرح چہرے بالآخر کسی خیال کا روپ دھارن کر لیتے ہیں۔ یہ خیال مسلسل تعاقب میں مصروف دکھائی دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ہماری اپنی ہستی کا حصہ بن جاتا ہے جسے ہم چاہیں بھی تو اپنے آپ سے الگ نہیں کر سکتے۔ کبھی ہماری اپنی ہستی اس تجربے کی گواہ بنتی ہے، کبھی ہمارے اطراف پھیلی ہوئی وہ زندگی جس کی مٹی اور ملبے سے ہماری ہستی کا خمیر اُٹھا ہے۔

اس اعتبار سے کشور ناہید کی شاعری محض ایک متعین چہرے کی تصویر نہیں، ایک ذہنی، جذباتی اور معاشرتی واردات بھی ہے۔ یہ چہرہ سوالوں کے جس سلسلے کا قیدی ہے اس کے رابطے ہم سے ایک ساتھ کئی سطحوں پر قائم ہوتے ہیں۔ چنانچہ کشور ناہید سے ہم کلامی کا تجربہ ایک مکمل تجربہ بنتا ہے، تخلیقی، جمالیاتی، لسانی، ذہنی، تہذیبی اور تاریخی تناظر کی حد بندیوں سے یکسر آزاد اور بیک وقت ان سب کا احاطہ کرتا ہوا۔ خیال کی تجسیم یا کسی جیتے جاگتے، متحرک اور فعّال پیکر کی تجرید کے مسائل یہاں بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اس تجربے کی کلیت ہمیں اپنی بصیرت کے ادھورے پن کا شکار نہیں رہنے دیتی اور ہم سے ایک نئی بوطیقا کی طلب گار ہوتی ہے، کبھی ایک چیلنج کی صورت، کبھی ایک ناگزیر فکری ضرورت کے طور پر۔ چاروناچار ہمیں اپنے حصار سے باہر آنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تجربے میں ہم تسکین کے ساتھ اضطراب اور آسودگی کے ساتھ خرابی اور سرفروشی کے ساتھ اور اسی کی ایک مستقل کیفیت کا سامنا بھی کرتے ہیں۔ ہماری شناسائی ایک چہرے سے بھی ہوتی ہے اور خیال کی ایک لہر سے بھی یعنی کہ ایک مخصوص منظر ذہنی اور جذباتی رویّوں کا ایک موسم بن جاتا ہے جو سطحی اور بیرونی تبدیلیوں کے باوجود ایک تسلسل کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔

اصل میں ہر انسان اور ہر عہد کی پہچان اس کے سوالوں سے ہوتی ہے یا اس بات سے کہ جواب کی جستجو میں ان سوالوں کی سمت کیا طے پاتی ہے۔ اسی مرحلے پر یہ مسئلہ بھی درپیش ہوتا کہ ان سوالوں کی قدر و قیمت یا معنویت کا کیا اور کیسا تصور ہم تشکیل دے سکتے ہیں اور ہماری ذہنی اور طبعی کائنات میں اس تصور کی حیثیت کیا ہے؟ اس تصور کے انسانی سروکار کی تجدید اور تجزیے کے بغیر ہم نہ تو اپنے وجود پر اس تصور کا اطلاق کر سکتے ہیں اور نہ اس چہرے سے جو اس تصور کا معمار ہے، اپنی شناسائی کا بھرم قائم رکھ سکتے ہیں۔ کشور ناہید کی شاعری جن سوالوں کا مرکب ہے ان کی بساط ہمارا حال ہے اور ان کا سرا وقت کے جس دوسرے منطقے سے جڑا ہوا ہے اس کی حیثیت ایک امکان یا آئندہ کی ہے۔ اس طرح یہ شاعری معاصر عہد کے مقبول اور مروج شعری ضابطوں کے برعکس محض ایک مخصوص انسانی صورتِ حال کی عکاس نہیں ہے۔ حاضر کے حوالے اس شاعری کے محرک کا رول نبھاتے ہیں اور تاریخ کے اس عمل کی نشاندہی کرتے ہیں جو کشور ناہید اور اس کے ہم عصروں میں ایک نوع کی ذہنی رفاقت کا سبب بنا ہے۔ اگر بات یہیں تک رہتی تو ہم کشور کی شاعری کو بھی اس عہد کے عام محاورے کا حصہ سمجھ کر اس کی تفہیم میں رائج الوقت فنی اور شعری ضابطوں پر قانع ہو جاتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ کشور کے لہجے اور صیغۂ اظہار کی انفرادیت اس شاعری کا شناس نامہ بن جاتا۔ مگر یہ شاعری خالص ادبی معیاروں کی گرفت سے آزاد ایک ایسا ذہنی اور تخلیقی مظہر ہے جو اپنی شناخت کے لیے ہمیں بنائے ادبی معیاروں کی توسیع اور بعض اوقات تنسیخ پر مجبور کرتی ہے۔ اس شاعری کی کچھ اپنی شرطیں بھی ہیں۔ جن سے نظریں بچا کر ہم کشور ناہید کی دور سے پہچان تو کر سکتے ہیں

،اسے اچھی طرح جاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اس شاعری کو جاننا اپنے عہد، اپنی تاریخ اور اس تاریخ کی تہہ میں چھپے ہوئے امکان کو جاننے کے مترادف ہے۔ اس طرح کشور ناہید کی شاعری، جیسا کہ بالعموم تصور کیا جاتا ہے اس کے برخلاف صرف اعتراف کی شاعری نہیں ہے۔ اعتراف کے لغوی معنی کچھ بھی ہوں، شاعری اس لفظ کی حدیں شکست، ہزیمت، نارسائی بے حصولی اور پشیمانی کے مفہوم سے آگے کم کم ہو جاتی ہیں۔ اس مفہوم کو بامعنی جہت دینے کے لیے ضروری یہ ہے کہ بے دلی یا پسپائی کے احساس کو ایک وسیلے کی سطح پر برتا جائے، اسے اپنے تجربے کا مقصود نہ سمجھ لیا جائے۔ مگر ایسی مثالیں خال خال دکھائی دیتی ہی۔ دوسرے لفظوں میں اعتراف کی شاعری دراصل اس مقدر کی شاعری ہے جو کسی شخص یا اجتماعی اختیار کے عنصر سے عاری ہوتا ہے اور ایک لازوال جبر کا اشاریہ۔ مجھے اس جبر کے احساس کی فنی قدر و قیمت یا بعض صورتوں میں اس احساس کی ناگزیریت سے انکار نہیں۔ لیکن اس جبر کو قبول کر لینے کا مطلب ہے اپنی اخلاقی ذمے داری اور اپنی ہستی کے امکانات سے یکسر بے نیاز ہو جانا۔ بے نیازی کا راستہ اپنی المنا کی اور اضطراب انگیزی کے باوجود، بہرحال ایک آسان راستہ ہے کہ یہاں نہ اپنے تجربے کی ضرورت پیش آتی ہے نہ اپنی تاریخ کے تجزیے کی۔ کشور ناہید نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ مشکل بھی ہے اور صبر آزما بھی۔ اس نے اپنے ضمیر اور اپنے زمانے دنوں کے حقوق ایک ساتھ ادا کرنے کی جستجو کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشور کی شاعری اپنے شخصی آہنگ اور اپنی ذات کے اثبات کے باوجود اس سے ایک معروضی فاصلے کا پتہ بھی دیتی ہے۔ لب گویا کی غزلیں کہ جو آئینے سے ہم کلامی کے دور کی دستاویز ہیں۔ جذباتی آشفتگی کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ ہمیں اس عنصر کی سادگی اور سچائی متاثر کرتی ہے مگر اس تاثر میں ایک ملائم رومانی تاثر بھی شامل ہے۔ وہ سخت کوشی جو بے نام مسافت، گلیاں دھوپ دروازے سے ہوتی ہوئی ملامتوں کے درمیان تک پہنچی، بہ حیثیت ایک فرد کشور کی شخصیت اور اس شخصیت کے تخلیقی اظہار، دونوں کے کیتھارس کا ذریعہ ہے۔ اس موڑ پر اپنی ہستی اور اپنی کائنات میں قربتوں کے جو بہانے پیدا ہوئے ہیں وہ کشور کی شاعری کو اس زندگی کے ساتھ ایک جلال آمیز، فکری واردات اور ایک ہمہ جہت زمانے کا ترجمان بھی بناتے ہیں۔ یہاں کشور کا وجود صرف اپنے ہونے کی شہادت نہیں دیتا۔ سوالوں کے ایک پُورے سلسلے، ایک بسیط سرگرمی، ایک دائم و قائم جدوجہد اور ایک نئی شعری و معاشرتی اخلاقیات کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ کشور ناہید کی شاعری یہاں ایک ایسے واقعے کی شکل اختیار کر لیتی ہے جو جاری ہے، اس طرح یہ ہمارے عہد کی پوری سائکی اور ہماری تاریخ کے تحرک کا حصہ بن گیا ہے۔

غزل اور دوہے سے نظم کی طرف، پھر نثری نظم کی طرف پھر مختلف النوع شعری اور نثری تراجم نیز ایک سائنٹیفک علمی تحقیق و تجربے کی طرف آنا کشور کے ادراک اور اس عہد کے مابین ایک مستحکم ہوتے ہوئے تعلق کی کہانی ہے۔ انسانی رشتوں کی ہر کہانی بھی متضاد مراحل سے گزرتی ہوئی ایک پیچیدہ کہانی میں صبر، شکست اور بے دِلی کے مقامات بھی آتے ہیں۔ لیکن کشور ناہید کے توانا تخلیقی شعور کا آسیب نہیں بنتے۔ یہ شعور اپنی تردید کے بجائے اپنی ہستی کے مفہوم میں ایک نئی وسعت اور اپنے عہد کے انتشار میں ایک نئی معنویت کی دریافت کا عطیہ ہے، ایک زندہ اور سرگرم طبعی وجود کی ایسی تجرید جو Abstract اور concrete کی ایک نئی تعبیر کا تقاضہ کرتی ہے۔ خیال اسی سطح پر عمل کا قائم مقام بنتا ہے۔ کشور ناہید کی شاعری نے اس سطح پر اپنی حفاظت کئی واسطوں سے کی ہے۔ یہاں کشور کے تخلیقی ارتکاز، کشور کی زبان، لہجے اور اسلوب اور اس کی نظموں کے اسٹرکچر کو حسبِ توفیق ہم اس میں گتھی ہوئی زندگی کے شور شرابے سے الگ کر کے اسلوبیات کی تجربہ گاہ تک بھی لے جا سکتے ہیں، مگر یہ ایک ادھوری ملاقات ہوگی اس چہرے سے اور اس شاعری سے جو سماجی ضابطوں اور علوم کے بندھے ٹکے فریم کو مسترد کرتا ہے۔ مجھے اس موقع پر کشور ناہید کی شاعری کا سب سے خیال انگیز پہلو اس کی Strategies میں شامل تخلیقی طریق کار کی وہ سمت دکھائی دیتی ہے جو خیال کو رنگوں میں، احساس کو ایک نوع کی ماڈی اور طبعی سرگرمی میں اور اپنے ایقانات کو ایک شعری بیان Poetic Statement میں منتقل کرنے سے عبارت ہے۔ اس عمل میں کشور نے بصیرت اور جذبے کی دوئی کے ساتھ ساتھ نظم و نثر کے فارمولائی تصور کو بھی مسمار کیا ہے۔ کسی بھی قسم کی توڑ پھوڑ تو ایک قائم بالذات جمالیاتی قدر کی تشکیل کا سبب ہوتی ہے نہ اسے بجائے خود بامعنی بناتی ہے۔ تاوقتیکہ اس کے محرکات اور اس کے نتائج اب اپنا جواز بننے کی قوت رکھتے ہوں۔ چنانچہ، گھوم پھر کر بات دوبارہ اسی اخلاقیات تک پہنچتی ہے جس کی ترکیب میں شاعر اور شاعری کے اپنے سوالات کے علاوہ اپنے عہد کے سوالات اور حوالے بھی ناگزیر ہوتے ہیں۔ کشور نے اپنی شاعری کو تجربہ گاہ بنانے سے ہمیشہ گریز کیا ہے کہ یہ شاعری اس نوع کی عیاشی کا بار اٹھانے کی علّت سے عاری ہے۔ زندہ، سرگرم اور متجسس ادراک برائے بیت بھی ایسے مشاغل کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس قسم کے مشاغل بہرصورت ایک طرح کی روحانی قناعت اور ذہنی تساہل کے طلب گار ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی کہ جب زندگی اور اس سے وابستہ ذات کے تجربے فرصتِ یک نفسی کی فراہمی سے قاصر ہوں تو ایک مستقل تحریک اور اضطراب اس کی شناخت بنتا ہے۔ راستے چلنے کیلئے ہوتے ہیں۔ رُک کر دم لینے کا خیال اسی صورت میں آتا ہے جب حوصلے ہار چکے ہوں یا یہ کہ مسافتیں پہلے سے متعین ہوں۔ کشور ناہید کی شاعری ایک ایسا سفر نامہ ہے جس کی تعمیر میں انسانی تاریخ کے بعض بنیادی سوالات کے ساتھ ساتھ اس عہد کا ضمیر بھی مصروف کار ہے۔ جبھی تو یہ شاعری کسی ایک نقطے پر ٹھہرنے کی جگہ تلاش اور تبدیلی کے ایک لامختتم سلسلے سے گزر رہی ہے۔ یہ سلسلہ کس موڑ پر ختم ہوگا۔ یہ تو شاید کشور کو بھی نہیں معلوم۔ جن لوگوں کو اپنی جستجو کے صلے مل جاتے ہیں ان کے جینے اور سوچنے کا قرینہ کچھ اور ہوتا ہے۔ ان کی اصل ضرورت بولنا نہیں چپ ہو جانا ہے۔ ایسوں کے دل سزاؤں کے خوف سے خالی اور شادکام ہوتے ہیں۔ مگر اس معاملے میں کشور ناہید کا مؤقف بہت واضح ہے۔

''برف کی مانند جینا''

محمد علی صدیقی
(کراچی)

کشور ناہید کا تازہ ترین شعری مجموعہ ''گلیاں ، دھوپ ، دروازے'' ہمارے سامنے ہے۔اس میں نثری نظم، نظم اورغزل کے تین علیحدہ علیحدہ حصّے ہیں۔ جہاں تک کشور ناہید کا تعلق ہے نثری نظم کی صنف کی جانب ان کی رجعت اس اعتماد کا اظہار ہے کہ نثری نظم میں بھی شاعری ممکن ہے۔ بشرطیکہ وہ شاعری ہو۔اور پھر ویسے بھی کشور ناہید کی نثری نظموں کے بارے میں یہ خیال آرائی کہ اُن کی مساعی کسی خاص دبستان نثری نظم کے تتّبع میں ہیں صریحی طور پر غلط ہے۔ جدید اردو شاعری میں قارئین اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ وہ ۱۹۷۱ء سے نثری نظم لکھ رہی ہیں اور بعض شعراء ۱۹۶۲ء سے۔اور اگر یہ سلسلہ عظیم قریشی تک جا پہنچے تو بات ذرا طولانی ہو جاتی ہے۔ جب نثری نظم کے بعض وکلاء نے اس صنف کے بارے میں ایک مذہب یا ایقان Cult کی صورت اختیار کی اورشاعری کی دیوی کو صرف اور صرف نثری نظم کے عقد میں تفویض کیا اُس وقت بعض حضرات نے ناک بُھوں چڑھائیں لیکن جیسا کہ قاعدہ ہے کہ بعض حضرات اپنے مخالفین کے مؤقف کو اس بُری طرح مسخ کر لیتے ہیں کہ اس طرح صرف اپنے دلائل کو کمزوری پر صاد کر لیتے ہیں۔

آپ اس مضمون کی اب تک کی سطروں کو جملہ ہائے معترضہ کے ذیل میں رکھیں یا کشور ناہید کی مدّلل مداحی کے لیے زمین ہموار کرنے کی کوشش قرار دیں بہرحال ایک بات ضرور ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں ایک واقعہ ضرور وقوع پذیر ہوا ہے ایک دھماکہ ضرور ہوا ہے، اور وہ یہ کہ کشور ناہید بہت سی ایسی وارداتوں سے گزرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں جنھوں نے ان کے یہاں ذہن اور مادہ کی دُوئی مٹا کر رکھ دی ہے اور انھوں نے شاید اپنے باطن کی گہرائیوں سے محسوس کیا ہے کہ جب تک شاعرہ یا شاعر زندگی کے بارے میں سفاکانہ طور پر برملا اظہار کی قائل نہ ہو اور الفاظ کو بنفسہٖ محترم خیال نہ کرے اُس وقت تک شاعری ممکن نہیں۔ بہرحال ایک حقیقی شاعر کے ذمہ ایک بھاری ذمہ داری یہ آن پڑی ہے کہ وہ سماجی تغیرات کی سعی کرے کہ ایک لمحے کا سچا فرد وقت کے حصار میں پھنس کر نہ رہ جائے۔ کشور ناہید حیرت انگیز طور پر اپنی شاعری کے ایک ایسے دور میں چھپتے چھپاتے داخل ہو چکی ہیں جہاں وہ اپنے پہلے دَور کی مانند عاشقان بیدلؔ و غالبؔ سے داد طلب کرنے کے بجائے اُن لمحات کی سچائیوں کی طرف راجع ہوئی ہیں جو بہت ذاتی ہوتے اور رہتے ہوئے بھی ذاتی نہیں رہ پاتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک فرد اپنے ذاتی وجود سے سوچنے کے بجائے اپنے معاشرے کی ہیئت ترکیبی کے ذہن سے سوچنا چاہ رہا ہو اور ''گلیاں، دُھوپ ، دروازے'' کے پُر اسرار عنوان سے قطع نظر اس مجموعہ کے اولین حصے کی نظمیں خصوصیات مکافات، گھاس تو مجھ جیسی ہے، تیرالٹیا شہر بھنبھور ہم نے خواہشوں کے سارے پرندے اڑا دیے ہیں۔ اور آخری خواہش، بڑی کامیاب نظمیں ہیں۔ بادی النظر میں قابلِ ادراک سچوایشن کو ایک فرد کے حوالے سے۔ اُس کی فکر کے گھٹتے بڑھتے سائے نے مرتب ہونے والے خدوخال کی مدد سے ، کچھ اس درجہ دعوت آگیں بنا دیا ہے کہ کشور ناہید جیسی شاعرہ اپنے ماتھے پر ''بیراگ'' کا سندور لگائے ہمارے درمیان سے اس طرح گزرتی ہوئی نظر آ رہی ہے جیسے جو کچھ اُس کا ہے وہی بڑی حد تک سب کا ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے غیر ذاتی ادب کی وکالت روایت کے حوالے سے کی تھی۔ لیکن کشور کے یہاں ''غیر ذاتی'' ادب ہم عصر صورتِ حال سے اتصال کی کامل خواہش کے بطن سے جنم لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اسے جدید تصوّف کا نام دیں۔ اس کا تعلق ڈاگ ہمر شولڈ کی شہرۂ آفاق کتاب مارکنگس Markings میں بیان کردہ قلبی کیفیات سے بھی نہیں جو کشور سے زیادہ مجلسی ہوتے ہوئے بھی ایک بڑے صوفی تھے۔ لیکن کشور ناہید نے اپنے تازہ ترین مجموعہ میں بعض ایسے محسوسات کو شاعری بنایا ہے جن کی طرف اُن کے قبیل کی چند جرأت مند خواتین شعراء۔ بالخصوص فہمیدہ ریاض نے ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ جس طرح ہر شہ پارہ خود اپنا جواز ہوتا ہے، اپنے خالق کے ان لمحات کا ارتسام ہوتا ہے۔ جو وقت کے مہیب اور پُر شور دریا کے رست و خیز میں اپنے علیحدہ وجود کی آگہی کو مٹاتا ہوا چلتا ہے۔ اور یہ وہ جذبہ ہے جو سراسر قربانی چاہتا ہے۔ یہ جذبہ ایک رنگ حاصل کرنے کی خاطر سارے رنگوں سے گلوخلاصی پانا چاہتا ہے۔ یہ جذبہ ایک خاص پُر پیچ حیثیت کا آئینہ دار ہے۔ جو بنیادی طور پر نا آسودہ ہے۔ آپ اپنا ذہن اس ''ریمارکس'' کے بظاہر ذاتی حوالوں سے جھٹک کر دیکھیں کہ کشور ناہید نے پچھلے دس سال میں شعری تجربات کا ایک وسیع سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ وسیع تجربات، واجبی تجربات، اچھی کوششیں اور ناکام کوششیں، لیکن شاعرہ ہے کہ تجربات کے سہارے آگے بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے کہ وہ اس حقیقت کو بخوبی جانتی ہے کہ شاعری اور ادب کا معاملہ کسی ایک فرد یا گروپ کے ساتھ لازم و ملزم ہونے کا نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسی دعوت فکر ہے جو بسا اوقات بہت ژدلیدہ افراد کو بھڑک دار اور بہت بھڑک دار افراد کو ژدلیدہ بنا چھوڑتی ہے۔ وہ یوں کہ شعر ایک واردات ہے۔ واردات بظاہر ذاتی نظر آتی ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ یہ ذاتی ہونے کے باوجود اپنے جوہرِ خاص کی وجہ سے ذاتی نہیں رہ پاتی۔ لیکن یہ اچھی شاعری کی خاصیت ہے۔ الغرض جبر اور اختیار کی غیر مختتم لڑائی میں شاعر پر کبھی ایک رجحان اور کبھی دوسرا رجحان غالب آتا ہوا نظر آتا ہے لیکن ''کل'' شاعرہ کا احاطہ کیے بغیر نمائندہ رجحان کی بنیاد تک نہیں پہنچا جاتا۔ اس پر طرفہ تماشا یہ ہے کہ ہم اس خودمختاری اور جبر سے قصے کی باگیں اگر ماضی کی جانب موڑ دیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایچ۔ جی۔ ویلز کی ''ٹائم مشین'' پر سوار ہیں ہنسانے والی گیس سُونگھ رہے ہیں اور بے حال ہوئے جا

رہے ہیں۔ہم اپنی خودادرا کی اور خود تفہیمی کی مخلصانہ کوششوں کے دوران ایک اسی بھول بھلیاں میں گرفتار ہو جاتے ہیں جہاں ہمارے علاوہ کوئی دوسرا وجود نہیں ہوتا۔تقاضہ ہوتا ہے کہ ہر چیز ہماری آنکھ سے دیکھی جائے ورنہ وہ کچھ نہیں ہے۔

کشور ناہید نے اپنے نئے مجموعے میں ذاتی واردات اور اُن کے سہارے رواں دواں زندگی کے بہت سے دُکھوں کو خوبصورت مرتبانوں میں سجایا ہے۔(بسا اوقات بے ہیئت کہ اس دور کا حسن بعض اصحاب کے خیال میں بے ہیئتی کے ذریعہ اظہار چاہتا ہے) یہ ایسے مرتبان ہیں جن کے اندر سانس لیتی ہوئی روحیں ذاتی دُکھوں کے ذکر پر پشیماں نظر آتی ہیں۔ بلکہ وہ پشیمان یا خشمناک ہونے والی مخلوق کے چہروں پر ہویدا شکنوں سے درسِ زندگی حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ایک مردِ فرزانہ کا قول ہے کہ آدمی کبھی اس قدر سنجیدہ نہ بنے کہ اپنے اندر معصوم بچے جیسے وجود کو مار پھینکے کہ اس کے اندر وجود کی موت صرف اپنی روحانی موت ہی نہیں پورے معاشرے کی موت بن جاتی ہے۔اگر کشور ناہید کا یہ انتہائی انفرادی کلام، ٹی، ایس، ایلیئٹ کی غیر ذاتی شاعری پر پُورا نہ اُترے تو نہ اُترے کہ اس کام کے لیے ابھی ہمارے درمیان بہت سے ایسے افراد موجود ہیں جو اپنی ادبی کاوشوں کی انتہائی ژولیدہ شکلوں کی حفاظت ’’روایت‘‘ کی غیر ذاتیت کے ذریعہ کرنا چاہتے ہیں، لیکن یہ ایک ایسی شاعرہ کا کلام ضرور ہے۔جو اردو نظم کا پورا آدمی بننے کی جستجو میں سرگرداں ہے۔اور اب اُس کے لیے اس زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ کام کی ہے۔وہ قابلِ تمسخر بوالعجبیوں سے پیچھا چُھڑانا ہی ہے۔ ورنہ ہمارے اردگرد دکھاوے کا مرتب اور منظّم معاشرہ ہے جو اندر سے کٹا پھٹا اور مغائرت کا شکار ہے۔دوعملی اس قدر ہے کہ اب دوعملی کا لفظ بھی پناہ مانگ رہا ہے۔ ہماری زندگی کی حقیقت پسندانہ عکاسی اس درجہ مشکل ہو چکی ہے کہ اگر تھڑدِلے ایک متصل غیر سنجیدہ کیفیت میں غرق نہ رہیں تو ان کے بدن سے آگ کے پتنگے نکلنے لگیں۔

کشور ناہید کی شاعری ایک احتجاج ہے، بہتر ہے کہ ہماری نظریں احتجاج پر مرکوز ہیں۔احتجاج کنندہ پر اس اَمر واقعہ کا الزام ماہر نفسیات سے سفا کی اور محکمہ دار و گیر سے رحم کا طالب ہے۔دیکھنا یہ ہے کہ احتجاج کنندہ اپنے احتجاج میں کس درجہ مجبور ہے اور کس درجہ مختار، لیکن ہر دو صورتوں میں شاعری کو یہ موقع ضرور ملنا چاہیے کہ وہ ہم عصری صورت حال پر حکم لگائے۔شاعرانہ اور غیر شاعرانہ حکم میں زمین و آسمان کا بُعد ہوتا ہے۔بات آگے کیوں بڑھائی جائے؟

مجھے خوشی ہے کہ اس مجموعہ میں شعری زبان کے بارے میں حالیہ برسوں کے بہت سے مباحث صاف ہوئے ہیں ۔ زبان وہی ہے جو چومسکی Chomsky کے مطابق ’’تخلیقی گرامر‘‘ کے اُصولوں پر قائم ہو اور اپنے اندر سماجی ترقی کے مطابق تبدیلیاں پیدا کر سکے۔لسانی تشکیلات کا نظریہ مقصد اور منزل کے شائقین پر گراں گزرا ہے اور گزرتا رہے گا۔کشور زبان کے معاملے میں بہت صاف ہے۔

یہ درست ہے کہ زبان کا مسئلہ ادبی اظہار اور اس کی تصدیقی ضرورتوں کے لیے ضروری ہے اور مقام مسرّت ہے کہ کشور ناہید نے زبان و حقیقت، زبان و ادب اور زبان و فلسفانہ اظہار کے مابین مفروضہ تناقصات سے، جن سے خودوٹ گن اسٹائن نے آخری عمر میں معذرت چاہ لی تھی۔اس طرح رہائی حاصل کی ہے کہ اُس نے اپنے ذات کے حوالے سے شاعری کو روحِ عصر کا ترجمان بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اور اَب اگر بعض حضرات یہ حکم لگائیں کہ اس مجموعے کی بعض سطریں بہت ذاتی ہیں تو پھر شاعری کے بہی خواہ مزید خوش ہو لیں کہ شاعری بنیادی طور پر ذات کا اظہار رہی ہے۔لیکن اظہار کی نوبت ہی اس وقت آتی ہے جب ’’الفاظ‘‘ برتنے والے موجود ہوں۔اس طرح خالصتاً انفرادی اظہار کے حوالے بھی احتجاجی شعور و لاشعور سے تعلق رکھتے ہیں اور شاعری اس الزام سے محفوظ ہو جاتی ہے جو بعض اچھے فنکاروں کی اُن کوششوں پر بھی لگا دیا جاتا ہے جو شخصی اور ذاتی اظہار کے جبر سے کامران و کامیاب گزر کر اپنی مساعی کو تجربہ و مشاہدہ کے مشترک خزانہ کے حوالے کر دیتے ہیں اور پھر اس طرح ان کی کاوش ایک ایسے ’’کل‘‘ کا حصہ بن جاتی ہے جو دھنک رنگ ہوتے ہوئے بھی ایک رنگ نظر آتا ہے۔

کشور ناہید نے اس مجموعہ میں واقعتاً کچھ ایسی منازل طے کی ہیں جن کے انشراح کے لیے وہ کسی طور بھی شعوری نہیں رہ سکتی تھیں۔نثری نظم اور نظم کے حصوں کے علاوہ غزلوں کی زبان کا دردوبست بتاتا ہے کہ وہ نا آسودگی اور بے آرامی کی کیفیات سے دوچار رہتے ہوئے بھی لحہ گزراں پر وقت کی مہر لگاتی ہوئی چلی جا رہی ہیں ان کے یہاں تنگ و تاریک الفاظ کا استعمال اس قدر کم ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاصی پریشان کُن صورتِ حال بھی روشنی اور قوت کی استوانہ پر کھڑی ہو کر رقم کر رہی ہیں اور یہ کافی اُمید افزا پہلو ہے۔

برسبیلِ تذکرہ اس مجموعہ میں کشور کے یہاں گریہ اور قہقہہ باہم مدغم ہونے کے باوجود بھی الفاظ سُبک اور تراشیدہ نشستوں پر مسند آرا ہیں اور قاری سے کشادہ اور فیاضی کا رویہ چاہتے ہیں۔ جب انسانی صورت حال پیچیدہ ہو تو پھر اظہار کے کامیاب فن کاروں کی ذمہ داریاں دوچند ہو جاتی ہیں۔کشور ناہید نے اپنے تازہ مجموعے میں نجی محسوسات کو فکرِ لطیف میں تبدیل کرنے کی بھرپور سعی کی ہے اور انسان کش رویوں کے خلاف شعری زبان میں، شاعری کے حوالے سے، بڑے سلیقہ سے دعوتِ فکر کا اہتمام کیا ہے۔

ادب اور زندگی کی سچائیوں کو بھی اس قدر تیکھے انداز میں دیکھنے کی کوشش ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے غیر ہموار ذہن بھی ’’ہموار‘‘ سے نظر آتے ہیں۔ ادب ایک علاج یا ’’تھراپی‘‘ ہے اور کشور ناہید کے تازہ ترین مجموعہ میں اس کا صرف ایک ہی پہلو ہے۔ذرا ٹھنڈے دل سے ایک شخص کے ذہن میں جھانک کر دیکھیے، فوری طور پر آپ کے چین و اطمینان میں کمی آئے گی لیکن اس کے بعد آپ زیادہ صاف ستھری اور نکھری ہوئی فضاؤں میں داخل ہو جائیں گے۔

کشور ناہید کے مجموعہ میں فرد اور اجتماع کے حوالہ سے بہت کچھ کہا گیا ہے۔کیا آپ اُس کی سوچ میں شریک ہونے کی تاب رکھتے ہیں؟

''آئینہِ شوق''

(کشور ناہید صاحبہ کے نظمیہ کلام سے مختصر انتخاب)

پروین شیر (کینیڈا)

فَبِاَیِّ آلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن

یہ بھی نعمت ہے کہ دیوانگی
ترتیبِ سراسیمگی، اندیشۂ حسرت کے سیہ خانوں سے
احساس کی قندیل لیے
رُتبۂ قُرب کی جلوت میں
بہر طور اُجاگر تو ہوئی

یہ بھی نعمت ہے کہ تنہائی کی سوزش
طلب وزشت کی دلدل سے گذر کر
کسی اِک لمحۂ محسوس میں محبوس ہوئی

یہ بھی نعمت ہے کہ احساس نے پوچھا مجھ سے
تم کو منظور ہے زندانِ بَلا ہو جانا؟
نارسائی کے تحیّر میں فنا ہو جانا؟

یہ بھی نعمت ہے کہ یہ چشمِ نگوں سار،
مہک اور جُنوں خیز بہاروں کے نقابوں سے
نکلتے ہوئے دیکھے ایسے
کہ ہر اک لفظ، کہ تمثیلِ تمنّا کے لیے مشکل تھا
پھر تو پیکر کی طرح مجھ سے کہے
روشنی رُکتی نہیں، آنکھ جھپکنے سے بھلا کیا حاصل!!

تعبیر

وہی ہے شنگرفی رنگ سُرخیِ غم کا
وہی ہے چاند کے چہرے پہ جانکنی کا حصار
وہی ہے زرد رو پتوں کے ٹوٹنے کا سفر
وہی دل میں تماشائے خستگی کی چبھن
وہی ہے ٹھہر نہ سکنے کا زندگی کا چلن
وہی ہے فصلِ غمِ ناتمام کا عالم
وہی ہے صُبحوں کی تابندہ رنگتوں کی سبھا
وہی ہے جلتی دوپہروں میں عکسِ دل زدگی
وہی ہے قرمزی شاموں میں حدّتِ مثبت
وہی ہے ڈھلتی ہوئی رات اذنِ بے مایہ
وہی ہے قرب کی چاہت، سپردگی کی تڑپ
وہی فلک کی ہے رنگت وہی ہے راہگذر
مگر وہ شخص کہ جس کے لیے یہ سب کچھ تھا
وہ میرا نام درختوں پہ لکھ کے چھوڑ گیا

○

روح کا بوجھ

اب حسنِ وفا، آئینۂ شوق سے بیزار
تدبیرِ رہِ ہست کی یک رنگیٔ آہنگ سے
پتھرائی ہوئی آنکھ کی صورت ہے
سزاوارِ شبِ تار

اِک سائے کی صورت ہے ہر اِک شکل کا احساس
آنکھیں نظر آئیں
تو خدوخال کا نقشہ نہیں جمتا
اب خود کو بھی خود سے ہی
چھپائے نہیں بنتا
اب زیست ہے صحرا کے سرابوں کی طرح
رونقِ احساس،
جینے کی ہوس، مشکِ رفاقت سے ہے عاری
اب رشتۂ دل، لطف وعنایت سے ہے عاری
تمہیدِ ستم اب تو مداوا نہیں غم کا
کچھ کشف تمہیں ہو تو بتاؤ کہ یہ کیا ہے!

❍

پیش بندی

پھر نظر آئی ہے
جینے کی وہ صُورت' کہ ہے جس میں شامل
دل کی دریوزہ گری
ذہن کی آشفتہ سری
غم کو بہلانے کی سعیٔ ناکام
اس سے دُوری میں بھی قُربت کی تپش
اور پھر قُرب میں حائل وہی دُوری
کہ نہیں جس سے مفر۔

جسم کا اندھا کنواں
یاد کی گیلی مٹّی
یہی دولت، یہی عُسرت
یہی نیکی تو یہی رُسوائی
تشنہ کامی کے سمندر میں چھپا لو خود کو
اس کو دیکھو گی تو پھر اس کی طلب
چین نہ لینے دے گی

❍

تقریر نمبر ۲۷

میری آواز، میرے شہر کی آواز ہے
میری آواز، میری نسل کی آواز ہے
میری آواز کی بازگشت نسل در نسل چلے گی
کیا سمجھ کے تم میری آواز کو شور کا نام دے رہے ہو
کِس برتے پر تم میرے اندازِ تخاطب کو مجنونانہ کہے رہے ہو
کس زعم پر تم بڑھتے ہوئے طوفانوں کو نظر کا دھوکہ
سمجھ رہے ہو

مَیں پیمبر نہیں ہوں
مَیں تو بس آج کو آنکھیں کھول کر دیکھ رہی ہوں
تمہاری وحشیانہ رعونتوں کی بُو
پیسے کی ہوس کی شکل میں پھیل رہی ہے۔
تم لیموزین کی پچھلی سیٹ پر نیم دراز ہو
تا کہ شیشوں سے جھانکتی غربت کی سخت دھوپ
تمہارے سرجری شدہ چہرے کو مسخ نہ کر دے
تمہیں تقریروں کے نمبر اب از بر ہو گئے ہیں
تقریر نمبر ۱۰، غریبوں کو جگانے کی آواز ہے
تقریر نمبر ۱۵، عورتوں میں شعور بیدار کرنے کی آواز ہے
تقریر نمبر ۲۷، ادیبوں، دانشوروں کو مشورے دینے
کی آواز ہے۔

آواز، آواز، آواز

غُل کسے کہتے ہیں
بے ہنگم آوازوں کے شور کو
کہ بے ربط تقریروں کے تموج کو
پتھر لڑھک رہے ہیں
صحرا میں پتھر پھینکو تو پتھر، ریت میں بے آواز دب جاتے ہیں
لیکن میری آواز پتھر نہیں ہے
بجلی ہے
جس کی چمک کے بعد، گرج کا شور
سب سُنا کرتے ہیں
تیز گرج ہو تو کانوں پہ ہاتھ رکھ لینے سے
طوفان رُک نہیں جایا کرتے ہیں

موسم کا حال پڑھ کر موسم کے بارے میں تقریر کرنے والے
گلی میں بہتی نالیوں کو دیکھنے کب آئیں گے
شجر کاری کے دِنوں میں انقلاب کا پودا لگا دینے سے
انقلاب کا جنگل اُگا نہیں کرتا ہے
لال رنگ دو آنے میں ڈھیر سارا آجاتا ہے
مگر یوں دو آنے کے رنگ میں رنگے دوپٹے
خون کا عکس نہیں بن سکتے
مجھے اگر یہ سب کچھ معلوم ہے
تو تمہیں کیوں معلوم نہیں
میں سچ کہتی ہوں
مَیں پیمبر نہیں ہوں
میں تو بس آج کو آنکھیں کھول کر دیکھ رہی ہوں۔

❍

ترا لُٹیا شہر بھنبھور

نیند نہیں آتی
بستر کی خواہش بھی آسودگی چاہتی ہے
میں ستارے گنتے گنتے
یہ سوچتی ہوں کہ ستاروں کی گنتی
تو تمہیں گلا گھونٹ کے مار ڈالنے کی گنتی سے کہیں کم ہے
تم میں بھی خواہش ہے
مجھ سے خوبصورت بنے رہنے
اور نت نئے ڈیزائنوں کے کپڑوں میں
لپٹے رہنے کی۔
کیلنڈر کی تصویر بدلتی ہے
روز و شب کی تلخی نہیں بدلتی
روز، سہ پہر سے رات
قدموں کی چاپ کی بازیافت
یا ٹیلی فون کی گھنٹی سے
واپس آنے کی تسلی کے حرف کی اُمیدیں
بسر ہوتی، منتشر ہوتی رات، اور پھر دن
کریز میں سجے دُھلے دُھلائے کپڑوں
کی طرح گزر جاتا ہے۔
سہ پہر سے رات
پھر وہی احساس
پھر وہی خواہش،
تالے میں چابی گھومتی ہے
میں کروٹ بدل کر لیٹ جاتی ہوں،
مرتبان میں بند
تتلی کی طرح،
صحرا میں گھومتے
اکیلے چیتے کی طرح،
مگر نیند نہیں آتی ہے

سُن ری سہیلی

آسمان سے بارشوں کی صورت برستا پانی
پُھول بنتا ہے، فصل اُگاتا ہے، کھیت بنتا ہے
مگر میرے آنسوؤں سے میرے غم کی کھیتی سیراب کیوں نہیں ہوتی ہے
میرے آنگنوں میں کھڑے گلاب کے پودوں کو
میرے آنسوؤں کا نمک، زہر بن کر کھا رہا ہے

اپنے آنسوؤں سے کپڑے دھونے والی نسلو!
مرادوں کا بہتا دریا آنکھوں کی جھیلوں سے پھُوٹ پڑا ہے
آنکھوں کے گرد حلقے، رنگریز کے رنگے ہوئے سیہ ابرے کی طرح ہیں
تم اپنے آنگنوں میں گیلی لکڑیوں کی طرح
دن بھر دھوپ میں سُوکھ سُوکھ کر کوئلہ بن چکی ہو
کوئلہ آگ بن کر چٹختا ہے
مگر تم میں تو یہ حوصلہ بھی نہیں
ہاتھوں کی جھریوں اور آنکھوں کے حلقوں کی کمائی لیے
تم کیا چاہتی ہو۔
پتھر سے پتھر ٹکرائے تو پھر بھی آواز سنائی دیتی ہے
ستاروں کی روشنی، ان کی خامشی کو آواز میں بدل دیتی ہے
مگر بولتے انسانوں کی گفتگو
آواز کو خامشی بنا رہی ہے
اخبار میں لپٹے ہوئے پھُول، بہار کی نشانیاں کیسے بنیں۔

○

کلیئرنس سیل

سُنو! اے بانوئے گُفت آشنا نیا قصّہ
نکل کے آئی ہے لیلیٰ حیا کے محمل سے
سُنا ہے مسئلہ درپیش ہے چناؤ کا
ہو آبنوسی بدن، شاخسار بانہیں ہوں
کُشادہ، پیاسی، طلبگار، بے وضو آنکھیں
وفائے شب کے قرینے سے آشنا آنکھیں
طلوعِ دستِ مسیحا کی شکل میں پلکیں
جُھکیں تو سایۂ ابرِ سیاہ، یاد آئے
مہکتے ہار چمکتی گداز بانہوں کے
نثار ہوں نئے مہماں کی دلنوازی کے
عروسِ وصل کو فردوس آشنا کردیں
زباں میں ذائقۂ وصل یوں رچے شب بھر
کہ ختم ہو نہ یہ قربت کی ساعتوں کی سحر
بدن کے روپ میں، مے کی سراحیوں کی طرح
خمارِ شب میں ڈھلیں اور بھی گلاب بنیں
زر و جواہر و لعل و گُہر کا عرق پئیں
نصیب جاگیں گے دوشیزگانِ نورس کے
نئی سحر کے پیمبر جگا رہے ہیں اُنہیں
چلی بھی آؤ، بُلاتے ہیں ظِلِّ سُبحانی!

○

پورٹریٹ

اُداسی جنگلوں کی
گفتگو بھی جنگلی لوگوں کی
ہر چہرے پہ خود آورد غم کی چھاپ
اور ہاتھوں میں تصویروں کے ڈھانچوں کے
دُھلے اندھے ورق
بے خواب آنکھوں کے دریچوں سے جھلکتی جانکنی کے سُرخ ذرّے
دم بدم گھٹتے ہوئے ماحول کی زردی
ورم سے پھُولی، پَیروں کی رگیں
خاموش ویراں رات کی صورت
سیاہی کو سفیدی میں بدلتے بال
اُلجھی گفتگو،
خاموش اشکوں کی لڑی،
بے کار تمہیدیں،
تصنّع کی تہوں میں ایک ہی فقرہ
چلو اب مان بھی جاؤ!

○

انٹی کلاک وائز

میری آنکھیں، تمہارے تلوے بھی بن جائیں
تو بھی تمہیں یہ خوف نہیں چھوڑے گا
کہ مَیں دیکھ تو نہیں سکتی
جسموں اور فقروں کو
خوشبو کی طرح محسوس تو کر سکتی ہُوں

میری ناک، اپنے تحفّظ کی خاطر
تمہارے سامنے رگڑ رگڑ کر
بے نشان بھی ہو جائے
تو بھی تمہیں یہ خوف نہیں چھوڑے گا
کہ مَیں سونگھ تو نہیں سکتی
مگر کُچھ بول تو سکتی ہوں

مرے ہونٹ، تمہاری مجازیت کے گُن
گا گا کر
خشک اور بے رُوح ہو بھی جائیں
تو بھی تمہیں یہ خوف نہیں چھوڑے گا
کہ مَیں بول تو نہیں سکتی
مگر چل تو سکتی ہُوں

مرے پَیروں میں زوجیت
اور شرم وحیا کی بیڑیاں ڈال کر
مجھے مفلوج کر کے بھی
تمہیں یہ خوف نہیں چھوڑے گا
کہ مَیں چل تو نہیں سکتی
مگر سوچ تو سکتی ہوں

آزاد رہنے، زندہ رہنے
اور مرے سوچنے کا خوف
تمہیں کن کن بلاؤں میں گرفتار کرے گا

○

اعتقاد

جب تم میرے ساتھ ہوتے ہو
تو ہَوا میرا نام پوچھتی ہے
بارش مجھ سے بغل گیر ہو جاتی ہے
دریا مجھ سے لپٹنا چاہتا ہے
چڑیاں مجھ میں بولنے لگتی ہیں
سیپیاں میری کوکھ جیسی لگتی ہیں
مجھے لگتا ہے
میرے کمزور لمحوں میں
خدا مجھ سے اور زیادہ پیار کرتا ہے

○

جنم پتری

تمہارے پاس اعتماد کی خالی چھاگل ہے
اورمَیں چالیس برس سے پیاسی ہوں۔
تمہارے پاس مستقبل دیکھنے کا محدّب شیشہ ہے
اورمَیں آج کے صحرا میں، شاہراہ کی متلاشی ہُوں۔
تمہارے پاس اطمینان کی گہری پتاور ہے
اور میں بے چینی کی دھوپ میں جھلس چکی ہُوں۔
تمہارے پاس شبنم جیسی محبت کے پتوار ہیں
اور میں سمندر میں ڈوبتے شخص کے ہاتھ کی طرح
لحاتی زندگی کی شفق بن کر ظاہر ہوں
تمہاری مُٹھی میں خوابوں کے جگنو چمک رہے ہیں
اور میرے ہاتھوں میں سوئی اُداسی
ہاتھ کی لکیروں کے راستے بدن میں اُترنا چاہتی ہے
تمہارے ہونٹوں کی بہار دستک دے رہی ہے
میرے دل کا بند دروازہ
آندھی بھی نہیں کھول سکی تھی
سیلاب میں بھی نہیں بہا تھا
زلزلے سے بھی نہیں ہلا تھا۔
اعتماد کی خالی چھاگل لیے
تم اس دروازے پہ کب تک کھڑے رہو گے!

○

یہ طبل کا کوچ ہے

(فیض صاحب کے لیے)

زخم نے پھر میرے ہاتھوں پہ حنا باندھی تھی
درد کے کاسنی پازیب بجاتی ہوئی
وحشت میں جنوں پھانکتی
ژولیدہ ہوا کہتی تھی،
خواہش خواب
ہزیمت کا بدن پہنے ہے
سانس کے چمپئی چہرے کی ردا
کھینچے ہے
کوئے لاحاصلی
کھینچے ہے حصارِ فرقت
قافلہ دیکھے ہے سرمایۂ جاں لُٹتا ہے
کیسی ساعت ہے رفاقت کا دیا بجھتا ہے
یہ طبل کُوچ کا ہے
یا کہ ٹھہر جانے کا
یا چراغِ شبِ اُمید کے بُجھ جانے کا

○

بوری میں بند لاش میری تھی

میری آنکھ کھلی جس گھر میں
اس کی اونچی طاق پہ رکھی رحل میں تھا
جزدان میں لپٹا وہ قرآن شریف۔
کہ جس کو صبح سویرے
گھر کے سارے جی اور سارے بچے
خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔
پھر انگریزی پڑھنے، سکولوں کو
بستے لے کے جاتے،
کہیں نہ پاتے
کفر کے فتوے
کہیں نہ پاتے ایسی خبریں۔
پولیس تمہارے گھروں میں گھس کے
تم کو پکڑنے آ جائے گی
میّا روتی رہ جائے گی
میری آنکھ کھلی جس گھر میں
اس کی گلی میں سارے بچے
ایک ہی ماں کے جائے لگتے
ایک ہی آنگن سب گھر لگتے
سب بانہیں عزت بنتی تھیں
سب آنکھیں غیرت بنتی تھیں۔
یہ بھی خبر تھی
انگریزوں کے جاسوسوں نے
بلوہ کرانے کی کوشش میں
خود کو گھائل کر کے
خود ہی شور مچانا عام کیا ہے۔

میری آنکھ کھلی جس گھر میں
اس کے صحن میں صبح سویرے
چڑیوں اور بچوں کی آوازیں
گونجا کرتی تھیں
پھولوں اور باتوں کی خوشبو سے
آنگن مہکے ہوتے تھے۔

میری آنکھ بجھی جس گھر میں
اس میں وقت تعلق
رشتہ، جذبہ کچھ بھی نہ تھا
کوئی دیا اور کوئی دعا
آنچل میں نہ تھی
کوئی ردا اور کوئی صدا
آنگن میں نہ تھی
بس بوری تھی اور میں تھی۔

○

HORSE TRADING

سنو اے بانوئے گفت آشنا نیا قصّہ
سجا ہے اِک نیا بازار اِک نئی منڈی
طلب کرو تو کریں پیش جو بھی حاضر ہے
گھروں کے صحن سے لے کر وطن کی مٹی تک
بنائے بیم ورجا کچھ نہیں فقط زر ہے
بنائے ہستی بے مایہ ضربتِ زر ہے
طلب کرو تو کریں پیش جو بھی حاضر ہے،
ردائے لذّتِ شب، آرزو کی تہہ داری
کسی کی دلربا آغوش کی فسوں سازی
کسی کی خُوں میں نہاتی ہوئی نگہداری،
طلب کرو نئے پیاں کی خوش خبر کے لیے
سلام نسبتِ فردائے منتظر کے لیے
خجل نہ ہو کہ سیاست کی شعلگی ہے یہی
قصیدہ خوانی کی قیمت ہُوا ہی کرتی ہے
عجب نہیں ہے کہ یہ قیمتِ فرومایہ
تمہارے چیختے خوابوں کو زندگی دے دے
زباں کا کیا ہے کہ اس کا کہا تو بدلا ہے
طلب کرو تو کریں پیش جو بھی حاضر ہے
گھروں کے صحن سے لے کر وطن کی مٹی تک۔

○

عدلیہ دری

زمانہ وہ آیا
کہ بالشتیوں نے
تماشہ گروں کو بھی حیراں کیا۔
شاہ سواروں کو نعلوں کی میخوں میں ٹھونکا
وظیفہ بدستوں کو تعویذِ خواہش کی میزان میں
حسبِ منصب فروزاں کیا۔
سولیاں گاڑ دیں صرف ان کے لیے
جن کی گردن کو جھکنے کی تحقیر کی
سگ نژادی کا ملکہ نہ تھا۔

زمانہ وہ آیا
کہ افعی نے ناموس کی خشت رکھی۔
بدلتے رہے فیصلے
جیسے رنگِ طبق
مناجات ہوتی رہیں
صرف ان کے لیے
جو اطاعت کی دہلیز پہ
صف بہ صف، دست بستہ
نمازِ تمنا ادا کرتے کرتے
رکوع میں کھڑے تھے۔

○

طالبان سے قبلہ رو گفتگو

وہ جو بچیوں سے بھی ڈر گئے
وہ جو علم سے بھی گریز پا
کریں ذکر ربِ کریم کا
وہ جو حکم دیتا ہے علم کا
کریں اس کے حکم سے ماورا
یہ منادیاں

نہ کتاب ہو کسی ہاتھ میں
نہ ہی انگلیوں میں قلم رہے
کوئی نام لکھنے کی جا نہ ہو
نہ ہو رسمِ اسمِ زنان کوئی

وہ جو بچیوں سے بھی ڈر گئے
کریں شہر شہر منادیاں
کہ ہر ایک قدِ حیا نما کو
نقاب دو
کہ ایک دل کے سوال کو
یہ جواب دو
نہیں چاہیے
کہ یہ لڑکیاں
اڑیں طائروں کی طرح بلند
نہیں چاہیے
کہ یہ لڑکیاں
کہیں مدرسوں، کہیں دفتروں کا بھی رخ کریں
کوئی شعلہ رو، کوئی باصفا
ہے کوئی تو صحنِ حرم ہی
اس کا مقام ہے
یہی حکم ہے
یہ کلام ہے

وہ جو بچیوں سے بھی ڈر گئے
وہ یہیں کہیں ہیں قریب میں
انہیں دیکھ لو، انہیں جان لو
نہیں ان سے کچھ بھی بعید
شہرِ زوال میں
رکھو حوصلہ، رکھو یہ یقین
کہ جو بچیوں سے بھی ڈر گئے
وہ ہیں کتنے چھوٹے وجود میں
کرو شہر شہر منادیاں
رکھو حوصلہ، رکھو یہ یقیں
کہ جو بچیوں سے بھی ڈر گئے
وہ ہی کتنے چھوٹے وجود ہیں۔

❍

"سیمون اور سارتر کا رشتہ"

(عورت مرد کا رشتہ سے منتخبہ)

کشور ناہید

"اب میں تمہیں اپنے پروں تلے چھپالوں گا" سارتر نے مجھے یہ خبر سناتے ہوئے کہا میں پاس ہوگئی ہوں۔ سارتر کو لڑکیوں سے دوستی مرغوب تھی۔ جب میں نے پہلی مرتبہ سوربونے میں اسے دیکھا تھا، تو وہ ہیٹ پہنے ہوئے ایک لمبی بے تکی خاتون شاگرد سے بات کر رہا تھا۔ جو کہ میری نظر میں خاصی بدشکل خاتون تھی وہ اس سے جلد اکتا کر دوسری خاتون سے جو کہ بہر حال دل کش تھی، اس نے رابطہ قائم کیا یہ الگ بات کہ یہ خاتون اس کے لیے مصیبت ثابت ہوئی اور دونوں کے بہت سخت جھگڑے ہوئے۔ جب ہربوڈ نے سارتر کو میرے بارے میں بتایا تو وہ فوری طور پر مجھ سے تعارف کا طلبگار ہوا۔ اور اب وہ اپنی تحویل میں مجھے پاکر بہت خوش تھا۔ میرا یہ حال تھا کہ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جو عمر سارتر کے بغیر گزری ہے وہ بس ضائع ہوئی ہے۔ زبانی امتحان کے پندرھواڑے کے دوران تو سونے کے وقت کے علاوہ ہم دونوں ایک لمحے کو بھی ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہوئے۔ ہم دونوں امتحان دینے کو بھی سوربونے اکٹھے گئے اور وہاں اپنے ساتھی طلبا کی باتیں بھی اکٹھی سنیں۔ ہم نظاف کے ساتھ گھومنے گئے۔ بلزاک پہ ہم نے اُرون اور پولٹزر کے ساتھ شراب پی تھی۔ آرون تو محکمہ موسمیات اور پولٹزر کمیونسٹ پارٹی سے متعلق ہوگئے تھے۔ عام طور پر ویسے ہم دونوں الگ ہی رہے اور دوستوں سے کم ملتے رہے دریائے سین کے کنارے پرانی کتابوں کے بک سٹال سے سارتر نے میرے لیے "پاردیلان" اور "فنٹومس" کی کاپیاں لا کر دیں کہ اسے ریوری اور فارنیٹر کے خط و کتابت کے مقابلے میں زیادہ پسند تھیں۔ شام کو وہ مجھے کاؤبوائے فلمیں دکھانے لے جاتا، کہ وہ فلمیں دیکھ کر مجھ میں نوآموز کا سا ولولہ پیدا ہوا کہ اس سے پہلے میں مجرد سینما اور فنون سے متعلق فلمیں پسند کرتی تھی۔ ہم لبِ سڑک کیفے میں بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کیا کرتے اور فال سٹاف پہ کاک ٹیل پیا کرتے۔

"وہ کبھی پینا بند نہیں کرتا ہے"۔ ہربوڈ نے مجھے سارتر کے بارے میں بتایا تھا اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ ہر وقت فارمولوں اور مسئلوں پر ہی بحث وتمحیص میں الجھا رہتا تھا۔ اسے خودنمائی کا جنون تھا مگر اس کا دماغ ہر وقت بیدار رہتا تھا۔ کاہلی، غنودگی، فرار، دانشورانہ چالیں، ظاہری صلح اور عزت قسم کے مفروضے، اس کے نزدیک ڈھکوسلے تھے۔ وہ ہر چیز میں لچسپی لیتا تھا مگر کسی چیز کو قطعیت کے ساتھ قبول نہیں کرتا تھا۔ کسی چیز کا سامنا یا مقابلہ کرنا پڑے تو وہ اسے قسمت کا چکر سمجھ کر گول کرنے کی بجائے مقابلہ کرنے اور اس پر ہمہ جہت غور کرنے اور سمجھنے کے بعد ہی چھوڑتا تھا، اس نے کبھی اپنے آپ سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ اسے اس مسئلے کے بارے میں کیا کرنا یا کیا سوچنا چاہیے یا یہ کہ مسئلہ کتنا دلچسپ یا ذہانت آزما ہے۔ وہ سیدھا ایک نکتے کی جانب بڑھتا، حل کرتا اور آگے نکل جاتا۔ اس لیے ان تمام اصحاب کو سارتر سے بڑی مایوسی ہوتی جو کسی مسئلے پر گھنٹوں بات کر کے، بات کو طول دینے ہی میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ کئی سال پہلے کی بات ہے سارتر کی فلسفیانہ ترجیح کو سن کر ریز مین نے کہ جو باروزی کے اظہارِ خیال کی قدرت سے بہت متاثر تھا۔ بڑی افسردگی کے ساتھ کہا تھا۔ "سارتر کی روح تو ہے ہی نہیں۔" اسی سال "درجہ بندی" کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے، سارتر کی بے داغ ایمان داری نے ہمارے صبر کو امتحان میں ڈال دیا تھا مگر لیکچر ختم کرتے ہوئے سارتر نے ہماری سب کی اس موضوع میں دلچسپی کو متوازن کر دیا تھا، اس نے ہمیشہ ایسے لوگوں کے بارے میں چھان بین کی کہ جو نئی بات سے خوفزدہ نہیں معلوم ہوتے تھے۔ ہر چند وہ خود بہت انفرادیت پسند نہیں تھا مگر اس نے کبھی بے حیل و حجت کسی مسئلے پر صاد بھی نہیں کیا تھا اس کی تازگی اور چیز کو پہچاننے کی ہمک نے اشیا کو خوش دلی اور روشن خیالی کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ اتنی وسیع و عریض دنیا کے مقابلے میں میری دنیا کتنی چھوٹی اور بے وقعت معلوم ہوتی تھی۔ بعد ازاں چند دیوانے ہی میرے اندر ایسی جارحیت اور اشیا کے بارے میں ردِعمل کو جگا سکتے تھے کہ جنہیں معلوم ہو کہ گلاب کی پتی بھی دھند میں لپٹے ہوئے مسائل کی طرح ہوتی ہے۔

ہم ہر قسم کے موضوع پر بات کیا کرتے تھے مگر مجھے تمام موضوعات سے زیادہ جس موضوع پہ بات کرنے میں دلچسپی تھی وہ خود میری اپنی ذات تھی۔ جب کبھی دوسرے حضرات نے میری نفسیات کے بارے میں اظہارِ رائے کیا۔ انھوں نے اپنی ذہنی دنیا کی کم مائیگی اور کوتاہ دامنی کے اندر کیا۔ اور یہ بات میرے اندر بددلی پھیلاتی تھی۔ مگر سارتر نے مجھے میرے معاملات و عادات کے حوالے سے میرا تجزیہ کیا اور مجھے میرے نظریات و اقدار کے حوالے سے ہی پہچانا۔ اس نے غیر جذباتی انداز میں جینسکس کے بارے میں میرے خیالات سنے کہ میری جیسی خاتون کہ جس کی پرورش اس طرح ہوئی تھی کہ جو میں آج تھی۔ جس کے لیے شادی سے رہائی حاصل کرنی مشکل تھی۔ مگر سارتر نے تو اس سلسلے میں ایک حرف بھی نہیں کہا۔ بہر حال جو کچھ بھی ہوا میں نے کوشش کی کہ میں اپنے اندر کے بہترین شخص کو محفوظ رکھ سکوں۔ شخصی آزادی کے لیے میرا عشق، زندگی کے لیے میرا جذبہ، میری تجسسانہ طبیعت کا وفور، مصنف ہونے اور بننے کے لیے میرا عزم۔ سارتر نے نہ صرف مجھے ہمت دلائی بلکہ ان عزائم کے حصول میں میری بہت زیادہ مدد بھی کی۔ وہ مجھ سے صرف دو سال بڑا تھا۔ ان دو سال کی بڑائی کو اس نے خوب استعمال کیا اور مجھ سے بہتر اور بہت پہلے فنی زندگی کا خوب صورت آغاز کیا۔ مگر اس نے اپنی اصلی برتری جو مجھ سے محسوس کی اور جو مجھے بھی بن کہے

معلوم ہوگئی تھی۔ وہ اس کی خاموش اور لا انتہا لگن تھی۔ یکے بعد دوسرے کتابیں لکھنے کی۔ ماضی میں مجھے وہ سارے بچے برے لگتے تھے جو کھیل میں پیچھے رہ جاتے تھے اور جو مجھ سے کم لگن کے ساتھ کھیل کرتے تھے۔ اب یہاں ایک ایسا شخص بھی تھا کہ جس کی فنکارانہ جنونیت کے سامنے میرا عزم بے مایہ معلوم ہو رہا تھا۔ درحقیقت میں نے جب خود کو سارتر کے مقابل دیکھا تو اس وقت مجھے اپنے پوشیدہ جذبے بہت ہی ناقابلِ ذکر معلوم ہوئے۔ مجھے احساس تھا کہ میں دنیا میں واحد ایسی شخص ہوں کہ جو زندگی نہیں کرسکتی اگر نہ لکھوں۔ مگر سارتر وہ شخص تھا کہ جو زندہ ہی صرف لکھنے کے لیے رہا۔

سارتر کی مگر کوئی ایسی خواہش نہ تھی کہ وہ ایک پیشہ ورانہ ادیب کی حیثیت سے زندہ رہے۔ اس نے تمام تکلفات اور ادب و آداب کو بالائے طاق رکھا۔ ادبی تحریکوں کو نظر انداز کیا۔ ادیبانہ پیشوں سے منہ موڑا اور زندگی کے تمام مصنوعی مگر اعلیٰ اطوار کو اپنے لیے ناقابلِ برداشت سمجھ کر رد کیا۔ اس کی نظر میں یہ خیال ناقابلِ گرفت تھا کہ وہ پیشہ وارانہ زندگی گزارے۔ اس کے ہم عصر ہوں، افسر ہوں، ماتحت ہوں اس پر قوانین کی بر آری کا فریضہ ہو اور یہ بھی اس کا کام ہو کہ وہ دیگر لوگوں سے قانون کی عمل داری کروائے۔ وہ خاندان کے ضوابط کا نہ انسان تھا اور نہ شادی کرنے کی اس کی کوئی نیت تھی۔ عمر کے تیئسویں سال میں، رومانوی طبیعت کے باوجود، اس کو سفر کرنے کا بہت شوق تھا۔ قسطنطنیہ میں وہ جہاز کے عرشے پہ کام کرنے والے مزدوروں کے ساتھ گپ کرے گا۔ وہ طوائفوں کے ساتھ بیٹھ کر بے تحاشہ شراب پیے گا اور ان غلاموں کے ساتھ زندگی کا لطف لے گا کہ جو غیر مساوی رویوں کے باعث محرومیوں کو ہی اپنا مقدر سمجھتے ہیں۔ وہ ساری دنیا گھومنا چاہے گا، اور بھارت کے برہمن پنڈت، بدھوں کے بھکشو یا نیوفاؤنڈ لینڈ کے مچھیرے۔ کوئی بھی طبقہ یا کیسے بھی لوگ ہوں۔ وہ سب اپنے راز تک سارتر کے ساتھ بات کر کے، بتانا چاہیں گے۔ وہ کہیں بھی قیام پذیر نہیں ہوگا اور کہیں بھی کوئی ملکیت بنا کر نہیں رہے گا۔ یہ التزام اس لیے نہیں کہ وہ خود کو گھومنے پھرنے کے لیے آزاد محسوس کرنا چاہتا ہے بلکہ یہ بتانے کو کہ ملکیت کس قدر فضول اور بے ضرورت پابندیاں ہوتی ہیں، اس کے سارے تجرابات اس کی تحریروں میں بڑے مددگار ثابت ہوئے۔ اگر کوئی تجربات اس کی تخلیقی صلاحیت میں سدِ راہ ہوئے تو وہ ان کو رد کر دیتا۔ میں قطعی طور پر منطقی طریقے پر اس لمحے سارتر کے بارے میں بات کر رہی ہوں۔ میں اس کے حواس کی مجتمع خیزی خطرناک طرزِ زندگی، روح سے بے پرواز زندگی، تمام حجابات سے آگے گزرنے کا عمل اور شوق۔ یعنی شراب، منشیات اور جنسیات۔ سارتر کا خیال تھا کہ اگر فرد کے پاس دنیا کو بتانے اور دکھانے کا کوئی ہنر ہے تو پھر اپنی قوتیں دوسرے پیشوں پہ ضائع کرنا سراسر جرم ہے۔ اس کے خیال میں فن اور ادب پہ لگن کے ساتھ کام کرنا، بذاتِ خود زندگی چاہتے ہیں اور اپنے اندر مکمل ہیں اور ہر چند اس نے نہیں کیا، مگر اس کا مقصود یہی تھا کہ ساری کائنات میں ہمت جہت کاوشِ فن و ادب جاری رہے۔ اس نے مابعدالطبیعاتی مسائل پر بحث میں پڑنے سے گریز کیا۔ وہ سیاسی اور سماجی مسائل میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ وہ نظان سے ہمدردی کرتا تھا مگر اس نے اپنا کام لکھنا اور صرف لکھنا مقدر کیا ہوا تھا۔ اس زمانے میں سارتر کا رویہ انقلابی کے بجائے ایک انارکسٹ کا تھا۔ اس کے خیال میں اس زمانے میں معاشرہ ناقابلِ اعتبار تھا مگر اس نے اسے ناقابلِ اعتبار سمجھنے پہ اعتبار نہ کیا۔ اپنے متضاد اخلاقی اصولوں کے تحت اس نے واضح طور پر تسلیم کیا کہ معاشرے میں بزدل اور عیّار موجود ہیں اور ان کی موجودگی ضروری بھی ہے اور اگر حملہ کرنے اور تباہ کرنے کو مقابل کچھ نہ ہو تو پھر کتابیں لکھنا بے معنی حرکت ہوگی۔

بظاہر چند معمولی اختلافات کے علاوہ، میں نے اپنے اور سارتر کے خیالات اور نظریات میں بڑی ہم آہنگی محسوس کی۔ اس کی خواہشات میں کچھ بھی دنیاوی نہیں تھا۔ سارتر نے مجھے مذہبی لغت استعمال کرنے سے گریز کرنے کو بھی کہا۔ مگر وہ ادب میں اپنی معراج حاصل کرنے کا خواہاں تھا۔ کتابیں اس بدحال غیر ضروری دنیا کو مصنف کے حوالے سے اعتبار اور حیثیت دیتی ہیں۔ ادیب کچھ باتیں بیان کرتا ہے اور جن حوالوں سے وہ بات بیان کرتا ہے اس کے لیے پوری ایمانیت اور جواز پیش کرنے کا پابند بھی ہوتا ہے۔ وہ ابھی نوجوانی کے اس عالم میں تھا کہ جہاں وہ مستقبل کے لیے جذباتی طور پر محسوس کرسکتا تھا کہ ہوا بھی یوں کہ جہاں اس نے تیسرا پیگ مارٹینی کا ختم کیا اور سیکسافون کی دھن سنی۔ اگر ضروری ہوا تو وہ خود کو گمنام رکھے گا۔ بس ضروری یہ ہے کہ اس کے نظریات سے انحراف نہ کیا جائے۔ یہ مطمعِ نظر نہیں کہ اس کی ذاتی کامیابی اس کے لطف کا منبع ہو۔ اس نے کبھی خود کو (میں نے البتہ خود کو کہا ہے) یہ نہیں کہا کہ وہ کوئی خاص شخصیت ہے اور دنیا میں اس کی کوئی قدر و قیمت یا مقام ہے۔ البتہ اس کو یقین تھا کہ اہم سچائیوں میں سب سے اہم خود سچ، اس پر منکشف ہوا ہے اور اس کا مشن یہ ہے کہ دنیا میں دوسروں کو سچ بولنا سکھائے۔ اس نے مجھے جو اپنی نوٹ بک دکھائی اس میں اپنی بات چیت اور یونی ورسٹی کی تحریروں میں بھی اس نے ایک منظم طریقِ فکر کی تلقین کی ہے کہ جس میں سارتر کی انفرادیت اور جامعیت کا اس کے دوستوں نے بھی اعتراف کیا ہے۔ اس نے ایک ''تفتیشی مشن'' کے دوران یونی ورسٹی طلبا کو اپنے نظریے کی ابجد اور حدود بتائی تھیں۔ سارتر کے جواب پر تبصرہ کرتے ہوئے رولنڈ الکس نے اپنے دیباچے میں لکھا تھا کہ سارتر نے بڑی وقیع یادداشتیں ہمیں فراہم کی ہیں۔ ان یادداشتوں کے طویل اقتباسات شائع ہوئے تھے۔ درحقیقت ان کے حوالے سے ایک مکمل فلسفہ سامنے آتا ہے۔ ایک ایسا فلسفہ کہ جس کا ہمارے سرکاری سوربونے میں پڑھانے والے فلاسفروں کے فلسفے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ سارتر نے اپنی نسل کا گزشتہ نسل سے تقابل کرتے ہوئے لکھا تھا ''ہم زیادہ ناخوش ہیں۔ مگر یہ جان کر بہتر حالت میں ہیں۔''

یہ فقرہ پڑھ کر مجھے ہنسی بھی آ گئی تھی۔ مگر جب میں نے سارتر سے بات کی تو پھر مجھے معافی کی وہ دولت ملی جسے سارتر نے ''متفرقات کی تھیوری''

کہا ہے اور جس میں اس کے سارے خیالات کو جو وجودیت ، ضرورت اور آزادی کے بارے میں تھے، مکمل آگاہی ہوجاتی ہے۔اس امر کی مثبت صداقت ملتی تھی کہ سارتر ایک دن فلسفیانہ اہمیت کا قابلِ قدر کام کرے گا۔مگر وہ اپنے لیے آسانیاں پیدا نہیں کررہا تھا کہ اس کا ارادہ روایتی اندازِ فکر پر مبنی کسی قسم کے فلسفے کی تجدیدِ نو نہ تھا۔اس کو سٹینڈل بھی سپنوزا کی طرح پسند تھا۔اس نے فلسفے اور ادب کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنے سے بھی انکار کیا تھا۔ اس کے خیال میں متفرقات کوئی مجرد اشاریہ نہیں تھا بلکہ حقیقی زندگی کی جانب صحیح سمت کا تعین۔ انسانی قلب کو پوشیدہ ناکامی سے آگاہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ فن کی تمام درگاہوں کے راستوں کو یکجا کیا جائے۔اس وقت ایسی کوشش کو دلیرانہ کہا گیا۔ ایسی کوشش کے لیے کسی موجود طریقِ فکر، نظریے، یا طریقِ کار کو ماڈل کے طور پر پیش بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اور چوں کہ سارتر کے نظریات کی جامعیت نے مجھے متاثر کیا تھا۔ میں نے اس کے مضامین کی بوریت اور روکھے پن کو حارج نہ سمجھتے ہوئے، اس کی سچائی کو قبول کرکے یہ مانا کہ سارتر کے پاس نظریہ سازی کا طریق کار ہے'' اردی آرمنیا دیوتاؤں اور ٹیٹانس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ان قدیم فلسفوں کے حوالے سے سارتر کو سمجھنا گویا سارتر کو نہ سمجھنے کے مترادف تھا۔ وہ ان کی خامیوں سے بھی آگاہ تھا مگر اس پر زیادہ فکر مند نہیں ہوتا تھا کہ فوری کامیابی کا کوئی راستہ اس کو مستقبل پہ اندھا دھند اعتماد کا پابند نہیں کرسکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔اس کے سامنے اس کی پوری زندگی تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ آخر وہ سب کچھ ٹھیک کرے گا۔ مجھے اس پر ذرا سا بھی شک نہیں تھا۔اس کی مستعدی اور حسِ مزاح، اس کو ہر مشکل سے نکال لے جاتے تھے۔اس کی خود اعتمادی کا ہر لمحہ اس کے باثمر مستقبل کی تصدیق کرتا تھا۔

میری زندگی میں یہ پہلی مرتبہ ہوا کہ میں نے خود کو ذہنی طور پر کسی سے کم تر محسوس کیا۔ گیرگ اور نوڈئر کہ جو مجھ سے بہت بڑے تھے، انھوں نے اپنے زمانے میں مجھے متاثر کیا تھا۔مگر ان کی ذہنی حاکمیت مجھ پر مسلط نہیں ہوسکی اور میں اپنی بطور شخصیت، تحریری یادداشتوں میں انہیں محفوظ نہ رکھ سکی۔ دن بہ دن اور تمام دن میں نے خود کو سارتر کے مقابل رکھا اور بحث کے دوران اندازہ ہوا کہ میرا قد، سارتر کے برابر نہیں تھا۔ میڈیسی فوارے کے پاس، لکسمبرگ گارڈن میں ایک صبح میں نے سارتر کے لیے ایک ایسی کثرتی اخلاقیات کا ڈھانچہ پیش کیا کہ جس میں ان لوگوں کو شامل کرنا چاہتی تھی جن کو کہ میں پسند کرتی تھی، مگر ان کو سارتر کا ہم پلہ نہیں سمجھتی تھی۔ سارتر نے یہ بات سنی اور مسترد کردی۔ مگر میں نے اپنے نظریے کو برقرار رکھا کہ اسی حوالے سے میں اپنے تئیں اچھے اور بُرے میں تمیز کرسکتی تھی۔ میں نے اس سلسلے میں سارتر سے تین گھنٹے بات چیت کی اور آخر مجھے شکست ہوئی۔ اسی بحث کے دوران مجھے اندازہ ہوا کہ میرے بہت سے مفروضات اور تعصّبات غیر یقینی کیفیت اور جلدی میں مدون کیے گئے نظریات پر مبنی تھے اور میرے جوازات خام اور قدرے مبہم تھے۔'' مجھے ابھی قطعی اعتبار نہیں کہ میں کیا سوچتی ہوں اور کیا میرے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ میں سوچتی بھی ہوں'' میں نے آخر کو اپنے بارے میں متفکرانہ طور پر خود کلامی کی۔ میرا تجسس اب میرے افتخار سے بڑھ کر تھا۔ مجھے ظاہر کرنے سے زیادہ سیکھنے کا سلیقہ آیا مگر اتنے سالوں کی خود نگر تنہائی کے بعد، یہ بڑی متفکرانہ بات واضح ہوئی تھی کہ میں صرف ایک فرد واحد نہ تھی بلکہ بہت سے مجھ جیسے ہیں کہ جو اپنی صلاحیتوں کے بارے میں غیر یقینی اندازے رکھتے ہیں۔ سارتر ہی صرف ایسا فرد نہیں تھا جس نے مجھے اپنے بارے میں رائے زیادہ سنجیدگی اور تحمل سے قبول کرنے کی تلقین کی۔ نظان، آرون اور پولٹسزر، سب ہی مجھ سے زیادہ ترقی پسند لوگ تھے۔ میں نے دھرا مقابلے کا امتحان دینے کی تیاری کی تھی۔ ان کی تہذیب میں میری تہذیب سے زیادہ گہرائی تھی وہ بہت سی ایسی نئی چیزوں سے واقف تھے کہ جن سے میں بالکل ناواقف تھی اور وہ بحث مباحثے کے بھی عادی تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میں طریق کار اور رہنما اصولوں سے ناواقف تھی۔ میرے خیال میں دانشوروں کی دنیا خیالات کا جھمیلا تھی کہ جس میں، میں نے خود کو اندھا دھند داخل کرلیا تھا۔ مگر میرے ساتھیوں اور دوستوں کے رہنما اصول واضح اور متعین تھے۔ ان لوگوں کے درمیان اختلافاتِ رائے بھی تھا۔ آرون کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ برنزوگ کے تصورات کا پرستار تھا۔ مگر ان سب نے بنیادی طور پر، بہت کچھ واضح کرلیا تھا جب کہ میں خدا کے وجود سے انکار اور ان کے فلسفے کو مسترد کرنے کے نتائج ہی مرتب کررہی تھی، ایک اور بات کہ جو مجھے ان لوگوں کی اچھی لگی کہ وہ یہ جانتے تھے کہ انہیں کون کون سی اور کس طرح کی کتابیں لکھنی ہیں۔ میں تو بالکل واضح نصب العین کے ساتھ گئی تھی کہ ''میں سب کچھ بتادوں گی'' ظاہر ہے کہ ایسا سوچنا کچھ زیادتی بھی تھی اور کچھ بے معنویت بھی۔ مجھے یہ جان کر بھی بڑا اچنبھا ہوا کہ ناول سے تو بڑے ایسے مسائل پیدا ہوجاتے ہیں کہ جن کے بارے میں آپ کو شبہ تک نہیں ہوتا ہے۔

مگر میں نے ہمت نہیں ہاری۔ ہاں لگا کہ مستقبل، اندازے سے بھی زیادہ مشکل ہوگا مگر مستقبل زیادہ یقینی اور زیادہ واضح ہوگیا تھا۔ بجائے نامعلوم ممکنات کے، میں نے اپنے سامنے کام کرنے کے لیے واضح راستہ دیکھا کہ جو اپنے مسائل، محنت، مواد، ذرائع اور غیر لچکیلی ہیئت کے باوجود، دعوتِ عمل دیتا تھا۔ میں نے خود سے نہیں پوچھا کہ میں کیا کروں گی، ہر مقام اور ہر چیز کام کی دعوت دیتی تھی کہ جس کو کرنے کی جستجو میں، میں بیتاب تھی کہ کس طرح اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کروں، سچ کو ڈھونڈوں اور لوگوں کو بتاؤں تا کہ دنیا کو بدلنے میں لوگوں کی مدد کرسکوں۔ مجھے وقت کی ضرورت ہوگی اور اس مسئلے پر زیادہ محنت کی کہ میرا نصب العین حاصل ہوجائے۔ اس کا مطلب اپنے آپ سے کیے ہوئے وعدوں میں سے، بہت تھوڑے حصے کی بازیافت ہوسکتا ہے مگر مجھے اس نکتے نے بھی ہراساں نہیں کیا کہ کچھ نہیں ہوا تھا اور ابھی سب کچھ کرنے کے امکانات واضح اور مثبت تھے۔

باقی صفحہ نمبر ۶۸ پر ملاحظہ کیجیے

''لیلا خالد''

(لیلا خالد کی خودنوشت کے ترجمہ کا پہلا باب)

کشور ناہید

میرا تعلق حیفا سے ہے مگر مجھے اپنی جائے پیدائش بہت کم یاد ہے۔ میرے ذہن میں وہ جگہ محفوظ ہے کہ جہاں میں ایک چھوٹی سی بچی کی حیثیت سے کھیلتی تھی۔ گھر بھر میں مجھے صرف زینہ یاد ہے میں جب چار سال کی تھی تو مجھے حیفا سے باہر لے جایا گیا تھا کہ ایک عمر تک اپنے آبائی شہر کو دیکھنے کو ترسوں۔ آخر میں ۲۱ سال بعد ۲۹ اگست ۱۹۶۹ کو میں نے دوبارہ حیفا کو دیکھا جب کہ میں اور کامریڈ سلیم عیساوی نے ایک سامراجی جہاز پر قبضہ کر کے فلسطین آئے تاکہ دشمنوں کے قبضے میں دبے ملک کو خراج عقیدت پیش کر سکیں، اور یہ بھی اس پر واضح کر سکیں کہ ہم نے اپنے آبائی وطن کو فراموش نہیں کیا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ کمزور اسرائیلی دشمن نے ہمیں امریکی اور فرانسیسی جہازوں کے دستوں کے درمیان پابند کیے ہماری سرزمین پر اتارا۔

حیفا کے بارے میں مجھے اپنے دوستوں، والدین اور کتابوں کے ذریعہ ہی علم تھا۔ اب میں نے خلا ہی میں اپنی سرزمین کی رنگت کو محسوس کیا اور اپنے آبائی وطن کے بارے میں خیالوں کی پرچھائیاں مرتب کیں۔ حیفا کو پہاڑوں کی عافیت، سمندروں کا وصال اور میدانوں کی وسعت کا قرب نصیب ہوا ہے۔ دھوپ کی سنہری ڈلی اسی زمین پہ اپنا حسن ارزاں کرتی ہے۔ مگر مجھے اس دھوپ کو دیکھنے، اس ہوا کے ساتھ سانس لینے کا اختیار نہیں ہے۔ یورپی یہودی اور ان کے ساتھی اسلحہ کے بل پر اس زمین پر قابض ہیں اور ہمیں بے دخل کیا ہوا ہے۔ ہم خانہ بدوش ہیں، جلا وطن ہیں۔ اور وہ غاصب ہوتے ہوئے بھی مالک بنے ہوئے ہیں۔ وہ میرے شہر میں اس لیے رہ رہے ہیں کہ اول تو وہ یہودی ہیں اور دوسرے طاقت ان کے ساتھ ہے اور ہم فلسطینی عرب، نہتے اور بغیر اسلحہ کے ہیں۔ مگر صحرا کے بیٹے ہمارے سپوت، اس عزم کے ساتھ زندہ ہیں کہ ہم قوت بھی حاصل کریں گے اور فلسطین بھی کہ پھر اسے عربوں کے لیے انسانی جنت اور آزادی کے جیالوں کے لیے مثالی سرزمین بنائیں گے۔

مجھے اپنے خاندان اور تمام فلسطینیوں کی طرح حیفا پسند ہے۔ شروع شروع میں حیفا کے لیے میرا عشق جذباتی تھا، جیسا کہ خواب ناک سرزمین کے لیے بچے کے جذبات ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے میں بڑی ہوتی گئی اپنے بارے میں سوچ اور علم بڑھتا گیا مجھے علم ہوا کہ میری تو تاریخی جڑیں ہیں۔ اور میرے لوگوں کی تو جدوجہد سے بھرپور تاریخ اور میری قوم، اگر دوسری قوموں سے برتر نہیں تو مساوی حیثیت ضرور رکھتی ہے۔ مجھے یہ بھی یقینِ واثق ہوا کہ میرے طبقے کے لوگ اور کارکن، بے کار، مہاجر اور استحصال کا شکار لوگ ہی پوری قوم کو قدامت کی پستی سے نکال کر جبر سے آزاد کرا سکتے ہیں۔ مجھے سکول میں جو کچھ پڑھایا گیا تھا، مجھے وہ فراموش کر کے آگے بڑھنا تھا۔ پڑھایا تو یہ گیا کہ ہماری کوئی تاریخ نہیں ہے کہ فلسطینی کوئی قوم کوئی عرب نسل لوگ نہیں ہیں۔ علم کی جستجو مجھے اس محاکے پہ لے آئی جہاں مجھے علم ہوا کہ خود ساختہ مورخوں نے کس طرح ہمارے کردار، ہماری قابلِ ذکر شہادتوں اور کارناموں کو نفی میں بدل کر ہماری تکذیب کی ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ مجھے تاریخ میں اہم کردار ادا کرنا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میرا ناقابلِ گریز کردار، جارح اور مظلوم کے درمیان لڑائی میں قابلِ فیصلہ مقام کی تلاش تھی۔ میں اپنے عوام اور خود اپنی ذات کو آزاد کرانے کے لیے انقلابی بن گئی۔

میں دراصل ۱۹۳۰ء کے ایک فلسطینی انقلابی سے بہت متاثر تھی۔ از دیں کسم جس نے عرب میں سب سے پہلی کوشش، باضابطہ اور منظم طریقے پر مزدور اور کاشتکار کے انقلاب کو روبہ عمل لانے کی۔ اس سلسلے میں وہ عرصہ دراز تک خفیہ کارگزاری میں مصروف رہے۔ ۱۹۳۵ء میں لوگوں کی مسلسل غدّاری اور نصب العین سے غفلت کو دیکھتے ہوئے انہوں نے مسلح جدوجہد کا آغاز کیا۔ یہ جدوجہد برطانوی سامراج یہودیت اور عرب قدامت پرستی کے خلاف تھی۔ انقلابیوں میں مزدور، کسان اور طلبہ اور دوسرے ترقی پسند لوگ شامل تھے۔ بغاوت، مظلوموں کی بغاوت کہ برطانوی سامراج نے یہودیوں اور عرب رجعت پسندوں کی مدد سے فلسطینیوں کو محکوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۹ء کے درمیان فلسطین پر یہودیوں کا قبضہ ہو گیا جب کہ مؤرخ اسے ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۸ء کے درمیان کی بات قرار دیتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں کسان کی ہڑتال۔ اپریل سے اکتوبر تک جاری رہی۔ مقصد یہ تھا کہ فلسطین اور عرب، شناخت کے مراحل کو مستحکم کر کے جمہوری اقدار کے فروغ کی کوشش کی جائے۔ اور یوں فلسطین سے یہودی نقل مکانی کرنے والوں اور برطانوی آلہ کار لوگوں کو باہر نکال دیا جائے۔ نتیجہ وہی ہوا جو سامراجی چاہتے تھے، رائل کمیشن ۱۹۳۷ء میں قائم ہوا جس نے فلسطین کی تقسیم کا منصوبہ پیش کیا۔ فلسطین کی مدافعت ایک کمیٹی نے کی۔ جس کی سربراہی شاہ عبداللہ اور برطانوی کر رہے تھے۔ منصوبے کو تسلیم کر لیا۔ انقلابی تحریک یوں اور زور پکڑ گئی مگر خود فلسطینی غدّاروں کے ہاتھوں کہ جن کی پشت پناہی عرب حکومت کے معتمدین اور برطانوی یہودی فوجی شاطر کر رہے تھے۔ یہ تحریک پسپا ہوئی کسم شہید کر دیے گئے۔ یہ یقین پختہ ہوا کہ انقلاب بہر حال اس علاقے کا مقدر ہے۔ مگر دشمنوں نے انقلاب کا سورج فی الوقت غروب کر دیا اور کسم کی کردار کشی کی مذموم حرکت کی گئی، فلسطین کی آزادی کا پاپولر فرنٹ کسم کی شہادت کے بعد وجود میں آیا۔ اس کی نسل نے انقلاب کا آغاز کیا تھا اور

میری نسل انقلاب کو مکمل کرے گی۔

میں نے ۱۹۳۶ء رستخیز کی کہانی زیادہ تر کتابوں میں پڑھی مگر میں اپنے ذاتی تجربات کے حوالے سے ۱۹۴۸ء سے اپنے لوگوں کی زندگیوں کی تلخیوں سے آگاہ ہوں۔ میں نے ۱۳؍اپریل ۱۹۴۸ء کو اپنی چوتھی سالگرہ کے صرف چار روز بعد حیفا کو خیرباد کہا۔ میری سالگرہ نہیں منائی گئی کہ ۹؍اپریل کو فلسطین میں یوم ماتم تھا۔ اب میں ۲۹ برس کی ہوں۔ میں نے آج تک اپنی کوئی سالگرہ نہیں منائی اور اس دن تک نہیں مناؤں گی جب تک میں حیفا پھر واپس نہیں چلی جاتی کہ میں نے حیفا کو اپنی خواہش سے نہیں چھوڑا تھا۔ یہ فیصلہ میرے خاندان نے نہیں بلکہ ان لوگوں نے کیا تھا جو میری اور میرے بھائیوں کی نسل کشی کا آلۂ کار بنے۔

میرے خاندان کے یہودی ہمسایوں سے خوشگوار تعلقات تھے۔ ہم سٹین ٹون سٹریٹ میں رہتے تھے کہ جو یہودی کوارٹر صدر سے بہت قریب تھے۔ یہ علاقہ حیفا کے فیشن ایبل پانچویں ایونیو میں شمار ہوتا تھا۔ میری یہودی بچوں سے شناسائی تھی میری سب سے اچھی سہیلی تمارا یہودن تھی مگر اس وقت ہمارے درمیان کوئی امتیاز نہ تھا، مجھے عرب اور یہودی کے فرق کا علم نہ تھا۔ میرے اور تمارا کے تعلقات میں تبدیلی کا موڑ تو ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو آیا، جب اقوام متحدہ نے فلسطین کو تقسیم کر کے مجھے اور تمارا کو الگ الگ کر دیا۔ تمارا کے حصے میں ۵۶ فیصد علاقہ آیا۔ (جبکہ یہودیوں نے اپنے اعداد و شمار کے مطابق صرف ۸ فیصد علاقے کا مطالبہ کیا تھا) مجھ سے یہ توقع تھی کہ میں اس مطالبے کو مان لوں گی، اور تمارا کے ہم نسلوں کو مبارکباد پیش کروں گی۔ مجھ سے میری انسانیت کے افکار اور یہودیوں کی اخلاقی قانونی حیثیت کو تسلیم کرنے اور خود کو اپنے ہی گھر میں اور اپنی ہی سرزمین پر مہاجر تسلیم کرنے کو کہا جا رہا تھا۔ عالمی یہودیت امریکی سامراجیت اور ان کے حواریوں نے میرے عرب ہونے کی بناء پر میرے لیے جلاوطنی کی زندگی مقدر کی۔ پھر ان کا مطالبہ تھا کہ ان کا یہ فیصلہ ہم مانیں بھی کہ ہمارا تسلیم کرنا گویا یہودی مطالبے کو حقیقی اور ان کی توسیع پسندی کو مکمل کرے گا۔ اور ان کے ہجرت کرنے والے ایک دفعہ آ کر آباد ہو جائیں تو یوں معاملات باقاعدہ طے پا جائیں گے۔

اقوام متحدہ کے فلسطین کو تقسیم کرنے کے منصوبے کے اعلان پر تین روزہ عام ہڑتال ہوئی مگر یہ ہڑتال قطعی بے اثر تھی۔ عرب قومی تحریک قطعی ختم ہو چکی تھی۔ اس کا محض جن باقی تھا کہ جو غیر منظم اور جذباتی ریوڑ سے زیادہ نہ تھا۔ روایتی ادارے مضبوط ہو چکے تھے۔ کارکنوں اور کسانوں کی نئی تنظیمیں اتنی پختہ کار نہیں ہوئی تھیں کہ قومی آزادی کے عظیم کام اور مقصد کی غایت کو پورا کر سکیں۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا، عرب یہودیوں کو مار رہے تھے، یہودی، عربوں پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ البتہ یہودیوں کی جارحیت منظم اور بامقصد تھی جبکہ عربوں کی جارحیت انفرادی اور غیر منظم تھی۔ یہودیوں کے پاس لڑنے والے بھی تھے اور اسلحہ بھی۔ ان کی مسلح افواج بھی تھی۔ اور نفسیاتی طریق جنگ سے وہ آشنا بھی تھے۔ اس لیے یہودی ہم سے حیفا چھیننے میں کامیاب ہو گئے۔ عربوں کے کمانڈر سرجان گلب پاشا کہ جن کا تعلق اردن سے تھا، نے اپنی حیفا رجمنٹ کو حیفا خالی کرنے کا حکم دیا کہ یہ حکم برطانوی منصوبے کی مطابقت میں حیفا کو خالی کرنے اور یہودی فتح کو مکمل کرنے کی جانب قدم تھا۔

تنظیم کے ہونے اور دفاعی سوج بوجھ کے باعث، یہودیوں کو اندازہ ہوا کہ کم وقت محنت اور افراد صرف کر کے، وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ حیفا کے ۸۰ ہزار عرب اپنی جان کی حفاظت کو مقدم سمجھتے ہوئے شہر خالی کر آئے۔ یہ انخلاء ۹؍اپریل یعنی میری سالگرہ کے دن شروع ہوا۔ یہودیوں نے دیر یاسین کے لوگوں کا سفاکانہ قتلِ عام کیا۔ یہ وہ بہیمانہ جرم تھا کہ جس نے یہودی سفاکیت کو واضح اور عربوں کو بے چوں و چرا شہر سے رخصت ہونے پر مجبور کیا۔

حیفا کی سرزمین پر ۲۵۴؍افراد کا قتل اور سینکڑوں عربوں کے زخمی ہونے کا نذرانہ دیا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ ابھی اور لوگوں کا قتل بھی ہوگا۔ سارے شہر میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ دو دن بعد یہ ہراس میرے سامنے بھی مجسم ہوا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ موت دیکھی۔ مجھے یاد نہیں میرے سامنے مرنے والا یہودی تھا کہ عرب مجھے صرف بم کا دھماکہ اور مرنے والے کے پیٹ سے بم لگنے کے باعث خون کا ابلنا یاد ہے۔ میں سیڑھیوں کے نیچے چھپ گئی اور گلی میں پڑی لاش کو گھورتی رہی۔ میں یہ سوچ کر خوفزدہ ہو رہی تھی کہ کیا میرے باپ کا مقدر بھی یہی موت ہے۔

خوف و ہراس کے اس ماحول نے ہمارے خاندان کو بھی نقل مکانی پر مجبور کر دیا۔ ہم سب آٹھ تھے۔ ۱۳؍اپریل ۱۹۴۸ء کو ہم سَور کی جانب روانہ ہو گئے مجھے کسی نے نہیں بتایا کہ ہم کیوں جا رہے ہیں، اور نہ میری سمجھ ہی میں آیا۔ اماں نے کرائے کی ایک گاڑی میں ہمیں اور کچھ سامان کو لاد کر بے ہوشی کے عالم میں روانہ کر دیا۔ ذرا آگے گئے تو پتہ چلا کہ ہم میں سے ایک کم تھا، چیخ و پکار مچی، یہ میں تھی کہ جس کا کسی کو پتہ نہیں چل رہا تھا۔ بڑی دیر بعد میری دو بہنوں نے مجھے کھجوروں کے ڈبے کے پیچھے چھپے ہوئے دیکھ لیا۔ اور آلوؤں کے تھیلے کی طرح مجھے گرد سے دبوچ کر ماں کے سامنے پیش کیا۔ جنہوں نے چلا کر کہا: اگر تم نہیں آئیں تو یہودی تمہیں مار ڈالیں گے۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے میرے بال بھی کھینچے۔ میں بہت ناراض تھی اور اب بھی نہیں جانتی تھی، کہ آخر ہم حیفا چھوڑ کر سَور کیوں جا رہے ہیں، میرے والد نے سب کو آنسو بھری آنکھوں سے الوداع کہا اور وہ وہیں رہ گئے، مجھے یاد ہے سفر کے آغاز سے دھندلا ہونے تک، میری آنکھوں میں بس ایک چیز تھی، اپنے گھر کی سیڑھیاں۔

میں کئی ماہ تک اپنے باپ سے نہیں ملی۔ جب وہ سَور آئے تو بالکل پژمردہ تھے۔ وہ کسی قیمت پر حیفا چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر حیفا کے یہودیوں کے قبضے کے فوراً بعد ۲۲؍اپریل کو ابا کو بزنس اور حیفا دونوں کو چھوڑنا پڑا۔ پھر انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ یہودی ہمارے گھر میں داخل ہو رہے تھے۔ پھر انہوں

نے دیکھا کہ ہمارے گھر کا فرنیچر کہیں لے جایا جا رہا تھا۔اب ابا کو مصر منتقل کر دیا گیا۔

تین چار ماہ مصر میں اور دیگر جگہوں پر خوار ہونے کے بعد یہ وقت تمام خوار وزبوں اور کوڑی کوڑی کو محتاج ابا آخر کو سُور پہنچ گئے۔تیس سال تک سٹور کیپر کی حیثیت سے شبانہ روز کام کرنے والا پیسے پیسے کو محتاج تھا۔وہ اس بات پر بھی بہت افسردہ تھے کہ لبنان کی شہریت ان کو نہیں ملی تھی۔وہ ۱۹۶۶ء یعنی اپنی وفات کے وقت تک لبنان میں جلا وطن کی حیثیت سے رہے، ۱۸ سال تک وہ حیفا واپس جانے کے خواب کے ساتھ زندہ رہے ہیں۔اپنے باپ کی بیٹی کی حیثیت سے، اپنے باپ کا خواب شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتی ہوں۔میں اپنے باپ اور قوم کے خوابوں کو نابود نہیں ہونے دوں گی۔اگر میں فلسطین جانے اور آزاد فلسطین میں رہنے تک زندہ نہیں رہوں گی تو میری اولاد یقیناً وہ زمانہ دیکھے گی۔

مغربی مورخین اور محققین یہ لکھتے ہیں کہ حیفا کے لوگ، یہودی میئر کے اس اعلان کے باوجود کہ باہمی اعتماد اور افہام و تفہیم سے دونوں نسل کے لوگ رہیں گے۔عربوں نے حیفا سے نقل مکانی کی۔فرض کر لیجے کہ اگر میئر کا اعلان خلوص پر مبنی ہوتا تو کیا وہ کشت و خون رکوا سکتا تھا۔اور کیا عربوں کو زک پہنچانے کے مذموم ارادوں میں کمی آ سکتی تھی، اگر ایسا ممکن تھا تو میرے بھائیوں کا قتل اور میری بہنوں کی عصمت دری کیوں ہوئی؟ اگر ایسا ممکن تھا تو ''معصوم'' برطانوی حکام نے سینکڑوں چھوٹی کشتیاں کیوں فراہم کیں کہ حیفا سے سُور تک فلسطینیوں کو لے جایا جا سکے۔اگر ہم رضا کارانہ طور پر گھروں کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔تو آخر کون سی مجبوری تھی کہ جس کے تحت یہودیوں نے ہماری املاک، مال و اسباب اور ہر قابلِ ذکر چیز پہ قبضہ کر لیا۔یہ وہ سوالات ہیں کہ جن کا جواب ہر قابلِ عزت یہودی اور اسی مورخ کو تلاش کرنا ہو گا کہ جسے اپنے لفظوں کی حرمت کا اعتبار ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عربوں کا مقصود یہ تھا کہ حیفا پر دوبارہ قبضہ کیا جائے یہودیوں کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا جائے اور اس مقصد کے لیے عرب ملکوں نے کوئی بیس ہزار نفوس کی افواج کو منظم بھی کیا۔مگر وہ باقاعدہ تربیت یافتہ تھیں نہ ان کے پاس جدید ہتھیار تھے، جب کہ ان کے مقابلے میں ساٹھ ہزار تربیت یافتہ یہودی تھے۔عربوں کی کوئی مرکزی قیادت اور کوئی اخلاقی تحریک نہ تھی۔اگر کوئی کارنامہ ہو جاتا تو یہ اجتماعی نہیں بلکہ انفرادی عمل ہوتا۔ان کے بقول:

''عرب افواج تو مردہ سماجی ڈھانچے کی قربانی دینے کی طرح تھیں کہ جو جدید تربیت یافتہ دشمن کے مقابل ایک ریوڑ کی طرح دھکیل دی جاتی تھیں۔اب بھی باور کیا جاتا تھا کہ وہ جیت جائیں گے۔عربوں کا یوں حملہ آور ہونا، اقوام متحدہ کے پیدا کردہ فلسطین کے مسئلے کو زندہ رکھنا تھا۔اور یوں عرب بادشاہ اور اس کے لواحقین کی امداد سے بقیہ فلسطین کو اردن میں شامل کرنے کا قطعی جواز بنتا تھا۔عربوں کی مداخلت نے یہودیوں کو ناقابلِ تسخیر ہونے کا اعتماد بھی دیا۔

بقیہ:

علاج حرف شناس

تاریخی، جبلی اور نفسیاتی مسائل اور محرکات سے پیدا ہوئی ہے اور جب تک ہم اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کریں گے اکبر اور اقبال کے اشعار ہم کتنے ہی پڑھ لیں یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا۔

کشور ناہید کا ترجمہ رواں، سادہ اور دلچسپ ہے اب اس کتاب کو ایک بار پڑھنا شروع کر دیں تو اسے ختم کیے بغیر نہیں رکھیں گے چونکہ اصل کتاب میرے سامنے نہیں ہے اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ کشور ناہید نے اصل کی پاس بندی کہاں تک کی ہے اور آزاد ترجمہ سے کہاں تک کام لیا ہے مگر کتاب اپنی موجودہ صورت میں اتنی جاذبِ توجہ ہے کہ اگر کشور ناہید نے اصل سے انحراف بھی کیا ہے تو اس سے کتاب کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔عورت کا نام سُن کر لاحول پڑھنے والے بزرگ بھی اگر کتاب کو پڑھیں گے تو اس سے کچھ نہ کچھ سیکھیں ہی گے۔

☆

۔ بقیہ ۔

سیمون اور سارتر

اور اب مجھے ایک بہت بڑا موقع بھی ملا تھا، مستقبل صرف میرے سامنے چیلنج بن کے نہیں کھڑا تھا۔اب تک میرے پسندیدہ دانشور جیسکس اور کچھ کم حیثیت میں ہر بوڈ۔ مجھ سے ذرا مختلف تھے۔غیر متعلق تبدیلی کے قائل، غیر منظم اور ایک طرح سے مہلکانہ مسحوریت کے مارے ہوئے تھے۔ان کے ساتھ تبادلۂ خیالات، بغیر کسی نظریاتی تحفظات کے، ممکن نہ تھا، سارتر نے ان خواب پرست ساتھیوں کے ساتھ صحیح مکالمہ کیا۔میں پندرہ سال کی عمر سے ایسے مکالمے کے لیے ترس رہی تھی۔وہ مجھ سے دوگنا تھا کہ جس میں میں نے اپنی ساری پیاس اور ترسیدہ امنگیں اپنی منتہا کو چھوتی محسوس کیں۔مجھے لگا کہ مجھے زندگی کا ہر ذائقہ اس کے ساتھ چکھنا اور لینا چاہیے۔جب میں اگست کے شروع میں سے جدا ہوئی، تو مجھے معلوم تھا کہ وہ شخص میری زندگی سے کبھی باہر نہیں جائے گا۔''

☆

Circumcision

(آجاؤافریقہ سے منتخبہ)

کشور ناہید

میرے لیے کانفرنس کے زیادہ تر موضوع جانے پہچانے تھے۔ ان پر میں بھی بہت دفعہ لکھ چکی تھی۔ اور ساری دنیا کی عورتوں کے خیالات پڑھتی رہتی تھی۔ جہاں کہیں موقع ملتا ملاقات کا۔ وہاں دیگر باشعور عورتوں سے عورت کی پسماندگی کے موضوع پر تبادلۂ خیالات بھی ہوتا تھا۔ مگر ایک موضوع جس پر میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ جو میرے لیے بالکل نیا، اجنبی اور غیر مانوس تھا، جس کے بارے میں کہانیاں سُنی تھیں، واقعات کا علم نہ تھا۔ وہ تھا عورت کے ختنے کا۔

کانفرنس کے دوران یہ موضوع بہت زیر بحث رہا۔ افریقی خواتین نے اس کے خلاف احتجاجی پلے کارڈ، احتجاجی پمفلٹ، پوسٹرز، اور ایک باقاعدہ سیشن کا اہتمام کیا تھا۔ یوں تو ہمارے علم میں بھی تھا کہ پاکستان کے شمالی علاقوں میں ایسی رسم ہوتی ہے۔ مگر یہ معلوم نہ تھا کہ افریقہ میں تو مصر سے شروع ہو کر، مالی، سینیگال، مصر، سوڈان، صومالیہ سے لے کر کینیا تک، تمام ملکوں کی خواتین، عورتوں کی سرکم سیژن کی رسم کے خلاف تقریریں کرتے ہوئے، اسے بربریت اور مرد کے ظلم کی منہ بولتی تصویر کہہ رہی تھیں۔

ان علاقوں میں کہ جس نے خلیج کے ممالک بھی افریقی ممالک کے علاوہ شامل ہیں۔ لاکھوں، کروڑوں عورتوں کو اس عذاب سے گزرنے کی سزا کو قانون اور لازمی رواج کے طور پر اپنایا ہوا ہے۔ مسلم مذہب کے لوگ اس رواج کو سنت کے طور پر کرتے ہیں۔ عورتوں کے ختنے کے اس طریق کار کو انگریزی میں چار ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔

Circumcision, excision, infibulation, intermediate

چند ممالک یعنی مغربی نائجیر یا وغیرہ میں بس شادی سے پہلے اس عمل کو دھرایا جاتا ہے۔ مگر زیادہ ممالک میں یہ عمل سات سال کی عمر ہی میں کیا جاتا ہے۔ تین خواتین متعلقہ لڑکی کو سٹول پہ بٹھا کر، اس کے ہاتھ پیچھے کس کر پکڑ لیتی ہیں، ایک عورت اس کی گردن میں ہاتھ ڈال لیتی ہے۔ سامنے کلمہ پڑھتے ہوئے پیشہ ور دائی نائن رسم سرانجام دیتی ہے۔ اس رسم کے بعد دیہاتوں میں خیرات کے طور پر مکئی دی جاتی ہے اور شہروں میں انڈے۔ یہ عمل پندرہ بیس منٹ جاری رہتا ہے پھر لڑکی چیخ چیخ کر ادھ موئی ہو جاتی ہے۔ اور یوں نڈھال بستر پر لٹا دی جاتی ہے۔ اگر دائی بہت بوڑھی ہو یا پھر لڑکی تکلیف میں بہت ہلے جُلے تو زخم اور بھی گہرا اور دوسری جگہوں پر بھی خطرناک زخم لگ سکتا ہے۔ اس لیے ختنوں کے بعد پیشاب رکنے۔ ماہواری کے خون میں گڑبڑ ہونے اور یوں زہریلا مادہ اندر پھیلنے کے امکانات رہتے ہیں۔ یہ بھی امکان ہوتا ہے کہ جنسی تحرک کے غدود بھی متاثر یا زخمی ہو جائیں۔ ایسی صورت حال کے پیشِ نظر، اب مسلم ممالک میں خواتین کے ختنے کے امتناع کا قانون نافذ کیا جا رہا ہے۔ اور سوڈان میں تو ۱۹۷۴ء میں باقاعدہ اس عمل کو ممنوع قرار دیا جا چکا ہے۔ اسی طرح مصر میں ۱۹۵۹ء میں اور ۱۹۷۸ء میں صومالیہ میں، خواتین کی انجمنوں کے تعاون سے ایسے قوانین عمل میں لائے گئے ہیں۔ اسی طرح ایتھوپیا اور نائجیریا، کینیا، اور مالی میں عورتوں کی انجمنیں، امتناع کے قوانین کے نفاذ کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔ ان کوششوں کے پیچھے عورتوں کے ساتھ پاکیزگی کے نام پر اس بربریت کے خاتمے کے علاوہ، یہ فلسفہ بھی ہے کہ:

۱۔ اب تک عورت کے جسم اور جنس کے فلسفے کو مرد کی لذت اور نظریے کے مطابق تسلیم و ترتیب دیا گیا ہے۔

۲۔ جن ممالک میں یہ رسم رائج ہے۔ وہاں بوڑھی دائیوں، نائنوں کے لیے یہ ہی آمدنی کا اہم ذریعہ ہے۔ اور وہ تہذیب اور ثقافت کے نام پر اس رسم کو جاری رکھنے کی کوششوں میں مصروف رہتی ہیں۔

۳۔ زیادہ تر مائیں، اپنی ذمہ داری اور نگہداشت کی صعوبت سے بچنے کے لیے، اس رسم کو جاری رکھنے کو ہی غنیمت خیال کرتی ہیں۔

۴۔ چونکہ اس رسم کے باعث ہونے والے نسوانی نقصانات کی نہ فہرست کبھی بنائی گئی اور نہ کبھی اندازہ کیا گیا کہ یوں عورت کو کتنا نقصان پہنچتا ہے۔ اسی لیے لوگوں کو اعداد و شمار کے ساتھ قائل کرنے کے لیے باقاعدہ مواد دستیاب نہیں ہے۔

۵۔ اب تک جن مغربی ذرائع نے اس کے خلاف پراپیگنڈہ کیا۔ وہ مغربی استعماریت سے نفرت کے باعث، مقامی تہذیب و ثقافت کے خلاف عمل سمجھا گیا۔ اس لیے موجودہ روایتوں کو برقرار رکھنے پر مقامی لوگ اور بھی زور دینے لگے۔

کانفرنس کے دوران سوڈان کی اکتالیس ڈاکٹروں، نرسوں اور ڈاکٹری میں زیر تربیت طالبات کی جانب سے ایک پیپر تقسیم کیا گیا جس میں یہ ثابت کیا گیا کہ عورت کے ختنے ہر حال میں عورت کے جسم اور صحت کو متاثر کرتے ہیں۔ اس پیپر میں یہ بھی کہا گیا کہ عورت کے ختنے ختم کرانے میں عورتوں ہی کا ایک بڑا حصہ جو دائیوں پر مشتمل ہے۔ اپنے مالی فائدے کے باعث نہ مدد کرتا ہے اور نہ اس کو بند کرانے کے لیے دلیل لاتا ہے۔ اسی طرح عام عورت بھی اس کو ختم کرانے کی پیش رفت میں نہ مدد کرتی ہے اور نہ آگاہ ہے کہ اس پیش رفت کی کیوں ضرورت ہے۔

یہ بالکل اسی طرح ہے کہ جیسے انقلاب کے عمل کے دوران، جب

جاگیرداروں کی زمینیں قومی ملکیت میں لے کر مزارعوں میں تقسیم کرنے کا مرحلہ آتا ہے تو جاگیرداروں کے حق میں احتجاج کرنے کے لیے وہ سارے مزارعے بھی آگے آگے ہوتے ہیں کہ جن کو فائدہ پہنچانے کے لیے یہ عمل کیا جارہا ہوتا ہے۔ کہ وہ ناواقف اور لاعلم ہوتے ہیں اس دیرپا اثر اور انقلاب کے مضمرات سے جو کہ انھیں اصلاً فائدہ پہنچا رہا ہوتا ہے۔

عالمی صحت کا ادارہ بھی اس موضوع کو زیر بحث لانے سے گریزاں رہا ہے۔ ان کے خیال میں چونکہ یہ رواج مقامی رسوم سے متعلق ہے۔ اس لیے عالمی ادارہ، مقامی رسوم میں دخل اندازی کا مجاز نہیں۔ البتہ خرطوم میں، ڈبلیو، ایچ، او کی جانب سے جو کانفرنس ہوئی اس میں تجاویز پیش کی گئیں کہ:

۱۔ خواتین کے ختنے روکنے کے لیے قوانین کے نفاذ، بنانے اور عملدرآمد کے لیے کمیشن کے قیام کی منصوبہ بندی کی جائے۔

۲۔ اس جہالت کے خلاف، لوگوں میں زبان، میڈیا، لٹریچر اور دیگر تمام ذرائع سے عوامی رائے کو صحت مند خطوط پر استوار کیا جائے۔

۳۔ طبی سطح پر پراپیگنڈے کے ذریعہ، عورتوں کے ختنوں کے نقصانات کا عملی اور علمی مظاہرہ کیا جائے۔

۱۹۸۰ء میں یونیسیف اور ڈبلیو، ایچ، او نے مشترکہ منصوبے کے ذریعہ درج بالا اقدامات کے حصول کی کوشش کی۔ انھوں نے سکولوں میں بھی اس موضوع پر خاص لیکچرز کا اہتمام کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ ۱۹۸۰ء ہی میں کوپن ہیگن میں مغربی اور مشرقی افریقہ، یورپ اور امریکہ کے علاوہ یورپ میں زیر تعلیم اور سکونت پذیر افریقی خواتین کے زور دینے پر، اس موضوع کو بڑی شدت کے ساتھ زیر بحث لایا گیا۔ جس کے پیراگراف ۱۲۹ میں عورتوں کی حمت کے مثبت منصوبوں کے عنوان کے تحت ایسی روایات کو ترک کرنے کے قوانین بنانے پر زور دیا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ ایسے معاملات کو بین الاقوامی کانفرنسوں میں عام لفظوں میں نہیں اٹھایا جاسکتا۔ اس لیے عورتوں کی کانفرنسوں میں اس کا اظہار کیا جارہا ہے۔ علاوہ ازیں افریقی علاقوں میں پانی کی فراہمی اور خوراک کا بندوبست وہ اہم چیزیں ہیں کہ ان کی فراہمی خود بخود، لوگوں کی توجہ، غیرضروری امور سے ہٹا دے گی۔

فی الوقت سوڈان میں، اسی سلسلے میں بہت پیش رفت ہوئی ہے۔ سوڈان کے نرسنگ کالجوں میں باقاعدہ کورسز شروع کیے گئے ہیں اور عربی میں چھوٹے چھوٹے پمفلٹ اس روایت کو ختم کرنے کی ترغیب کے لیے جاری کیے گئے ہیں۔ یہ کورس کینیا میں بھی شروع کیے گئے ہیں مگر بہت محدود اور وہ بھی شہروں تک۔ صومالیہ میں ۹۰ فیصد عورتوں کو صوتی اور برقی آلات کے ذریعہ اس روایت کو ختم کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس میں چینی عورتوں کے پیر باندھنے کی روایت اور پھر اس کو ختم کرنے کی تحریک کو مثال کے طور پر جگہ جگہ پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح ہندوؤں میں عورت کے ستی ہونے کی روایت کو ختم کرنے کے لیے جس طرح جدوجہد کی گئی۔ اس کو بھی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں، بزرگ عورتوں کا تعاون حاصل کر کے، ان کے تلخ تجربات کو، نوجوان نسل کے لیے سبق آموز بنا کر پیش کرنے کا تجربہ بھی کافی زوداثر ثابت ہوا ہے۔

افریقی اور عرب عورتیں جو اس روایت کو ختم کرنے کے لیے کام کر رہی ہیں۔ ان کو بہت نقصانات اُٹھانے پڑے ہیں۔ مثال کے طور پر کانفرنس میں شریک مصری مندوب ڈاکٹر نوال سداوی کو دیہی علاقوں میں بارہ سال کام کرنے کے بعد، اپنے تجربات پر مبنی اس روایت پر کتاب لکھنے پر نوکری سے خارج کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح سوڈان، صومالیہ، کینیا، وولٹا، نائجیریا اور بنین کی عورتوں کو بھی اس روایت کے خلاف تحریک چلانے پہ سزاؤں اور الزامات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مالی کی ایک خاتون نے کانفرنس میں کہا کہ وہ اس کے میاں اپنی تین بیٹیوں کو لے کر فرانس سے واپس وطن آئے تو آتے ہی خاتون کی والدہ سے پوچھا کہ تم نے لڑکیوں کی رسم کروالی ہے۔ ماں نے نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ نہ اس نے کرایا ہے اور نہ کوئی ارادہ ہے کرنے کا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ وہ روز اپنی بچیوں کو کام پہ جانے سے پہلے اپنی ماں کے پاس چھوڑ جاتی تھی۔ ایک دن کام سے واپس آئی تو بچیاں نظر نہیں آئیں۔ پوچھا کہاں ہیں۔ جواب ملا۔ کمرے میں۔ فوراً بیتاب ہو کر کمرے میں گئی۔ ایک چٹائی پر تینوں لڑکیوں کو آنسو بھری آنکھوں سے لیٹے ہوئے پا کر چیخ ماری۔ مگر ماں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''یہاں ایسے ہی ہوتا ہے۔ یہ فرانس نہیں ہے''

مالی ہی کی ایک اور خاتون نے، کانفرنس میں کہا کہ ''مجھے نہیں یاد کہ میں نے اپنے بچپن میں ایسی کسی روایت کا ذکر سنا ہو۔ ہاں جب میں بیس برس کی ہوئی تو مجھے اس تمام ابتلا کا علم ہوا، میں ایک بہت ہی بند معاشرت کی پیداوار ہوں۔ میری شادی ہونے والی تھی اور مجھے پتہ چلا کہ میرے ساتھ بچپن ہی میں روایتی آپریشن ہو چکا ہے۔ اور اب اگر روایت کو جاری رکھا گیا تو شادی سے پہلے ایک رات، چاقو کے ذریعہ، میرے وجود کو پھاڑ دیا جائے۔ میں یہ سوچ کر پاگل ہونے لگی۔ کوئی نہ تھا جس سے مشورہ ہو سکتا اور کوئی نہ تھا جو انقلابی قدم اُٹھانے کو تیار ہوتا۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ میں خود ہی ہسپتال چلی جاؤں اور ڈاکٹر سے باقاعدہ آپریشن کے ذریعہ کھلوا کر آؤں۔ اب میں ایک ڈاکٹر کے پاس گئی۔ اس نے انکار کر دیا۔ گھبرا کر ایک دائی کے پاس گئی۔ اس نے بھی انکار کر دیا۔ ہر شخص جس سے بھی ہسپتال میں آپریشن کی بھیک مانگی اس نے مجھے پاگل شخص قرار دیتے ہوئے منہ موڑ لیا۔ ڈاکٹروں نے مجھے اپنے کمرے سے نکال دیا۔ میں روز خود ہی سے ناراض ہوتی۔ خود ہی سے بغاوت کرتی، مگر معاشرے کا ہر فرد، میری بغاوت میرے اندر سُلا دینے کو دیوانہ ہوتا۔ آخر کو میری شادی کا دن آ گیا۔۔۔ اب مجھے پتہ تھا کہ وہی وحشیانہ انداز روایت کے نام پر میرے وجود کو چاک کرنے کو آزمایا جائے گا۔ اور یہی ہوا۔ سارا گھر۔۔۔ سارے دوست۔۔۔ سارے رشتہ دار۔۔۔ سب خوش تھے۔۔۔ اور میں تھی

کہ رورو کر بُرا حال کر رہی تھی۔۔۔''

سینیگال کی آ داتھیام کے مطابق، دو اہم طبقے اس روایت کو برقرار رکھنے کے لیے متشددانہ طریقے پر عمل پیرا ہیں۔ایک تو روایتی مسلمان گروہ ہیں جو اسلام اور عصمت کو لازم وملزوم کہتے ہوئے، اس کو جاری رکھنے پہ بضد ہیں۔اور وہ بزرگ خواتین جو اس رسم کو تہذیب کے نام پر ہر قیمت پر مذہبی رسم کی طرح پوری کرنے پہ قائم ہیں۔سارے افریقی ممالک میں لڑکیاں یہ جانتی ہیں کہ اس رسم کے باعث، انہیں بہت تکلیف ہوتی ہے۔مگر چونکہ سب لڑکیوں کے ساتھ یہی رسم انجام پاتی ہے۔اس لیے ابھی ان میں اس رسم کو بے ضرورت قرار دینے کا خیال، جاگزیں نہیں ہوا۔بلکہ وہ تو گھر پر اصرار کرتی ہیں کہ فلاں لڑکی کے ختنے ہوئے اتنے دن ہوگئے، میرے اب تک کیوں نہیں ہوئے۔

عورتوں کی جدوجہد افریقہ اور دوسرے مسلکہ اسلامی ممالک میں اس بنیادی مسئلے سے وابستہ ہے، پہلے اس رسم کی بدعت کو ختم کرنا ہوگا۔عورت کا رسوم سے رہا ہونا اور معاشرتی غلامی سے رہا ہونا، یہ دونوں باتیں مشترکہ طور پر، باقاعدہ شروع کی گئی ہیں۔ڈاکٹر نوال سداوی، مصر سے، آ داتھیام، سینیگال سے، رقیہ حاجی دلھے اور مریم فرف ورسامے، سوڈان سے، وہ خواتین ہیں جنھوں نے اپنی نوکریاں داؤ پر لگا کر جیل کی سزا بھگت کر بھی، اس رسم کو ختم کرنے کے لیے معاشرے اور حکومتوں سے لڑائی جاری رکھی ہے۔

صومالیہ کی ایڈنا اسمٰعیل نے بار بار زور دیا کہ اس رسم کو عورتوں کے صحت کے مسئلے کے طور پر لیا جائے۔اور قانون نافذ کیا جائے، تب ہی کچھ پیش رفت ہوسکتی ہے۔ایڈنا نے ۱۹۷۹ء کے ایک سیمینار کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ جب وہ اس رسم کے خلاف تقریر کر رہی تھیں۔تو خیال تھا کہ تمام عورتیں غصے کے مارے اپنے جوتے اتار کر ان پر پھینکیں گی۔مگر ہوا یہ کہ جب انہوں نے رسم ختم کرنے کے اسباب بیان کیے تو عورتوں نے کھڑے ہو کر تالیاں بجا کر، اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔

البتہ وولٹا میں، جب ریڈیو پر اس رسم کو ختم کرنے کا پراپیگنڈہ کیا گیا تو اس کے خلاف اتنا شدید ردعمل تھا کہ یہ پروگرام فوراً بند کرنا پڑا۔ یہاں ایک سوالنامہ پُر کرایا گیا کہ آخر یہ رسم کیوں؟ مسلمان لڑکیوں نے جواب دیا کہ مذہب کہتا ہے کیتھولک نے جواب دیا ''روایت اور پاکیزگی اور اخلاقیات'' کہ جس لڑکی کی یہ رسم نہ ہو وہ مردوں کے ساتھ خراب رہتی ہے۔کچھ ڈاکٹروں، نرسوں، استادوں نے جواب دیا کہ چونکہ ان کی ماں کے ساتھ ایسا ہوا تھا۔اس لیے خاندانی نجابت اس رسم کو برقرار رکھنے پر مصر ہے۔جس لڑکی کی یہ رسم ادا نہ ہو اس کو باکردار نہیں کہا جاتا۔

مصر کی ماریہ اسعد نے ۵ سال تک باقاعدہ دیہی علاقوں میں عورتوں کے گروپوں میں بیٹھ کر، اس رسم کے خلاف بحث مباحثہ، بات چیت کی تھی، ماریہ کے خیال میں وہ معاشرے جن میں اب تک ادب، مذہب، اخلاقیات اور ذہنی ہمواری، عورت کی عصمت، پاکیزگی اور عورت کو گھر میں جکڑ کر بند رکھنے پہ منحصر ہو۔وہاں مردوں اور عورتوں دونوں کے سامنے رسم کو ختم کرنے کی توجیہہ اس بنیاد پر نہیں کرسکتے کہ یہ عورت کی صحت اور جنس کے لیے نقصان دہ ہے۔اگر وہ عورت کے نقصانات کو معاشرے کے نقصانات سمجھتے تو وہ اتنے بچے پیدا کرنے پہ اصرار کیوں کرتے، پھر وہ عورت کے ساتھ یوں سارے زمانے کی حماقتیں کیوں وابستہ کرتے۔وہ پھر عورت کو ثانوی درجے کی مخلوق کیوں سمجھتے۔علاوہ ازیں ابھی تک ساری دنیا کی عورتوں کی انجمنوں کے پاس یہ اعداد و شمار نہیں ہیں کہ اس رسم کے باعث کس قدر عورتیں جان سے جاتی ہیں۔کتنی ہیں جو جنسی تلذّ ذ سے محروم ہو جاتی ہیں۔کتنی ہیں جو یخ بستگی کا شکار ہو جاتی ہیں اور کسی قدر عورتوں کی جسمانی ہیئت کذائی اس رسم کے باعث ہوتی ہے۔

مصر میں ایک دفعہ یہ افواہ عام ہوگئی کہ اگلے دن سے ایک آرڈی ننس جاری ہو رہا ہے جس کے ذریعہ یہ رسم ممنوع قرار دی جارہی ہے۔عورتوں نے راتوں رات، بہت سی ان لڑکیوں کے بھی آپریشن کرا ڈالے جو ابھی بہت کم عمر تھیں اور ایسے آپریشن کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے تو کوئی بھی بڑی بوڑھی تیار ہو جاتی ہے۔

ایک خاتون نے اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے کہا کہ میں دائی کو دیکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔مجھے بہت دُور سے پکڑ کر لایا گیا، میری ماں اُڑی رنگت دیکھ کر بولی ''آج یہ بہت ڈری ہوئی ہے۔پھر کبھی سہی'' دائی نے درشتی سے کہا ''پھر کیا اس کا ڈر ختم ہو جائے گا۔وہ تو اور بھی بڑھے گا۔وہ مجھے پکڑ کر لائی۔آپریشن کیا۔میں روتے روتے سوگئی جب اُٹھی تو ماں نے مجھے مرغا کھلایا اور آٹھ دن تک میری بڑی خاطریں کیں۔

مصر ہی کی ایک اور مندوب نے بتایا کہ ایک دفعہ ایک عورت کو اس کے شوہر نے اسی لیے چھوڑ دیا کہ اس کا آپریشن صحیح طریقے پر نہیں ہوا تھا۔اس نے طلاق دیتے ہوئے کہا کہ یہ میں نے عورت سے شادی کی ہے کہ مرد سے:

عام عورت کا کہنا یہ ہے کہ چونکہ میری دادی، پڑدادی اور اس کی دادی نے یہ رسم کی تھی۔اسی لیے مجھ پر بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ میں اگلی نسلوں تک اس رسم کو نبھاؤں۔

عرب اور افریقی ممالک میں کوئی ۸ کروڑ عورتیں، جبری سرکم سیون کا شکار ہوئی ہیں۔ویسے تو لطف کی بات یہ ہے کہ مغرب کے بھی کچھ علاقوں میں خواتین کی سرکم سیون کی جاتی ہے۔ہاں وہاں وجوہات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔یہاں کچھ علاقوں میں تو ہسٹیریا کا علاج کرنے کے لیے اور کچھ علاقوں میں عورت کے دماغی امراض اور مرگی کے علاج کے لیے سرکم سیژن کیا جاتا ہے۔ویسے چند امیر خواتین اپنے حسن، دلبریائی اور ذہنی صحت کے لیے کافی بھاری رقوم خرچ کر کے بخوشی سرکم سیون کرواتی ہیں۔

کانفرنس کے اس گروپ نے فیصلہ کیا کہ اس روایت کو ختم کرنے

کے لیے پڑھے لکھے اور نوجوان مردوں کی معاونت حاصل کرنی چاہیے۔اس رسم کو مذہبی یا غیر مذہبی کے چکر میں ڈالے بغیر بات کی جائے، ورنہ علماء کا ایک گروپ ساتھ اور ایک مخالف پیدا ہوجائے گا اور کام بننے کی بجائے مزید بگڑے گا۔اور یوں وہ موضوع جس کا مذہب میں کوئی ذکر نہیں۔زبردستی مذہبی اسباب کے ساتھ ہمارے سروں پہ تھوپا جائے گا۔(جیسا کہ فیملی پلاننگ کے سلسلے میں سارے مسلمان ممالک میں ہوا)۔

ایک سوال جس پر پڑھے لکھے، عالم، دانشور، جوان اور سائنسدان متفق ہیں وہ یہ کہ مشرقی روایت جس میں عصمت کے تحفظ کا سوال ہے۔وہ یہ رسم ختم کر کے بھی اگر قائم رہتی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔روایت پرست اور غیر روایت پرست، سب اس موضوع کو اہم سمجھتے ہیں۔اس سوال کو فروعی سمجھ کر نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ اس کو رکاوٹ بھی نہیں سمجھنا چاہیے۔اور روایت پرستوں کو یہ بھی سمجھانے کی ضرورت ہے کہ عورت کی رسم نہ ہو تو اس میں مردانہ اوصاف پیدا نہیں ہوتے۔

کانفرنس میں اس سلسلے میں قانون بنانے پر زور نہیں دیا گیا کہ یوں قانون نافذ کردینے سے کام ختم نہیں ہوتا، سب لوگ انڈر گراؤنڈ ہو جائیں گے اور یہ کام اور وسعت اختیار کر جائے گا۔(جیسا کہ سوڈان کے تجربات سے ظاہر ہے۔۱۹۴٦ء میں قانون نافذ کیا گیا تھا اور اب تک اس رسم کو جڑ سے اکھاڑا نہیں جاسکا)۔

اس رسم کو ختم کرنے کے لیے، عورت کی آزادی کے مسئلے کو بھی نہ اُٹھایا جائے کہ یوں بھی لوگ اختلاف کریں گے۔صحت کے بنیادی مسئلے کو ہی اول و آخر اہمیت دی جائے۔

میں یہ سارا سیشن اٹنڈ کر کے سوچ رہی تھی۔ ہمارے یہاں کے شمالی علاقوں اور قبائلی علاقوں کی عورت کا دکھ کون سُنے گا۔کیا وہاں بھی یونیسیف آ کر کچھ کہے گا تو پھر ہماری انجمنیں اپنے بورڈ لے کر آ گے آئیں گی!!

مگر ساتھ ہی مجھے یاد آیا وہ منظر، سکول سے واپسی پہ دیکھا برآمدے میں چادریں اوڑھے بڑے اور چھوٹے بھائی لیٹے تھے اور اماں مٹھائی تقسیم کر رہی تھیں۔چادر اُٹھانے کی کوشش کی تو تھپڑ۔۔۔پوچھنے کی کوشش کی تو گھرکی، بھائیوں سے خود بات کرنے کی ہمت کی تو ڈانٹ۔۔۔اور پھر محلے کے ڈھیر سارے دس دس سال کے لڑکے یاد آ گئے جنہیں زبردستی روتے دھوتے پکڑ کر صحن میں لایا جاتا تھا، جہاں نائی بیٹھا ہوتا تھا، جہاں گھر میں خاندان بھر کے لوگ جمع ہوتے تھے اور لڑکوں کا خون خشک ہو رہا ہوتا تھا۔

اب تو یہ منظر بھی کم کم ہی رہ گئے ہیں کہ اب تو بچے کے پیدا ہوتے ہی ہسپتال میں بچے کے ختنے کر دیے جاتے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے یہ بات اتنی دیر سے یاد آئی۔

☆

خوشونت سنگھ

(۱۹۱۵)

بھارت کے نامور، دانشور صحافی خوشونت سنگھ 1915ء میں ہڈالی پنجاب میں پیدا ہوئے۔ لاہور گورنمنٹ کالج، کنگز کالج اور انرٹمپل لندن سے تعلیم حاصل کی۔انہوں نے کئی سال تک وکالت کی، پھر 1947ء میں حکومت ہند کی وازرتِ خارجہ میں ملازمت کی۔وہ کینیڈا اور لندن میں سفیر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ پیرس یونیسکو میں ہندوستانی سفیر کی خدمات بھی سرانجام دیں۔ 1951ء میں آل انڈیا ریڈیو میں صحافی کی حیثیت سے بھی کام کیا۔انہوں نے سکھوں کی تاریخ کو دو جلدوں میں مرتب کیا ہے۔کئی ناول لکھے جس میں ''ٹرین ٹو پاکستان'' اتنا مشہور ہوا کہ 1954ء کا گرووپریس ایوارڈ دیا گیا۔خوشونت سنگھ 86-1985ء تک ممبر پارلیمینٹ رہے۔ 1974ء میں انہیں پدم بھوشن انعام دیا گیا جو انہوں نے 1984ء میں سکھوں کے قتل عام کے باعث واپس کر دیا تھا۔

☆

مایا انجلو

(۱۹۲۸ء)

مایا انجلو ان اوّلین بلیک رائٹرز میں سے ہیں جنہوں نے سفید فام امریکیوں سے اپنا لوہا منوایا۔شاعری کی، مضمون اور سفرنامے لکھے۔ ذائقہ بدلنے کے لیے انہوں نے زندگی کے سفر کا جائزہ بھی لیا۔وہ بہت سی لکھنے والیوں کی طرح اس بات سے چڑتی تھیں کہ ان کا شمار صرف خواتین لکھنے والیوں میں کیا جائے۔ان کے چھ شعری مجموعے شائع ہوئے جو کہ کلیات کی شکل میں بھی موجود ہیں۔ان کی یادداشتوں کی بھی بہت تعریف ہوئی اور زمانے نے مانا کہ فی الوقت امریکی شعری اُفق پر زیادہ کالے امریکی ہیں، جن میں عورتیں نمایاں ہیں۔

☆

(باقی ماندہ خواب سے منتخب)

''آقا کا خطاب''

(منتخب کالم)

کشور ناہید

صدر بش نے خطاب کرتے ہوئے دنیا بھر کو بتایا کہ مشرق وسطیٰ اور خاص کر سعودی عرب میں عوام کو سیاست میں شامل نہیں کیا جا رہا۔

صدر بش نے تقریباً تمام اسلامی ممالک کا نام لیا۔ نہیں لیا تو پاکستان کا اچھے یا برے کسی انداز میں بھی نام نہیں لیا۔

صدر بش نے سرالیون کو بھی اسلامی ممالک میں شامل کر دیا۔ یہ انکشاف نہ صرف حیران کن تھا بلکہ مستقبل کے نقشے کا حوالہ ہوسکتا ہے۔

صدر بش نے اردن کی بہت تعریف کی۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ نے مرتے مرتے وطن واپس آ کر اپنے فرزند کو بادشاہ بنایا۔ گزشتہ 32 برس سے فلسطینیوں کو کیمپوں ہی میں رکھا ہوا ہے اور کمال بات یہ ہے کہ چاہے مسئلہ عراق کا ہو کہ فلسطین یا کشمیر کا، کبھی زبان سے کوئی ایسا حرف نہیں نکالتے کہ مسلمان ہونے کا بھی شائبہ ہو۔

صدر بش نے بتایا کہ کویت میں جمہوریت آ چکی ہے۔ ہمیں تو یہی خبر تھی کہ کویت میں عورتوں کو ووٹ ڈالنے نہیں دیا گیا۔

صدر بش جنہیں سعادت حسن منٹو ''چچا سام'' کہتے ہیں۔ انہوں نے مشرق وسطیٰ میں عورتوں کی حالت زار پر بہت افسوس کا اظہار کیا اور یہ بھی بتایا کہ وہاں عورتوں کو مراکش کی طرح آزادی حاصل نہیں ہے۔ البتہ مراکش میں جو شہنشاہیت ہے، اس پر اسی طرح کوئی تبصرہ نہیں کیا جس طرح مصر اور دیگر مسلمان ممالک میں آمریت کو انہوں نے تعریف کے قابل سمجھا ہے۔

میں بہت دن سے اس بات پر غور کر رہی ہوں کہ کچھ اسلامی ممالک میں آمریت بعنوان جمہوریت ہے اور رہی ہے جیسے 28 برس تک ملائیشیا میں تقریباً اتنی ہی مدت تک انڈونیشیا میں سہارتو کی آمریت رہی اور کوئی 22 برس سے مصر میں اور شام میں آمریت رہی۔ جب ان ممالک کا سفر کیا تو ترقی کی پناہ ترقی تھی۔ ان ملکوں کا نام ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں آ رہا تھا اور تعلیم سے لے کر غربت میں کمی کی شرح بھی بڑی تقویت بخش تھی مگر ان ممالک میں الیکٹرانک میڈیا، اسی طرح پابند اور تعریف شاہ کی نمائندگی کرتا تھا جیسے امریکی میڈیا۔

تو وہ آزادی اور جمہوریت جو پاکستان اور ہندوستان جیسے ممالک میں ہے، جہاں اسمبلیوں میں گریبان پھٹتے اور کبھی جوتے چلتے ہیں اور ہم سب اس جمہوریت کے داعی، پرستار اور نقیب ہیں تو کیسے اس آمریت سے آنکھیں چار کریں جو ملکی ترقی کو معکوس سطح پر لے جاتی رہی ہے یا ملکی ترقی کو واقعی سیدھی سمت میں لے کر گئی ہے۔

جیسے ضیاء الحق کی آمریت، جہاد کے نام پر ڈالر آتے رہے۔ گھی اور کمبل باقاعدہ یوٹیلٹی سٹورز پر فروخت ہوتے رہے۔ حکمرانوں کی اولادیں ملٹی نیشنل کمپنیاں کیش قیمت دے کر خریدتی رہیں اور پھر جب بساط الٹی گئی تو جمہوریت کی جرابیں پہنے وہ حکمران آتے رہے جو آج تک اپنے ٹیکلس اور امارات کی باتیں کرتے ہیں۔ عوام کہیں پیچھے رہ گئے ہیں۔

مگر جب مہاتیر محمد جیسا کام کرنے والا آمر حکومت چھوڑ کر سپین میں خریدے ہوئے جزیرے کی جانب روانہ ہوا تو کوئی الواع کہنے والا نہیں تھا۔ جب سہارتو کو لوگوں نے سرکاری عمارات کو جلا کر غصہ میں آ کر مملکت سے علیحدہ کیا تو لوگ خوش تھے۔

مگر کیوبا میں کیا ہے؟ آمریت کہ عوام کی پسند کہ پاکستان میں تو عوام کی پسند ہر دو سال بعد ایسے بدلتی ہے کہ جو بھی کرسی سے اترتا ہے، چاہے افسر ہو کہ وزیر کہ حاکم، قوم مٹھائی ضرور بانٹتی ہے۔ سیاستدان فوج کو بلانے کے تقاضے شروع کر دیتے ہیں اور عوام کبھی یتیموں کی طرح تو کبھی راستہ بھٹکے مسافروں کی طرح ان منظروں کو حیرانی کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

صدر بش نے دمشق سے لے کر ایران تک کو دھمکی دی ہے کہ آ جاؤ ہماری گود میں اور بھول جاؤ اپنی ثقافت کو ورنہ ہم نے جو حال افغانستان کا کیا ہے یا عراق کا کیا ہے۔

اس وقت مجھے ایڈورڈ سعید بہت یاد آ رہے ہیں۔ وہ ہوتے تو اس حکمرانی کو زنجیر سے باندھ کر بیچ میدان میں لا کر وہ کوڑے مارتے کہ عقل ٹھکانے آ جاتی۔

مگر عقل تو ٹھکانے آئی ہوئی ہے کہ الیکشن قریب آ رہے ہیں ورنہ صرف مسلم دنیا کا درد کیوں اُٹھتا ورنہ کیوں جنوبی امریکہ کی ریاستوں میں ڈرگز سے لے کر لاقانونیت پہ بات نہیں کی جاتی۔ اس لیے کہ آخر امریکی مسلمانوں کے ووٹ بھی تو لینے ہیں کہ امریکی روزہ افطار کے ذریعے سارے مسلمان سفیروں کو بتانا ہے کہ جو کچھ فلسطینی کر رہے ہیں، وہ دہشت گردی ہے اور جو کچھ اسرائیلی کر رہے ہیں، وہ مزاحمت ہے۔

اس جائزے میں ایک ملک باقی ہے جس کا تذکرہ بھی کوئی اچھے لفظوں میں صدر بش نے نہیں کیا۔ وہ ہے چین۔ وہ بھی کوئی ملک ہے جس کی الیکٹرانکس نے اس وقت W.T.O سے پہلے ہی جرمنی، جاپان اور پاکستان کی ساری مصنوعات کا بھٹہ بٹھا دیا ہے۔ جو چیز ہزاروں میں ملتی تھی، وہ اب سینکڑوں میں مل رہی ہے اس سیلاب کو کون روکے گا۔

صدر بش کو اس کے بارے میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے اکوڑہ خٹک کے مدرسے میں داخلہ لینا پڑے گا۔

''ہم سے دشوار پرست''

صاعقہ مقبول

(اسلام آباد)

''اس عہد کی تاریخ''

کشور ناہید جس محفل میں ہو ممکن نہیں کہ اپنے وجود کا احساس نہ دلائے۔ میری طرح نہیں کہ گریہ مسکین کی طرح دبکے بیٹھے ہیں۔ چند مخصوص احباب کے سوامنہ میں گھنگھنیاں ڈل جاتی ہیں۔ وہ یوں چہکتی ہے کہ محفل کی جان بن جاتی ہے۔ خوب ہنستی ہے۔ خوب ہنساتی ہے۔ مگر شاعری میں ایک دُکھیا، برہا کی ماری۔ زندگی ہی کے عذاب میں جکڑی ہوئی عورت ہے۔ صرف عورت۔ وہ جو زندگی مردانہ وار بسر کر رہی ہے۔ زندگی ہی کی چوکھٹ پر پڑی سسک رہی ہے۔ بے یارومددگار۔ نہ جس کا کوئی مونس ہے نہ غم خوار۔ وہ ایک وفا شعار اور شوہر پرست عورت ہے۔ ایک ماتا سے معمور ماں۔ اس کی یہ ماتا صرف اپنے بچوں کے لیے نہیں ہے، ہر دکھیارے کے لیے ہے۔ میں نے جب اس کا تازہ مجموعہ ''گلیاں دُھوپ دروازے'' پڑھا تو میں بڑا ہی دُکھی ہوا۔ مجھے اس میں اپنے معاشرے کی بے شمار عورتیں اذیت میں رینگتی ہوئی دکھائی دیں اور پہلی مرتبہ نثری نظم واقعی شاعری معلوم ہوئی اور کشور ناہید ایک ایسی شاعرہ جو اس عہد کی تاریخ کے لیے ازبس لازم ہوگئی ہے۔ کل کی کس کو خبر ہے۔

شہرت بخاری

''آن گارڈ شاعرہ''

میں کشور ناہید کا مجموعی جائزہ لیتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ ایک ارتقاء پذیر شعری شخصیت رکھتی ہیں اور مغربی شاعری سے متاثر ہونے کے باوجود ایک مشرقی عورت کے ذہن ونظر سے سوچتی ہیں۔ حالات، ماحول، خیالات وجذبات کو پرکھنے کا ہنر رکھتی ہیں۔ جب ہی تو ان کے مجموعے مسلسل رفتار، بلندی اور عمق کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کی شاعری کا ایک اہم حصہ احتجاجی ہے اور یہ شاعری حالات کے بدلتے ہی ادبی کم اور تاریخی اہمیت کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ مگر کشور کی احتجاجی آواز انفرادی ہوتے ہوئے بھی عمومی صداقتوں کی علم بردار بھی ہے۔ یہی نہیں اردو شاعری میں کشور ناہید کا لب ولہجہ اپنی انفرادیت بھی رکھتا ہے جب ہی تو آسانی سے پہچانا جاتا ہے ہاں ان کے ہاں مزاح کی کمی ہے مگر تبسم زیرلبی کی جھلکیاں ملتی ہیں خواہ یہ تبسم کتنا ہی زہر میں بجھا ہوا نہ ہو۔ ابھی وہ اپنے عروج پر نہیں پہنچی ہیں اور ان کا سفر یک رُخا بھی نہیں ہے۔ وہ خود تنقیدی کی بھی اچھی ''صلاحیت'' رکھتی ہیں۔ جس سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ آئندہ اور بھی احتساب وانتخاب کو اپنے فن کی ترقی کے لیے استعمال کرتی رہیں گی۔ وہ ایک آن گارڈ شاعرہ ہیں۔ یعنی، اُنہیں بار بار تجربے کی مہم پر جانا پڑے گا۔ وہ ایک مقام کو ''جنت'' بنا کر نہ جی سکتی ہیں اور نہ لکھ سکتی ہیں۔ ایسی شاعرہ کے مقسوم میں ''سفر، مدام سفر'' ہی لکھا ہوتا ہے۔ اور یہ اردو کی تجرباتی شاعری کے لیے یقیناً ایک خوش آئند علامت ہے!

باقر مہدی

''خاتونِ اوّل''

کشور ناہید ہمارے عہد کی ان خواتین شعراء میں ہیں جو اپنی ذات، ذہن، زبان اور قلم سے صحیح کام لینے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ شعر کہنا یا نثر لکھنا ایک بات ہے لیکن وجود کی پوری آگہی سے قلم اٹھانا کبھی کبھی جان جوکھوں کا کام بھی ہوجاتا ہے۔ عالمی ادبیات میں اس وقت تحریکِ نسوانیت یا جنبشِ زناں کے کئی روپ ہیں اس لیے کہ عورت کے سماجی مقام اور مرتبے کا تعلق ثقافت سے ہے اور ثقافت بقول آلتھیو سے لسانی ڈسکورس میں کھدی ہوئی ہے، اور ہر ملک اور معاشرے میں اس کی تقاضے جُدا جُدا ہیں۔ اردو میں اس طرف توجہ ہوئی ہے اور کچھ لوگوں نے قلم اٹھایا تو ہے لیکن اس موضوع پر بھرپور لکھنے کا شرف کشور ناہید ہی کو حاصل ہے۔ جنبشِ زناں فقط ادبی مسئلہ نہیں ہے، اس کی بنیادیں بھلے ہی حیاتیاتی ہوں لیکن اس کا گہرا تعلق چوں کہ انسانی اور سماجی حقوق سے ہے، یہ پولیٹیکل ایجنڈا اور آئیڈیولوجی کا حصّہ بھی ہے۔ کشور ناہید نہ صرف اس مسئلے کے عالمی تناظر سے واقف ہیں، ان کی گہری نظر برصغیر میں عورت کی صورتِ حال پر بھی ہے۔ اُن کی بات جو گہرے غوروفکر اور مشاہدے پر مبنی ہے، وزن رکھتی ہے اور توجہ کا حق مانگتی ہے۔ ان مسائل پر انتہائی جرأت، بیبا کی اور بے خوفی سے، بقول شخصے ''مردانہ وار'' لکھنے کا انھوں نے جو جوکھم اپنایا ہے اس کی بنا پر انہیں اردو میں جنبشِ زناں کی خاتونِ اوّل کہا جاسکتا ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ کشور ناہید کا آئیڈیولوجیکل ماڈل اور ترغیب ذہنی کا سرچشمہ سارتر کی رفیقہ سیمون ہے جس کے بارے میں وہ اس سے پہلے بھی لکھتی رہی ہیں۔ بہر حال ''عورت مرد کا رشتہ'' اس اعتبار سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے کہ یہ اردو میں ایک نئے مبحث کا باب کھولتی ہے اور اس کا مطالعہ بہت سوں کو سوچنے پر مجبور کرے گا اگر ایسا ہوا تو بے شک مصنفہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گی اور ناشر کو بھی خوشی ہوگی کیوں کہ ''ادب پبلی کیشنز'' کی بہر حال کوشش ہے کہ اردو میں عورتوں اور بچوں کے مسائل پر بنیادی نوعیت کی کتابیں برابر منظر عام پر آتی رہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

''جذبوں کی تطہیر''

کشور نے کبھی صرف چونکانے کی خاطر بات نہیں کی۔ انسان اپنی ذات کی قیمت پر چونکانے والی بات نہیں کرتا۔ اگر وہ چونکاتا ہے تو یقین کا کوئی توانا سرچشمہ اس کے اندر موجود ہوتا ہے۔

اب یہ مسئلہ بھی قابلِ غور ہے کہ کشور ناہید محض ایک شاعر کیوں نہیں، ایک عورت شاعر کیوں ہے؟ یہاں پر خواتین ناول نگاروں کا خیال آتا ہے۔ کیا خواتین ناول نگاروں کی طرح خواتین شاعرات بھی ہیں؟ تو جس طرح کچھ خواتین، خاتون ناول نگاروں کے زُمرے میں نہیں آتیں، اسی طرح کچھ شاعرات کو بھی خاتون شاعرات کی صف میں شمار نہ ہونا چاہیے۔ مگر اس سلسلے میں میری نگاہ صرف کشور ناہید ہی پر پڑتی ہے کہ وہ علامت ہے اپنی اس جنس کے لیے بہ حیثیت ایک فرد۔ ایک انسان کے۔ وہ عورت ہونے کی حیثیت سے اپنے آپ کو ایک انسان اور معاشرے کا ایک فعال فرد منوانا چاہتی ہے۔ وہ انسان، جو معاشرے پر پورے پورے حقوق بھی رکھتا ہے۔ محض فرائض کی چکّی میں نہیں پِستا۔

کشور ناہید نے عورت کا کوئی انقلابی تصور پیش نہیں کیا۔ یہ وہ عورت نہیں جس نے آنچل کو پرچم بنایا ہے۔ نہ ہی یہ مابعدالطبعیاتی میناروں پر براجمان اٹلکچوئل ہیولیٰ ہے، جو اپنی تاریخ اور تہذیب کے رشتوں اور جڑوں کو ہڑپہ، موئن جودڑو کے خرابوں میں تلاش کرتی ہے۔ یہ تو ایک انسان ہے جس کی اپنی انفرادیت اور شخصیت ہے۔ وہ محض آنکھیں بند کرنے کھولنے والی گُڑیا نہیں۔ وہ زمین کے مسائل کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے اور دیکھ کر سمجھنے، حل کرنے والی عورت ہے۔ یہ ایک ہمہ جہت شخصیت ہے۔ وہ دفتری کاموں میں دیانت اور محنت کی علامت ہے۔ اور گھر میں جذبوں کی تطہیر کی خواہش مند۔

خالدہ حسین

''زمانۂ آشوب''

کشور ناہید کے سامنے ایک دُنیا ٹوٹ رہی ہے۔ دوسری بن رہی ہے۔ اور ایسا زمانہ آشوب کا زمانہ ہوتا ہے۔ اور ایسے زمانہ میں شہرآشوب نہ لکھنا، اور غزلیں کہتے رہنا، نئے نئے خواب دیکھنا، اور زندگی میں مسلسل مٹھاس شامل کرتے رہنا بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ مگر کشور ناہید حتی الامکان اپنے عہد کے احساس کی تاریخ رقم کرنے میں لگی ہوئی ہیں:

اَب ایک عُمر سے دُکھ بھی کوئی نہیں دیتا
وہ لوگ کیا تھے جو آٹھوں پہر رُلاتے تھے

اور اب میں کشور ناہید کی شاعری کے بارے میں آخری بات کہنا چاہتا ہوں۔ یہ بات ان کی شعری خصوصیات کے اعتبار سے پہلے کہنی چاہیے تھی۔ تاہم اگر میں پہلے کہہ دیتا تو ان کے خلاف ایک دو فقرے کیسے چلاتا۔ ایک مدت ہوئی میں نے ورڈسورتھ کی کسی نظم میں Ruth کا حوالہ دیکھا تھا، کشور کا ایک شعر پڑھا تو عجیب سے خوشی محسوس ہوئی کہ دو مصرعوں میں وہ پورا تاثر لے لیا۔ واقعی عورتیں بہت کفایت شعار ہوتی ہیں۔

جوان گیہوں کے کھیتوں کو دیکھ کر رودیں
وہ لڑکیاں کہ جنہیں بھول بیٹھیں مائیں بھی

ہاں تو وہ آخری بات میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ غزل کی ہیئت کے باوجود، کشور نے احساس اور صورتِ حال کی پیشکش میں عورت کی جیتی جاگتی تصویر کو بہت روشن رکھا ہے۔

سجاد باقر رضوی

''ہیر کا جذبہ''

کشور ناہید کے سلسلے میں سب سے خوبصورت بات یہ ہے کہ اُس نے شاعری کو ذاتی اظہار کا ذریعہ مانتے ہوئے بھی اسے محض معروضی Subjective حدبندیوں کے اندر تالے لگا کے نہیں رکھا اور قرنہ ہی اُسے کوئی ایسا معمہ بنایا جو ہمارے یہاں فیشن کے طور پر علامتی ادب اور علامتی شاعری کہلاتی ہے۔ اُس نے اپنی ذات کے پردوں کو جس انداز سے کھولا ہے اُن پردوں کے پیچھے وہ معاشرہ اور وہ جہان بھی نظر آتا ہے کہ جس میں کشور ناہید نے آنکھ کھولی اور اُس کی رنگا رنگی کو گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ رنگ اُس کی شاعری میں کہیں جذبوں کا پَرتو ہیں تو کبھی قوس وقزح کا وہ نیم دائرہ جو کائنات پر محیط ہو کر زمین سے فلک تک فضا کو رنگوں سے بھر دیتا ہے اور کائنات کے ماتھے کا جھومر بن کر چمکتا ہے۔ ایک ذاتی حوالے کی بات سنیے۔ کئی برس پہلے میں نے کشور ناہید کو وائی ایم سی کی سیڑھیوں پر پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اُس کے سر پہ اوڑھنی تھی مگر اس کے چہرے کا رنگ زرد زرد تھا۔ وہ مجھے عام لڑکیوں سے مختلف سی لگی۔ بے پرواہ سے زیادہ لاپرواہ، چہرے اور گفتگو دونوں میں نہ کوئی غازہ نہ بناوٹ۔ پھر جب اُس نے حلقے میں غزل پڑھی تو نہ صرف یہ کہ اُس کے چہرے کے زرد رنگ میں اوڑھنی کا رنگ بھی کچھ زرد نظر آیا بلکہ اُس کی آواز، لہجہ اور خیال سبھی اس لحاظ سے مختلف تھے کہ وہ مجھے اپنے گھٹے ہوئے معاشرے میں ایک ایسی آواز لگی جو صدیوں کی گھٹن کو اس طرح کاٹتی ہے جس طرح کہ صبح کے سورج کی پہلی کرنیں تاریکی کو قینچی کی طرح کاٹتی ہیں۔ اُس میں بے باکی تھی، جو ہمارے لیے حیرت کی بات تھی، اس میں جرأت تھی جو ہم نے صرف مردوں کے لیے مخصوص کر رکھی ہے، اُس میں حقیقتوں کا برملا اور کھُلا اعلان تھا جو ہمارے جذبۂ منافقت پہ ایک بہت بڑی زد تھی۔ ہمارے ہاں جذبات کے اظہار کی اجارہ داری صرف مردوں کی تھی یہ بات میں صرف اردو شاعری کے پس منظر میں کہہ رہا ہوں پنجابی شاعری میں معاملہ پیش اس کے برعکس رہا۔ ہیر کے کردار ہی کو دیکھ لیجیے۔ سارے قصّے میں ہیر، رانجھے سے زیادہ فعّال ہے اور عشق کے اظہار میں جو بے باکی طمطراق اور ہمت اُس میں ہے، رانجھا اُس کے سامنے ایک Passive کردار نظر آتا ہے۔ رانجھا ہیر کے سامنے دبا ہوا ہے۔ جذبے اور ہمت کی وجاہت کا سمبل ہیر ہے رانجھا نہیں۔ اس لیے کہ ہیر گھٹے ہوئے معاشرے کے خلاف احتجاج کرتی ہے۔ وہ روایت اور شریعت سب کو ایک طرف رکھ کے سچے اور کھرے عشق کا پرچم بلند کرتی ہے۔ لوگوں کو حیرت زدہ کرتی ہے۔ بندھی ٹکی اور مروّجہ روایات کے پرستاروں کو وہ صدمۂ عظیم پہنچاتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ

اسی احتجاج نے اُسے آج تک زندہ رکھا ہوا ہے کشور ناہید ہیر کی سی جند جان نہ رکھنے کے باوجود ہیر کا جذبہ اور رُوح رکھتی ہے۔ اس کا اظہار اُس نے اپنی شاعری میں کیا۔ بے باکی، جرأت اور ہمّت کی یہ پہلی آواز تھی اور اسی آواز کا گونجتا ہوا آہنگ اب فہمیدہ ریاض کی نظموں میں سُنائی دیتا ہے۔

منیر احمد شیخ

''اخلاقی ضابطوں کے سائے''

کشور ناہید ہمارے ادب کی وہ باغی شاعرہ ہے جس نے روایتی طرزِ اظہار میں شاعری کی ہو یا جدّت پسندانہ انداز میں غزل کہی ہو یا آزاد اور نثری نظم۔ ہر پیرایۂ اظہار میں اپنے عہد کی سماجی اور طبقاتی شعور کی ترجمانی کی اور سیاسی اور اقتصادی مسائل کی روشنی میں تاریخ کا وہ مطالعہ پیش کیا جس میں مرد کے ساتھ عورت بھی ایک جبر ایک قہر برداشت کرتی رہی۔ لیکن مرد اور عورت کے ظلم سہنے کے انداز جُدا ہوتے ہیں۔ عورت چکّی کے پاٹوں میں دو طرح پستی ہے۔ ایک طرف اپنے عہد کا جبر اور دوسری طرف معاشرے میں اس مرد کا روّیہ جو بظاہر اس کا رفیق اور نگہبان ہوتا ہے لیکن دراصل اس کی شخصیت کو فنا کر دیتا ہے۔ کشور ناہید نے معاشرے کے عائد کردہ اخلاقی ضابطوں کے سائے میں مرد کے طرزِ عمل اور ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کے مقدس اور خوبصورت عنوانات کے زیرِ اثر عورت کی ریزہ ریزہ ہوتی شخصیت کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اُس نے اُس چیخ اور کراہ کو اپنے شاعرانہ احساس کی بنیاد بنایا ہے جو دلہن کے گھونگھٹ سے لے کر ماتا کی گود تک عورت کا مقدر ہے۔ کشور نے عورت کی زندگی کے اس المیے ہی کو موضوعِ شعر نہیں بنایا بلکہ اسے خود آگہی پر اکسا کر اس کے مہر بہ لب جذبات کو اپنی زبان بھی دی ہے۔

حمایت علی شاعر

''موضوعات کا تنوع''

مجھے عام طور پر ''نثری نظمیں'' پسند نہیں آتی ہیں خصوصاً اس وقت جب لکھنے والے کے پاس کوئی بات بھی کہنے کی نہ ہو۔ وہ لفظوں کی بُھول بھلیّوں میں اپنے ساتھ قاری کو پھنسانے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ یہ نثری نظمیں اکثر ایسے بچے کی غوں غاں معلوم ہوتی ہیں جو بولنا چاہتا ہے مگر جسے بولنا نہیں آتا ہے۔ کشور نے نثری نظم لکھ کر نثری نظم لکھنے والوں کو ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ موضوعات کا تنوع اور زبان کا سلیقہ، جذبہ کی شدت اور احساس کی گرمی نے اس کی نثری نظموں میں جان ڈال دی ہے۔ ثابت ہوا کہ نثری نظمیں لکھنا بھی غیر شاعروں کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے بھی شاعر ہونا چاہیے۔

اختر جمال

''زیرِ آب بستیاں''

کشور بخوبی واقف ہے کہ عورت کو معاشرے میں دو محاذوں پر لڑنا ہے۔ بحیثیت عورت کے مرد کی برتری سے (ان مردوں میں ترقی پسند مرد بھی شامل ہیں) اور معاشرے کے استحصالی طبقوں سے۔ وہ اس احساس کو پیدا کرنا چاہتی ہے کہ معاشرہ اسی وقت استحصال سے پاک ہوگا جب عورت کو اس کا صحیح مقام ملے گا۔ جب مرد اور عورت برابر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کریں گے۔

کبھی تو آنکھوں میں ان کی آبادیاں کھِلیں گی
وہ بستیاں عمر بھر جنہیں زیرِ آب دیکھا

اس لیے کشور کے ہاں مایوسی نہیں، اُمید ہے، وہ تاریخ کی تبدیلی کے عمل سے بخوبی واقف ہے، اور یہ تبدیلی چاہے ہمارے معاشرے میں ہو یا کسی اور دوسرے معاشرے میں، یہ ہمیں حوصلہ دیتی ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی

''مشرقی عورت کا سراپا''

کشور ناہید کے لیے اس کی ذات ایک قومی تخلیقی محرک کی حیثیت رکھتی ہے جس کے نتیجہ میں شاعری کے آئینہ میں اپنی تخلیقی شخصیت کی مشاطگی یُوں کی کہ اپنے سراپا کو پاکستانی عورت کا سراپا بنا دینے کے ساتھ ساتھ اپنی شاعری کو آج کی آزادی طلب عورت اپنے وجود کا اثبات چاہنے والی عورت اپنی شخصیت کا اظہار چاہنے والی عورت اور اپنی نسوانیت سے نہ شرمانے والی عورت کا منشور بھی بنا دیا یہ مشرقی روایتی عورت کا آنسوؤں اور آہوں سے مملو Passive Resistance والا انداز نہیں بلکہ بحیثیت عورت وہ اپنے آپ پر ناز کرنے اور خود کو قابل احترام سمجھنے کی تلقین کرتی ہے چنانچہ اس کی بیشتر نظموں جیسے ''جاروب کش''-،=،+،×،-،''،'' ہم نے خواہشوں کے سہارے پرندے اڑا دیے ہیں۔'' ''میری مانو'' "Face The Pan" ''نظم''، ''دھواں چھوڑتی بسیں''، ''سُن ری سہیلی''، ''کلیرنس سیل'' ''کتنی چاہتے والے لوگ ترے دیوانے''، ''اعتراف''، ''میں کون ہُوں''، ''اے کاتبِ تقدیر لکھ''، ''زخمی پرندے کی چیخ'' وغیرہ ان سب نظموں میں کشور ناہید گھاس کی مانند پامال پاکستانی عورت کے لیے صدائے احتجاج بلند کرتی نظر آتی ہے۔ اگرچہ ان نظموں اور بعض دیگر نظموں میں بھی جیسے! ''تیرا لٹیا شہر بھنبھور''، ''تم سے''، ''رات آتی ہے''، ''دوسری موت''، کشور ناہید نے لہو کی پکار اور جسم کی چھچا ہٹ سُنی اور سنائی ہے لیکن فہمیدہ ریاض کے برعکس انداز کلینیکل نہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس لحاظ سے کشور ناہید انفرادیت اختیار کر لیتی ہے کہ اس نے جنس میں عورت کی پامالی دیکھی ہے اسی لیے وہ اسے بعض اوقات استحصال کے مترادف گردانتی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر

''رجحان ساز شاعرہ''

کشور ناہید ہمارے عہد کی رجحان ساز شاعرہ، نامور سوانح نگار، مشہور مترجم، مقبول کالم نگار اور پاکستان کی بیدار خواتین کی تحریک کے حوالے سے قومی اور بین الاقوامی سطح پر نہایت متعارف تخلیق کار کے طور پر عزت واحترام

سے دیکھی جاتی ہیں۔شعروادب کی ترقی وترویج کے ساتھ پاکستانی معاشرے میں خواتین کے شعوروآگہی کے فروغ کے لیے مسلسل جدوجہداور بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کے احساس کواجاگر کرنے کے سلسلے میں کشور ناہید کی خدمات کا اعتراف ہرسطح پر کیاجاتا ہے۔

افتخار عارف

''علامتوں کی ندرت''

ان نظموں کی ایک خصوصیت سوچ کا وہ توازن ہے جو دُکھ کی حد تک رکھتا ہے۔اس میں نہ جھلاہٹ آنے دیتا ہے نہ تلذذ پسندی۔نہ دکھ کی عقیدہ کی حد پرستش کی ہے۔نہ دُکھ دینے والوں سے کوئی رعایت کی ہے۔بلکہ اُنھیں بڑی جرأت سے للکارا ہے۔کشور ایک منجھی ہوئی شاعرہ ہے۔اسے دُوسری اصنافِ سخن پر بھی دسترس ہے۔تنقید کے میدان میں بھی اس کا نام غیر مانوس نہیں۔پھر دنیا بھر کی ادبی اور انقلابی تحریکوں سے بھی اسے گہرا رابطہ رہا ہے۔جس کا اظہار زیرِنظر انگریزی ترجمہ The Price of Looking Back میں بھی ہوتا ہے۔وہ ایک فعال شاعرہ ہے۔رونقِ محفل بھی اور صاحبِ محفل بھی۔جتنی بے باکی اس کی زندگی میں ہے اتنی ہی فن میں بھی ہے۔پچھلے مجموعوں کے مقابلہ یہاں ابہام بھی کم ہےاور علامتوں کی ندرت پر بھی اتنا زور نہیں ہے۔گو ندرت اب بھی کسی حد تک مسئلہ ضرور ہے۔البتہ پہلی تحریروں میں جو اندرونی کشمکش ''بھاری پن''اور کسی حد تک تذبذب پایا جاتا ہے اب کچھ کم ہے۔

رضی عابدی

''تجزیوں کی طغیانی''

کشور کی نظموں کے عنوانات مثلاً ''محاسبہ''، ''خود احتسابی''، ''تحلیلِ نفسی''، ''میں اور مَیں''، ''پرسونا I اور II''، ''پورٹریٹ ۱۹۸۰ء'' وغیرہ ہی یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں کہ یہ تحلیل اور تجزیے کا مرحلہ ہےاور شاعرہ تلاشِ ذات میں خوابوں اور جذبوں کے دائرے سے کہیں آگے نکل آئی ہے، کشور ناہید نے اس مرحلے کی تلخی سے آنکھیں نہیں چرائیں۔یہ تجربوں کی طغیانی میں ہاتھ پاؤں چلانے کی کیفیت ہے۔تاہم یہ سوال اپنی جگہ ہے کہ کیا یہی مکمل سچائی ہے۔جدید دنیا میں شعورِذات کے لیے عورت کے سفر کا یہ انتہائی گھمبیر مرحلہ ہےاوراس کا احساس آزادیٔ نسواں کی تحریک کی مغربی مفکر خواتین کو بھی ہے چنانچہ اس تحریک کی ایک برطانوی مصنفہ شیلا روبوتھم نے اس مسئلے پر لکھتے ہوئے اس اندیشے کا اظہار کیا ہے کہ کہیں آزادیٔ نسواں کی تحریک بعض خود فریبیوں کی وجہ سے صرف مرد کے خلاف نفرت کی تحریک بن کر نہ رہ جائے نیز یہ کہ مرد کی اکڑ کے ردِّعمل میں عورت خود ایک غرور سے بھرا ہوا وجود نہ بن جائے۔بہرحال ان تحریکوں کے اگلے سفر کے بارے میں ابھی کوئی حتمی فیصلہ کرنا درست نہیں اور خود احتسابی کے یہ نئے مرحلے خود کسی نئے فیصلے کی طرف لے جائیں گے کشور نے جس عورت کی کہانی بیان کی ہے وہ سبھی پہلوؤں پر محیط نہ سہی یہ ایک طبقے کی عورت کے احساسات بھی ہو سکتے ہیں۔مگر جن پہلوؤں کو اُس نے اپنی شاعری میں بیان کیا ہے وہ جدید اردو شاعری کی اہم جہت ہیں۔

سہیل احمد

''باغیانہ شعری پیکر''

عصمت کی کہانیوں نے مسلم گھرانوں کے گھٹے ہوئے ماحول میں بالیدگی پانے والی لڑکیوں کا حال تو ہم سب نے پڑھا ہے،کشور ناہید کے یہاں بھی یہی لڑکی کلیدی کردار بن کر ڈھلتی عمر کی گریزاں ساعتوں تک اپنے بے شمار رنگ اور روپ کے ساتھ آنچل کو پرچم بنانے کی آزمائشوں کا سامنا کرتی ہوئی ملتی ہے۔

کشور ناہید کا یہی وہ باغیانہ شعری پیکر ہے جو اسے ملامتوں کے درمیان اپنے جسم و جان کی پوری توانائی اور تابناکی کے ساتھ متحرک اور زندہ رکھے ہوئے ہے۔عصمت اور قرۃ العین حیدر کی طرح اسے بھی ملامتوں کے تیر کھانے پڑے۔یہاں تک بھی ہُوا کہ کشور کو اجنبی مردوں کی طرح صرف ڈرائنگ روم تک آنے دیا جاتا اور گھر کے آنگن میں رسومات کی پازیبیں پہنی ہوئی عورتوں سے اس کا پردہ کرایا جاتا،لیکن پردوں اور چلمنوں سے جھانکنے والی متجسس نسائی آنکھیں اسے کسی نہ کسی طرح دیکھ ہی لیتیں اور اس کی آواز کی دھوپ کو اپنے سرد جسم میں اندر تک اتار لینے کا جتن کرتیں،کشور ناہید ان دیواروں کی دشمن ہے جن میں باہر کی طرف کوئی کھڑکی نہیں کھلتی،کشور کی شاعری باہر کی جانب کھلنے والی وہ کھڑکی ہے جو اندر کے حبس اور گھٹن کو باہر پھینک دیتی ہےاور تازہ ہواؤں کا گلاب اپنے پورے بدن پر چھڑک لیتی ہے،کشور اپنے عورت پن کا بے حد اونچی آواز میں اعلان کرتی ہے لیکن عورت کے اس مشرقی تصور کو ماننے کے لیے آمادہ نہیں جو مرد معاشرے نے ضابطۂ اخلاق کے طور پر اس کے لیے مقرر ومتعین کر دیا ہے۔

زبیر رضوی

''آزادیٔ نسواں کی باتیں''

کشور کے اکثر نقاد اسے روایتی مرد معاشرے کے خلاف،ایک باغی اور سرکش شاعرہ قرار دیتے ہیں جو مظلوم عورت کی جنگ لڑ رہی ہے۔کیا کشور کی شاعری صرف روایتی مرد بالادستی کے خلاف ایک مؤثر آواز تک ہی محدود ہے یا وہ اس سے آگے نکل کر پورے استبدادی معاشرے کو چیلنج کر رہی ہے؟اس میں شک نہیں کہ عورت ہونے کے ناطے اس کا فوری اور قریبی ہدف مرد کی روایتی بالادستی کا وہ استحصالی نظام ہے جس میں ہماری عورت برسوں سے جکڑی ہوئی ہے،لیکن میرا خیال ہے کہ کشور کی شاعری کا دائرہ صرف نسوانی سرکشی تک ہی محدود نہیں بلکہ استحصال کے پورے معاشرے کو تبدیل کرنے اور طبقاتی نظام کی جڑوں کو ہلانے تک پھیلا ہوا ہے۔عورت اس کے یہاں

استحصال زدگی کا ایک علامتی پیکر ہے جس کے ذریعے وہ بیک وقت مرد کی روایتی بالادستی اور پورے طبقاتی نظام کی جڑوں پر حملہ آور ہوتی ہے، اور یہ جو کسی نے کہا ہے کہ جدید سامراج اس وقت تک آرٹ اور لٹریچر کو کچھ نہیں کہتا جب تک وہ اس کی جڑوں پر حملہ آور نہ ہو، اور چونکہ کشور کی شاعری براہِ راست ان جڑوں پر حملہ کرتی ہے اس لیے دائیں اور بائیں بازو کے وہ تمام دانشور جو طبقاتی نظام کے خلاف بھی ہیں اور آزادیٔ نسواں کی باتیں بھی کرتے ہیں، اس کے خلاف ہیں۔

رشید امجد

''ہم آہنگی کی تلاش''

کشور کی شاعری اور شخصیت، یعنی فن اور فن کار دونوں کا سفر دراصل ایک ہم آہنگی کی تلاش کا سفر ہے۔ یہ تلاش کشور نے اپنی ذاتی سطح پر بھی کی ہے اور ایک اجتماعی سطح پر بھی۔ اس تلاش نے اسے اُداسی اور بے دِلی سے بیزاری، برگشتگی اور برہمی تک، کئی کیفیتوں سے دوچار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشور کی شاعری اور شخصیت کا تاثر عام شاعرات کے برعکس محض منجی اور رومانی نہیں ہے، نہ ہی اس کی بنیادیں محض نسوانی ہیں۔ کشور کی تلاش نے گھر کی چار دیواری سے لے کر اپنے مخصوص معاشرے اور اپنے زمانے تک، کئی حدیں منتشر کی ہیں۔ اس کا ایک اظہار کشور کے ترجموں میں بھی ہوا ہے جہاں وہ دیس بدیس کے شاعروں اور دانشوروں اور انقلابیوں کی آواز میں اپنی آواز کا سراغ پاتی ہے اور مختلف واسطوں سے اپنے عہد کی اور اپنی کہانی سناتی ہے۔

صبا حنفی

''پاکستانی عورت کی آواز''

مجھے کشور کی محنت کش ایماندارانہ زندگی اور مردانہ دانش سے محبت ہے۔ کشور کی آواز پاکستانی عورت کی آواز ہے۔ کشور کا وعدہ مسلمان عورت کا وعدہ ہے۔ کشور کی جدوجہد اس دنیا کی آخری عورت کی آزادی اور سرفرازی کی جدوجہد ہے۔ اس کارِ خیر میں وہ اپنے دور کے بہت سے دانشوروں سے کہیں آگے دکھائی دیتی ہے۔ یوں سمجھئے وہ کئی ہفت کشور فتح کرنے کی علمبردار ہے اور ابھی تک پابہ رکاب بھی۔ اس نے اپنے لئے مشقت کا میدان منتخب کیا ہے۔ یعنی قائد اعظم کے مقولے پر عمل کر رہی ہے۔

کام، کام اور کام

کشور کا کمال یہ ہے کہ دنیاوی لین دین میں اُس نے جو ہارا اور جیتا ہے نہایت ایمانداری اور شائستگی سے سب کے سامنے رکھ دیا ہے۔ وقت کا منصف کیا فیصلہ صادر کرتا ہے کشور کو اس سے قطعی غرض نہیں۔ غرض ہے تو اپنے کام سے جسے وہ عبادت جان کر مسلسل کیے جا رہی ہیں۔

ڈاکٹر شاہین مفتی

☆

عینی آپا سے غزلیہ خطاب

ہم سے دشوار پرستوں کو ہوا ڈھونڈتی ہے
جس جگہ جاؤ گے دیکھو گے قضا ڈھونڈتی ہے

یاد آجائے تو بیتابیِ جاں ایسی ہو
دل جدا ڈھونڈتا ہے، آنکھ جدا ڈھونڈتی ہے

وہ پری رو کہ یکتا تھی، سمن زار بھی تھی
خوش لباسی کے لیے اس کو قبا ڈھونڈتی ہے

باتیں کرتے ہوئے رو دینا، یہ عادت کیسی
شام سے پہلے ہی ہونٹوں کو دعا ڈھونڈتی ہے

میں وہ آئینہ کہ جس سے ہے گریزاں خواہش
میں وہ بادل جسے ساون کی گھٹا ڈھونڈتی ہے

آبلے آنکھ میں ٹھہرے ہوئے قلزم جیسے
کہہ رہے تھے کہ محبت بھی ردا ڈھونڈتی ہے

یہ زمیں دشتِ تحیر کی ثنا کرتی ہے
اور جب خواب سمیٹو تو فنا ڈھونڈتی ہے

اس کو فرصت بھی نہیں، مجھ کو تمنا بھی نہیں
پھر خلش کیا ہے کہ رہ رہ کے وفا ڈھونڈتی ہے

○

☆ وحشت اور بارود میں لپٹی ہوئی شاعری سے منتخبہ

''ورثہ''

(نعتیہ پنجابی نظم)

حنیف باوا
(جھنگ)

مکّے اتے مدینے دی
اوہناں گلیاں تے میں سیس نواواں
جی کرداا ے
جنہاں گلیاں تے
حضورؐ دا نت دا آونا جانا سی
اوہناں جتیاں دے میں صدقے جاواں
جی کرداا ے
جہڑیاں
پاک پوتر پیراں نوں
نت چُمدیاں سن، سکھ دیندیاں سن
اوس کمبلی نوں میں چُم لواں
جی کرداا ے
جو سدا حضورؐ دے سنگ رہی
انگ رہی
اوہناں ہتھّاں تے میں بوسے دیواں
جی کرداا ے
جیہڑے سوہنے ہتھ
بھکھن بھانے پتھر ڈوہندے کدی نہ تھکّے
جی کرداا ے
جگ دے شہشواں دے شہشاہ دی کٹیا ویکھاں
مہکاں ونڈدی کٹیا تکّاں

جیہدے اگّے
اُچے محل منارے وی
سیس نواواں
ایہہ وی میرا جی کرداا ے
جو اوہدی ٹھنڈی چھاں دے اندر
سُکھ دی نیندر سوں کے ویکھاں
مڑ نہ پچھے بھوں کے ویکھاں
جی کرداا ے
جی کرداا ے
چندر ما دے مُکھ توں سوہنے۔
مُکھ اوہدےؐ نوں ویکھا
رج رج کے ویکھاں
گج وج کے ویکھاں
جی کرداا ے
پر
در اوہدےؐ ول جاندیاں وتھاں
اوکھیاں راہواں
میں شوہدے نوں مار مکایا
مار مکایا
مار مکایا

○

بے دخلی

سید سعید نقوی
(نیویارک)

کسی آواز سے میری آنکھ کھلی تو میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا، وہ باہر برآمدے میں کھڑا تھا۔ یقیناً میری آنکھ اس کی موجودگی سے ہی کھلی تھی۔ پہلے تو میں اسے پہچان نہیں سکا۔ آنکھ کھلتے ہی ہر چیز ایک سی نظر آتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ذہن کے کسی گوشے میں شناسائی کے خلئے بیدار ہوتے ہیں تو شکل کے ساتھ ذہن میں ایک نام ابھر آتا ہے۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ آنکھیں مل کر دیکھا تو جیبوں میں ہاتھ ڈالے برآمدے میں کھڑا ہے۔ بہت سارے سوال بیک وقت ہی ذہن میں ابھرے۔ یہ کیسے گھر کے اندر گھس آیا، بیچ رات میں کیوں آیا ہے اور سب سے اہم یہ کہ اب میں اس کو ٹالوں کیسے۔

'یہ کیا طریقہ ہے جناب آپ گھر میں کیسے گھس آئے، مجھے یاد ہے سونے سے پہلے میں نے صدر دروازہ تو بند کر دیا تھا' میں نے ناگواری سے سوال کیا۔

'صدر دروازہ بند کرنے سے گھر محفوظ ہو جاتا ہے کیا؟ ہلکے سے دباؤ سے پچھلا دروازہ کھل گیا اور میں اندر آ گیا' اس نے ایسی لاپروائی سے کہا جیسے یہ ایک فطری عمل ہے جو اس کو کرنا ہی چاہئے تھا۔

'اب آ ہی گئے ہیں تو فرمایئے کیسے زحمت کی دن کی روشنی شاید آپ کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے' میں ذرا طنز سے کہا۔ نیک بخت جو اس کی آواز سن کر لحاف میں کچھ اور نیچے دبک گئی تھی اس نے ہلکے سے میری ران پر چٹکی بھری گویا انتباہ کر رہی ہو۔

'نہیں میاں دن کی روشنی مجھے تو نہیں کھلتی، لیکن آپ ضرور مجھے پہچان کر دروازہ بند کر لیتے یا آپ کو کوئی ضروری کام یاد آ جاتا۔ رات کی تاریکی میں آپ کی مدافعت پر بھی ذرا غنودگی سی طاری ہو جاتی ہے، پھر یہ کہ ملنا بھی ضروری تھا۔ آپ سے آخر ہمارے، بہت دیرینہ تعلقات ہیں، بیٹھنے کو نہیں کہیں گے؟'

'اب آپ اندر آ ہی گئے ہیں، چور دروازے سے اور وہ بھی رات کی تاریکی میں تو ذرا بتایئے میں اس وقت آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟' اس کو بیٹھنے کی دعوت دینا ایسا ہی تھا گویا کوئی عرب اونٹ کو خیمے میں گردن گھسانے کی اجازت دیدے۔ وہ وہیں برآمدے میں کھڑا رہا اور میں کمرے کی کھڑکی کے اس پار۔

'آپ کو بخوبی علم ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں'

'مجھے واقعی نہیں معلوم، سب خیریت تو ہے آپ کے گھر میں' میں انجان بنا رہا۔

'جی میرے گھر میں تو سب خیریت ہے، یوں کہئے آپ کی خیریت نیک مطلوب چاہتا ہوں' لگتا تھا اشاروں کنائے میں یہ بھی پی ایچ ڈی کر کے آیا ہے۔

'میں سمجھا نہیں؟' میں بھی ڈھیٹ بنا رہا۔

میں اپنا قرضہ واپس لینے آیا ہوں'۔

اس کے منہ سے وہی نکلا جس کا مجھے ڈر تھا۔ بیچ رات میں بنا بلائے کوئی اپنے گھر کے برآمدے میں کھڑا ملتا تو بقول پطرس بخاری، میں بھی عدم تشدد کو خیر آباد کہہ دیتا۔ مگر یہاں دو مسائل ذرا گھمبیر تھے، ایک تو یہ جسمانی طور پر وہ مجھ سے بہت زیادہ طاقتور تھا، دوسرے میں اس کا مقروض تھا۔ لفظ مقروض شاید اس دلدل کو بیان نہ کر سکے جس میں گھرا تھا۔ میرا بال بال نہیں بلکہ یوں کہئیے میرا رواں رواں قرض میں جکڑا ہوا تھا۔ یہ کیا ہوا، کیوں ہوا، معاملہ اس حد تک کیسے پہنچا فی الوقت یہ بحث فضول ہے۔ میں نے لفظ فی الوقت بہت سوچ سمجھ کر اور ارادتاً استعمال کیا ہے۔ دیکھیئے جب کہیں آگ لگی ہو تو فوری مسئلہ آگ بجھانے کا ہے۔ آگ کیوں لگی یہ تحقیق بعد کی بات ہے۔ اس تحقیق کی اہمیت سے انکار نہیں کہ بہتری ابتری سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ تو فوری مسلہ آگ پر قابو پانے کا ہے۔ یہ قرضہ بیوی کی شاہ خرچی کی وجہ سے ہوا ہے یا میری جمع تفریق میں نالائقی کی وجہ سے، فی الوقت یہ بات خارج البحث ہے۔ دوسرے یہ کہ اس بحث سے میرے اور اس نیک بخت کے درمیان گھمسان کا رن پڑنے کا اندیشہ ہے۔ سب سے آسان حل یہ ہوگا کہ ہم ایک دوسرے کو الزام دیں، تم یہ نہ کرتیں تو آج یہ دن نہیں دیکھنا پڑتا وغیرہ، وغیرہ۔ جبکہ اس وقت ضرورت یہ ہے کہ ہم دونوں مل اس بری گھڑی کو ٹالیں۔

لیکن سیٹھ صاحب یہ تو بیچ رات ہے اور اس وقت تو میرے پاس پیسے بھی نہیں ہیں، ابھی فوراً کہاں سے دوں کچھ وقت کی مہلت اور دے دیں'۔

'کچھ روز کی مہلت، یہ جملہ تو سمجھئے پارلیمانی لہجے سے باہر ہو گیا ہے، اس نکتے پر مذاکرات اب نہیں ہوں گے۔ سیٹھ کی اپنی ایک الگ بھاشا تھی۔ اتنے سالوں اس سے معاملہ کرنے کے بعد میں یہ سمجھ گیا تھا کہ یہ نکتہ اب مزید کام نہیں آئے گا۔

'اگر مہلت ممکن نہیں اور میرے پاس پیسے بھی نہیں تو پھر کیا ہو سکتا ہے' عجیب سی دیت پسند طبعیت تھی میری۔

'ایک صورت ضرور ممکن ہے اور وہ ہے قرقی۔ وہ پھر سرمایہ دارانہ لہجے میں بولا۔ اس کی زبان سے وہ الفاظ نکل رہے تھے جن سے میرے کان یا تو نا آشنا تھے یا اس وقت ایسے بن گئے تھے جیسے کسی کے کان میں عبرانی انڈیلی جا رہی ہو۔

'قرقی؟' میرا لہجہ سوالیہ تھا۔

'جی قرقی کوئی نیا قانون تو نہیں ہے۔ صدیوں سے ہوتا چلا آیا ہے۔ جب لوگ اپنی اوقات سے زیادہ خرچ کرنے لگتے ہیں تو اکثر ان کی

جائیداد اور وراثت قرق ہوجاتی ہے۔

'آپ کون ہوتے ہیں مجھے اوقات یاددلانے والے' میں نے ایک بے تیغ سپاہی کی طرح جوابی حملہ کیا۔

'اگر آدمی خود اپنی اوقات نہ بھولے تو دوسروں کو اسے اوقات یاد دلانے کی ضرورت نہیں پڑتی'۔ طاقت اور دولت نے اس کے لہجے میں خوداعتمادی، طنز، کنایہ، ٹھہراؤ سب ہی تو بھر دیا تھا۔ کیا کوئی طاقتور، امیر آدمی حلیم الطبع ہوسکتا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ شکر ہے رات کی تاریکی میں وہ انہیں دیکھنے سے قاصر تھا۔ یا صرف یہ کمزور کی زودرنجی ہوتی ہے کہ طاقت کا لہجہ کھل جاتا ہے۔ گفت وشنید یا مذاکرات تب ہی متوازن ہوسکتے ہیں جو برابری کی بنیاد پر ہوں۔ اگر ایک فریق بہت زیادہ طاقتور ہو یا دولت مند ہو تو توازن نہ بگڑنا باعثِ حیرت ہوگا۔

'کیا آپ مجھے بے گھر کر دیں گے' مجھے لگا جیسے نیک بخت نے لحاف کے اندر کروٹ لی ہو۔

'اس کے علاوہ کیا چارہ ہے۔ اگر اس وقت مجھے پیسوں کی اشد ضرورت نہ ہوتی تو میں یہ انتہائی قدم کبھی نہ اٹھاتا۔ آپ خود ہی سوچیے سارے دروازے تو آپ نے خود ہی بند کر دیئے۔ اب میں خود اپنے مفادات کو تباہ کرلوں یا آپ کے مکان کی فروخت سے اس کا تحفظ کرسکوں، آپ کسی چھوٹی جگہ منتقل ہو جایئے' اس نے ہمدردی سے کہا۔ مجھے پتہ تھا وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ برآمدے تک آنے والی چاندنی میں اس کے سامنے کے دو دانت اچانک لمبے ہو کر اس کے بند منہ سے باہر نکل آئے تھے۔ خون آشام نے تازہ شکار کی بوسونگھ لی تھی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی اپنی جائداد ایک وسیع اراضی پر پھیلی ہے۔ میرے مکان پر اس کی نظر صرف اس کی توسیع پسندی کے پیٹ کا ایندھن ہے۔ شکاری کا پیٹ بھرا ہوا بھی ہو تو بھی وہ عادتاً ہراس ہرنی پر تیر چلانے سے باز نہیں آتا۔ لیکن اس سے کیا بحث کروں، قصور میرا اپنا ہے۔ اپنے آپ کو اس گرداب میں پھنسانے کا ذمہ دار میں خود ہی تو ہوں۔ عدالت کا رخ کروں تو کس برتے پر۔ میرا مقدمہ اتنا کمزور ہے کہ سمجھئے ہے ہی نہیں، جگ ہنسائی کا سبب بنوں گا۔ بچت کا صرف یہی طریقہ تھا کہ اس کی کسی نیک خصلت کو ابھاروں۔ اس کو جذباتی ہیجان اور پشیمانی میں مبتلا کروں شاید مہلت دیدے۔

'آپ میرا گھر قرق کر کے کیا حاصل کریں گے۔ کوئی اور راستہ سوچتے ہیں ادائیگی کی قسطوں میں اضافہ کر دیجئے۔ شرح سود بڑھا لیجئے، میں ہر صورت میں راضی ہوں، خدارا ہم کو بے گھر تو نہ کیجئے'۔ میری آواز میں بے چارگی تھی۔ مجھے لگا لحاف میں گھسی نیک بخت نے بھی ایک سسکی بھری ہے۔ شاید یہ سسکی اس نے بھی سن لی تھی۔ اس نے کچھ ہچکچاتے ہوئے ایک توقف کے بعد جواب دیا۔

'ایک صورت اور ہوسکتی ہے'

'وہ کیا صورت ہے؟' امید کی کرن پھوٹ پڑی۔ انسانیت اور شرافت پر پھر میرا اعتماد بحال ہونے لگا۔ وہ دوسرا حل بتانے سے ہچکچا رہا تھا۔

'بتائیں تو جناب وہ دوسرا حل کیا ہے؟'

'دوسری صورت یہ ہے کہ آپ اپنے بچے مجھے دیدیں، میں انہیں پال لوں گا۔ لکھاؤں گا، پڑھاؤں گا، میرے کام آئیں گے، میرے بھروسے کے آدمی بنیں گے'۔ میری امیدوں پر پانی پڑ گیا۔ جہاں معاملہ ہوس اور توسیع پسندی سے ہو وہاں شرافت اور انسانیت کی امید کرنا، شرافت اور انسانیت کی توہین ہے۔

'نہیں' اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا، نیک بخت نے لحاف پھینک کر دوسرے پلنگ پر لیٹے دونوں بچوں کو سینے سے لپٹا لیا۔ 'نہیں آپ یہ بچے ہم سے نہیں لے سکتے، یہی تو ہمارا مستقبل، یہی تو سہارا ہیں'۔

'بھابی جان قرضہ اتنا بڑھ چکا ہے کہ یہ بچے بڑے ہو کر بھی میرے مقروض رہیں گے۔ انہیں وہی کرنا ہوگا جو میں کہوں گا۔ ابھی سے میرے حوالے کردیں تو میں قرض معاف کرنے کو تیار ہوں۔ ذرا دوراندیشی سے کام لیجئے' اس نے نہایت سلاست سے سمجھایا۔

'بھابی جان' کمبخت کیسی شرافت اور اپنائیت سے مخاطب تھا۔ میں بالکل نہیں چاہتا کہ یہ میری بیوی کو بھابی جان کہے۔ بہتر یہ ہے کہ اسے اس کے نام سے پکارے۔ اپنے خون آشام لہجے میں، بڑے بڑے دانتوں، لمبی سی ناک اور ڈراؤنے چہرے کے ساتھ۔ کم از کم پتہ تو ہوگا کہ ہم کس سے معاملہ کر رہے ہیں، چھری کس سمت سے آرہی ہے۔ 'بھابی جان' سے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی مغل دربار میں کوئی فرنگی تاجر بادشاہ سلامت کو مخمل میں لپٹا خنجر پیش کر رہا ہے۔ شیطان اصلی شکل میں ہو تو پہچان کر اس سے بچا جا سکتا ہے۔ یہاں معاملہ ایسے موذی سے تھا جس کے چہرے پر معصومیت اور زبان میں شیرینی تھی۔

'نہیں میں اپنے بچے کسی قیمت پر نہیں دوں گی، مرجاؤں گی مگر نہیں دوں گی' نیک بخت کسی شیرنی کی طرح دونوں بچوں پر سایہ کئے تھی۔

'آپ کی اولاد ہے، آپ کو پورا حق ہے جو چاہے فیصلہ کریں۔ میں تو صرف زمینی حقائق کی نشاندہی کر رہا ہوں۔ ساری عمر مقروض رہنے والی اولاد میری غلام نہیں رہے گی اور کیا ہوگی۔ اور اگر میرا حساب اتنا کمزور نہیں ہے تو، یہ تو کیا آپ کے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں بھی انشاء اللہ میرے بچوں اور پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں کو بٹھا کر کھلائیں گے۔ میں تو آپ کو گلوخلاصی کا راستہ دکھا رہا ہوں۔ یہ حل قبول نہیں ہے تو قرقی کا راستہ کھلا ہی ہے'۔

نیک بخت کچھ کہتی یا نہیں یہ راستہ خود مجھے بھی قبول نہیں تھا۔ ذہن بالکل ماؤف تھا۔ اب مجھے سمجھ آرہا تھا لوگ خودکشی کیوں کر لیتے ہیں۔ لیکن میرے خودکشی کر لینے سے نیک بخت اور میرے نام لیوا بھی سکون نہ پاتے، یہ مسئلہ جوں کا توں رہتا، کوئی اور حل نکالنا پڑے گا۔

'کوئی اور حل سوچئے، کوئی اور طریقہ ضرور ہوگا۔ آپ جو کہیں گے وہ میں کرنے کو تیار ہوں' میں نے کہہ تو دیا مگر ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں تو کیا گھنٹا

گھر پورے زور سے بج رہے تھے، گویا کسی ہونے والی فوتگی کا اعلان کر رہے ہوں۔

'جو میں کہوں گا وہ تو آپ کریں گے ہی لیکن اس سے میرا قرض تو ادا نہیں ہوگا۔اب اس قرض کی ادائیگی کسی طرح تو آپ کریں گے یا نہیں؟'اس کے لہجے میں تیزی تھی۔'یوں سمجھیئے کہ یہ مکان قرق کر کے بھی مجھے گھاٹے کا سودا ہی رہے گا'۔

'وہ کیسے'، میں پوچھے بنا نہ رہ سکا

'وہ ایسے کہ اب اس مکان میں بچا کیا ہے، کوئی اس کی کیا قیمت دے گا'، میری آنکھوں میں بے یقینی دیکھی تو اس نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی زور سے کھڑکی پر ماری تو اس کا پٹ نیچے آگرا۔

'دیکھا کس قدر رسالخوردہ ہے، آپ میری بات پر یقین نہیں کر رہے تھے'

'معاف کیجئے گا، کمبخت دیمک چاٹ گئی اس کو، بس میں بدلوانے ہی والا تھا کھڑکیاں' میں نے شرمندگی سے کہا۔

'اور بدلوانے کے پیسے کہاں سے آتے، مجھ سے ہی مزید ادھار مانگتے' اس کا یقیناً مذہب مختلف ہے کہ گرے ہوئے کو اس وقت تک مارتے رہو جب تک کہ وہ دم نہ دے دے۔وہ پورے پندرہ راؤنڈ کا قائل نہیں تھا، غالباً کہیں اور بھی جانا تھا وصولی کے لئے۔

آپ کہیں تو مزید نمونے پیش کروں۔اس کی منحوس آواز کانوں میں گونجی۔اس سے پہلے کہ میں کچھ کہہ سکتا، اس نے چھڑی دیوار میں گھسا دی۔ چھڑی دیوار کے آر پار ہوگئی۔ میری آنکھیں تقریباً باہر نکل آئیں۔ میری دیواریں اتنی بوسیدہ ہو چکی ہیں، ابھی کچھ زیادہ دن تو نہیں ہوئے اس گھر کو بنے۔معمار بھی بہت دیکھے بھالے تھے، بہت خون پسینے کا گارا لگا تھا، پھر یہ حال کیسے ہو گیا۔کیا موسم بہت نا موافق تھا، میں نے متوحش نظروں سے اسے دیکھا۔وہ فاتحانہ نظروں سے مجھے ہی دیکھ رہا تھا جیسے چیلنج کر رہا ہو، اب بھی یقین نہ آیا ہو تو اور مثالیں پیش کروں۔

'یہ کیسے ہو سکتا ہے' میں نے بے اعتباری سے پوچھا

'مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو۔اپنے آپ سے پوچھو۔یہ سب ایک دن میں تو نہیں ہو گیا۔لگتا ہے، بہت محنت کی ہے تم نے اسے بگاڑنے میں۔یقین جانو تو مجھے بھی اس قدر بری حالت کی امید نہیں تھی، لگتا ہے میرا تو سارا پیسہ ڈوب گیا'۔

'نہیں، نہیں میں نے تو بہت خیال رکھا تھا' مجھے خود اپنی بات جھوٹ لگی۔

'کیا خیال رکھا تھا بتاؤ، ذرا پیچھے مڑ کر دیکھو، سوچو، بتاؤ کیا خیال رکھا تھا؟'

'ہم پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے، کیا رکھا ہے اس میں۔ہم آگے بھی نہیں دیکھتے۔بھئی حال میں زندہ رہنے میں جو مزا ہے وہ کہیں اور ممکن نہیں' میں نے اسے فخر سے سمجھایا۔

'صحیح کہہ رہے ہو، پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہیئے لیکن اگلا پچھلا حساب تو رکھنا چاہیئے۔کبھی مرمت بھی کی تھی اس کی۔کہیں کا پلستر ادھڑ جائے تو اسے فوراً رفو کرنا پڑتا ہے، نیا پلستر لگانا پڑتا ہے، ورنہ بارش رس رس کر ساری دیوار خراب کر دیتی ہے۔تمھارے پاس کوئی کاپی، کوئی رجسٹر کوئی رسیدیں ہیں کہ تم نے کہاں کہاں درستگی کرائی تھی'

'نہیں میں نے حساب تو نہیں رکھا، زیادہ ضرورت پڑی ہی نہیں' میں نے ذرا شرمندگی سے کہا۔

'ضرورت نہیں پڑی، تو وقتاً فوقتاً جو تم مکان کے نام پر قرض لیتے رہے ہو مجھ سے اس کا کیا کیا؟' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔میں نے اور نیک بخت نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور شرمندگی سے ہماری آنکھیں ایک ساتھ جھک گئیں۔ میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور دیتا بھی تو کیا۔پیسے لئے تو ضرور تھے لیکن کبھی کہیں سیاحت کے لئے نکل گئے، کچھ نیک بخت کو زیور کا شوق بھی زیادہ ہے۔پھر یہ کہ میں بھی ذرا نئی گاڑی اور ٹیپ ٹاپ کا خیال رکھتا ہوں۔آدمی اپنی ظاہری حیثیت سے ہی پہچانا جاتا ہے، بہت خیال رکھنا پڑتا ہے اپنی ظاہری حالت کا۔ہیرے کو ٹاٹ کے ٹکڑے میں لپیٹ کر رکھ دیجئے کوئی دوسری نظر نہیں ڈالے گا۔کچھ پیسہ پرانے قرضے اتارنے میں خرچ ہو گیا۔ہزار خرچے ہوتے ہیں کوئی ایک خرچ ہو تو بتاؤں۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ بجٹ کے وقت اخراجات منہ پھاڑے کھڑے ہو جاتے ہیں۔اب میں اسے کیا سمجھاؤں، مجھ پر جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی۔

'تم نہیں سمجھو گے، تم کبھی ان حالات سے گذرے ہی نہیں، منہ میں چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے ہو گے' میں نے اپنی بے بسی کا انتقام گویا لہجے کی کاٹ سے لیا۔

'نہیں ایسا تو نہیں۔ہمارا گھر بھی ایک بار دھویں سے بھر گیا تھا۔مگر ہم گھر کو چھوڑ کر بھاگے نہیں، سب نے مل کر آگ بجھائی، پھر جہاں جہاں آگ سے نقصان ہوا تھا اس جگہ کو دوبارہ تعمیر کیا۔بس ذرا خیال رکھا تھا کہ چولہا اور باورچی خانہ ذرا دور ایک کونے میں تعمیر کریں کہ اگر آگ لگے بھی تو پھیلے نہیں۔ مقامی آگ پر نسبتاً آسانی سے قابو پایا جا سکتا ہے، پھر یہ بھی کوشش کی کہ چولہے کو ہوا کے رخ سے ذرا دور رکھیں۔بھئی چولہا تو ہر گھر میں ہوتا ہے اس سے تو مفر نہیں لیکن ہوا کے رخ سے اسے الگ کر دیا تو یہ آگ دوبارہ پھیلی نہیں' وہ اپنی سوچ میں بہت دور نکل گیا تھا۔

'نقصان تو بہت ہوا ہوگا'

'ہاں نقصان تو بہت ہوا تھا۔ جانیں بھی بہت ضائع ہوئی تھیں۔لیکن اس سے ہمیں سبق ملا۔مکان کے نقشے کا دوبارہ جائزہ لیا، چہار دیواری دوبارہ مضبوط کی، دیواریں کھڑکیاں ٹھوک بجا کر دیکھیں۔اب حالات یہ ہیں کہ اپنا گھر مضبوط کر لیا ہے۔اب ہم دوسری سالخوردہ یا خطرے میں گھری عمارتیں خرید کر یا تو انہیں مسمار کر دیتے ہیں۔اگر زمین اچھی جگہ اور مہنگی ہو تو اس

پر نیا ڈھانچہ کھڑا کر لیتے ہیں۔ ورنہ پرانا فرنیچر ،لکڑی وغیرہ بیچ کر اچھے پیسے بن جاتے ہیں۔ اکثر تو اس کباڑ سے ایسی ایسی نادر چیزیں ملتی ہیں کہ ساری محنت وصول ہو جائے'۔ وہ اپنے جذب کے عالم میں مجھے اتنا کچھ بتا گیا جو شاید ویسے نہ بتاتا، اسے شاید خود بھی اس بات کا احساس ہو گیا۔

'اس وقت بات میری نہیں آپ کی ہو رہی ہے' اس نے لہجے میں تلخی کے باوجود طرزِ تخاطب شائستہ ہی رکھا۔

'بھئی کچھ کوشش تو میں نے بھیا اپنے مکان کو اچھا رکھنے کی کی تھی لیکن یہاں شب خون اتنی بار پڑا کہ دیواریں ہمیشہ کے لئے شکستہ ہو گئیں۔ یہ جو تم نے اپنی چھڑی دیوار میں گھسائی تھی یہیں ایک بار نقب لگ چکی ہے۔ ایک بار نقب لگ جائے تو پھر دیوار میں وہ مضبوطی کہاں سے آتی ؟'

'لیکن تمھارے محلے میں تو اتنی چوریاں نہیں ہوتیں۔ تمھارے پڑوسی بھی میرے مقروض ہیں، ان کے احوال سے میں واقف ہوں، کبھی نقب زنی کی اطلاع تو نہیں آئی'

'بس اب کیا بتاؤں' میں شرمندگی سے اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔

'نہیں بتاؤ، بتاؤ، میرے لئے جاننا بہت ضروری ہے۔ جانکاری اور معلومات میرے کاروبار میں سمجھو، کامیابی کی کلید ہیں' اس نے میرا حوصلہ بڑھایا۔

'بھئی اندر سے ہی نقب لگتی رہی۔ میرے کچھ سسرالی رشتہ دار ایسے نکلے کہ یہاں رہتے اور نقب لگاتے رہے۔ ہم نے تنگ آ کر کئی دفعہ چوکیدار بھی رکھا۔ قسمت کی خوبی دیکھئے کہ وہ اِن سب سے بڑے چور نکلے' وہ میری داستان بہت دلچسپی سے سن رہا تھا۔

'اب جو بھی ہے، قرضے کی واپسی کی طرف آؤ، مجھے پیسے کی فوری اوراشد ضرورت ہے۔ میں دو حل تجویز کر چکا ہوں، لگتا ہے قرقی ہی ہوگی۔ یہ نقب کی کہانی میں کئی گھرانوں میں سن چکا ہوں، تم لوگوں کو سبق سیکھنا چاہئیے تھا۔ اب اس مکان کو دیکھ کر اپنی حماقت پر افسوس ہو رہا ہے۔ معلوم نہیں میرے آدمیوں نے اس جائداد کے عوض اتنی رقم کیسے دیدی۔ بھئی یہاں تو بنیادی ڈھانچے میں بھی مسائل ہیں'۔

'نہیں ڈھانچہ بہت مضبوط ہے اس میں کوئی مسئلہ نہیں' میں نے ذرا ناگواری سے کہا۔

'یہ چھت اتنی نیچی کیوں ہے، آجکل تو اونچی چھتوں کا فیشن ہے'

'بھئی کیا بتاؤں اونچی چھتوں میں آواز گونجتی ہے۔ میری بیوی کے کچھ رشتہ دار یہاں رہتے ہیں وہ اپنی آواز سننا نہیں چاہتے، تمھیں تو معلوم ہی ہے اونچی چھت سے بازگشت پیدا ہوتی ہے اور ہم اپنی بازگشت برداشت نہیں کر پاتے۔ ویسے آپ صحیح کہہ رہے ہیں، چھت اونچی ہی رکھوانی چاہئیے تھی۔ اب نیچی چھت ہونے کی وجہ سے سیدھا کھڑا ہونے میں دشواری ہوتی ہے، فوراً سر ٹکرا جاتا ہے' 'اور خرابیاں گنواؤں ڈھانچے کی؟'

'بھئی جیسا بھی ہے میرا گھر ہے۔ تمھیں کچھ پتہ ہے نہیں بلا وجہ خرابیاں گنوا رہے ہو۔ دراصل ابا میاں کو ان کے خالو نے پالا تھا۔ جب خالو کا انتقال ہوا تو ابا میاں کو وہ گھر مجبوراً چھوڑنا پڑا۔ بیوی بچوں کے ساتھ سر پر چھت تھی نہیں، جلدی میں جو نقشہ بن سکا بن گیا، اس پر فوراً تعمیر شروع ہو گئی۔ میری غلطی یہ ہے کہ میں اس کی مرمت اور مضبوطی پر توجہ نہیں دے سکا۔ بس بیرونی آرائش ورنگ وروغن سے کام چلا لیا۔ لگتا ہے اندر سے یہ کھوکھلا ہوتا رہا اور باہر سے دیکھنے والے اسے مضبوط سمجھتے رہے، قصور میرا اپنا ہے'۔

'مجھے انگلیاں اٹھانے اور الزام تراشی کی نہ فرصت ہے نہ عادت۔ تم میاں بیوی یہ کام کرتے رہو۔ قصور کس کس کا ہے، یہ سب کیوں ہوا، اب عذر تراشنے بند کرو۔ مجھے اپنا قرضہ واپس چاہئیے۔ اتنی لمبی بحث اور کہانی سے کیا فائدہ۔ میں نے حجت تمام کر لی، میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میرا قرض واپس کر دو، تم اپنے گھر خوش میں اپنے گھر خوش۔ نہیں واپس کر سکتے تو اپنی نسل مجھے دے دو، یہ بھی نہیں کرنا چاہتے تو مکان قرق تو ہوگا اور ہوگا بھی آج ہی کی تاریخ میں۔ شکر ہے تم مجھے اس سے نہیں روک سکتے۔ قانون میرا ساتھ دے گا، یہ تو تمھیں بھی علم ہے۔ اگر تم نے قانون سے آنکھ بند کر لی ہے تو قانون تو تمھاری طرف سے اندھا نہیں ہو گیا' اس نے گویا بات تمام کر دی۔

'جب تم نے ٹھان ہی لی ہے تو پھر جو چاہو کرو، لیکن اب یہاں سے دفعان ہو' شکست خوردہ لہجہ جارحانہ ہونے میں دیر نہیں لگاتا۔ صبح سے پہلے تو یہ کچھ کر نہیں سکتا، صبح ہو گی عدالت کھلے گی، یہ قرق نامہ حاصل کرے گا پھر آئے گا۔ ان چھ آٹھ گھنٹوں میں کوئی ترکیب ذہن میں آ جائے گی۔ مجھے اپنی ہشیاری پر پورا بھروسہ تھا، یہ نوبت اس سے پہلے بھی کئی بار آ چکی تھی۔ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آتا تھا۔

'چلو اب نکلو یہاں سے'، میں نے اسے باہر نکال کر اندر سے چٹخنی لگا لی۔ حالات نے ثابت کیا کہ میں اپنے آپ کو جتنا عقلمند سمجھتا تھا، اتنا میں تھا نہیں۔ صبح سے شام ہو گئی کوئی صورت نہیں بنی۔ دوسرے ساہوکاروں نے بھی قرضہ دینے سے انکار کر دیا۔ کچھ میرے حالات سے واقف تھے اور کچھ بڑے سیٹھ سے خوفزدہ۔ میں مرتے قدموں گھر واپس لوٹا کہ پھر اس سے خوشامد کروں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جہاں میرا گھر تھا وہاں اب صرف ملبے کا ڈھیر ہے۔ ایک بلڈوزر بچے کچے گھر کو مسمار کر رہا ہے۔ وہ بدبخت اس ملبے پر اکڑوں بیٹھا ہے۔ ملبے پر ایک بورڈ لگا دیا ہے جس پر جلی حروف میں لکھا ہے 'نئی ملکیت'۔

'یہ میرا گھر تھا، یہ تم نے کیا کیا؟' میرے منہ سے بَین کی سی آواز نکلی گھر اس کا ہوتا ہے جو اس کی حفاظت کر سکے، ورنہ ملکیت بدل جاتی ہے۔ اب میں یہاں جو نیا مکان بناؤں گا تم چاہو تو بحیثیت کرائے دار اس میں رہ لینا' اس نے بہت رسانیت سے مجھے سمجھایا، میرا بریف کیس ہاتھ سے لے کر رکھا اور مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔

''بندگیٔ صنم''

ڈاکٹر رینو بہل

(چنڈی گڑھ،بھارت)

6/10/10

مرے ہم نفس،

کیا بات ہے وطن کا بہادر فوجی افسر تین مہینے میں ہی اُداس ہو گیا یا گورائی کی برفباری کے قہر سے گھبرا گیا؟ اس سے پہلے بڑھا چڑھا کر لکھ رہے تھے کہ تم ایک بار گورائی کی خوبصورت حسین وادیوں میں آ جاؤ تو سب کچھ بھول جاؤ گی۔ اونچی ہمالیہ کی بلند پہاڑیاں، نیچے کل کل بہتا نیلم دریا جس میں نیلے آسماں کا عکس پانی کو بھی صاف نیلے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ بناوٹی دنیا سے دُور قدرت کے خوبصورت نظارے نیلا شفاف کھلا زمین پر جھکا آسمان، پہاڑیوں میں جگہ جگہ سے اُٹھتے بادل، تازہ ٹھنڈی ہوائیں اب کہاں گئیں؟ اب تیز برف باری نے منظر ہی نہیں بدلا زندگی بھی بدل ڈالی۔ بقول شاعر:

خوشبو کے جزیروں سے ستاروں کی حدوں تک
اس شہر میں سب کچھ ہے بس اک تیری کمی ہے

سچ کہوں تو تمہارا خط پڑھ کر محسوس ہوا کہ جس پر گزرتی ہے پتا اُسی کو چلتا ہے۔ ہم لوگ کتنے آرام سے سردی میں اپنے گھر بستر اپنی رضائی میں دب کر سو جاتے ہیں اور تم لوگ وہاں ٹھٹھرتی سردی میں رات رات بھر جاگتے ہو۔ Minus 20 ڈگری تاپمان میں رات رات بھر جاگ کر ڈیوٹی دینا اور پھر برف میں پیدل ایک پوسٹ سے دوسری پوسٹ کا سفر کبھی پانچ تو کبھی چھ گھنٹے میں طے کرنا، ہر حال میں اپنے پیروں کو جمنے (Frozen feet) سے بچانا اُس کے لیے طرح طرح کی ترکیبیں کرنا۔ اُس پر ستم یہ کہ کئی کئی روز ایک ہی طرح کے کھانے سے بھوک مٹانا۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ تم جیسے چٹورے کا کیا حال ہوتا ہوگا جب ہر روز آلو کھا کر ہی صبر کرنا پڑتا ہو۔ آج محسوس ہو رہا ہے کہ ہم اپنی آزادی کا جشن اسی لئے منا پا رہے ہیں کیونکہ تم لوگ قربانیاں دیتے ہو اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی تبھی ہمیں بڑی خوشی نصیب ہو پاتی ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے فخر ہے کہ میرا دیپک وطن کی حفاظت کر رہا ہے۔ تم فکر مت کرو اسی طرح یہ باقی کے چھ مہینے بھی کٹ جائیں گے۔ تُم نے تو پہلے سے ہی خود کو ذہنی طور سے تیار کر رکھا تھا اس دُوری اور ایسے ماحول کے لیے، پھر اب دِل چھوٹا مت کرنا۔ وعدے کے مطابق برابر خط لکھتی رہوں گی تُم بس اپنا خیال رکھنا۔

تمہاری شرمیلا

2/11/10

مرے ہمنوا،

تُم نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ ایک کورے کاغذ پر اپنے ہاتھوں کے نشان بنا کر بھیج دینا، تمہاری اس بات کو میں نے ہنسی میں اُڑا دیا تھا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا تھا ''شدائی''۔ میں نے سوچا تھا کہ اکیلے اتنی دور رہ کر کیسی کیسی باتیں سوچنے لگے ہو۔ ویسے تو ہمیشہ کہتے ہو کہ تمہاری صورت میری آنکھوں میں بسی ہے۔ تمہاری ہی جیب میں تمہارے سینے سے ہر وقت میری تصویر لگی رہتی ہے پھر ان ہاتھوں کے نشان کی کیا ضرورت آن پڑی؟ تم نے لکھا تھا کہ ''ان ہاتھوں کے نشان پر اپنا ہاتھ رکھ دوں گا تو لگے گا تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے''۔ پڑھ کر میں ہنس پڑی تھی۔

تیرا ذکر سن کے تڑپ اُٹھے تیرا نام آتے ہی رو دیئے
مجھے ایک نسبتِ خاص ہے تیرے ذکر سے تیرے نام سے

اور دیکھو کل شام تمہاری یہ بات جسے میں نے ہنسی میں اُڑا دی تھی، مجھے ہی منہ چڑھانے لگی جب میں ڈھلتی ہوئی اُداس شام سے نجات پانے کے لیے سمندر کے کنارے اکیلے ٹہل رہی تھی اور گزرے لمحوں کو اپنے ذہن میں زندہ جاوید کر کے اُن میں ڈوب جانا چاہتی تھی اُن لمحوں کی یاد شدت سے آ رہی تھی۔ جو ہم نے اِک ساتھ ننگے پاؤں ریت پر چلتے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے وہاں گزارے تھے۔ سمندر کی تیز لہریں ہماری طرف بڑھتی اور ہمیں ٹانگوں تک بھگو کر پلٹ جاتیں۔ لہروں کے لوٹتے ہی ہمارے پاؤں ریت میں اور گہرے دھنس جاتے تو ہمارے ہاتھ خود بخود اِک دوسرے کو مضبوطی سے تھام لیتے۔ ننگے پاؤں کو سمندر کے ٹھنڈے پانی کا سپرش اور ہاتھوں کو تمہارے ہاتھوں کا گرم لمس، کتنا سکون دیتا تھا اور کل شام نہ وہ پورا چاند متاثر کر سکا نہ وہ ننگے پاؤں دیر تک گیلی ٹھنڈی ریت پر چلنا اور نہ ہی اُن لہروں کا میرے پیروں سے لپٹ کر اٹکھیلیاں کرنا۔ لہریں آتیں مجھے چھوتیں تو میرے ہاتھوں کو ادھورا پن محسوس ہوتا۔ اُس وقت شدت سے تمہاری ہتھیلیوں کی گرماہٹ محسوس ہوئی تھی اور میں سمندر کو اپنی آنکھوں میں ضبط کر کے گھر لوٹ آئی۔ آتے ہی دونوں ہاتھ چھاپ دئے۔ پھر جلدی سے ہاتھ دھوئے کہیں یہ مہندی رنگ نہ چھوڑ دے اور میں سوالوں کے گھیرے میں پھنس جاؤں۔

لو تمہاری یہ آرزو بھی پوری کر دی۔ اب دونوں ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دینا۔ میں بھی سمجھ لوں گی کہ میرے ہاتھ تمہارے ہاتھوں میں ہیں۔ اب تو خوش ہونا! فلحال اسی سے کام چلا لو۔

تمہاری اپنی
شرمیلا

1/12/10

مرے چارہ گر،

پچھلے خط میں تم نے لکھا ہے کہ تم جلد ہی اپنے ممی پاپا کو ہمارے گھر بھیج رہے ہو ہمارے رشتے کی بات کرنے۔ ہم دونوں نے فیصلہ تو یہ ہی کیا تھا کہ تم واپس آ جاؤ گے تو ایک ساتھ ہی گھر پر بات کریں گے اور پھر چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ ہماری شادی کے فیصلے پر نہ تو کسی کو کوئی حیرانگی ہوگی اور نہ ہی کوئی اعتراض ہوگا۔ بچپن سے دونوں کو ایک ساتھ دیکھ رہے ہیں کبھی کسی نے ہماری دوستی پر کوئی اعتراض نہیں کیا یہ بات اور ہے کہ اُن کے ذہن میں ہمارے رشتے کو لے کر جو شک کے کیڑے کلبلا رہے ہوں اُنہیں تسلی مِل جائے گی۔ بچپن سے ہی تم مجھ پر دادا گری کرتے آئے ہو اور میں دیوانی ہوں تُم جو کہتے ہو آنکھیں مُوند کے مان لیتی ہوں۔ اپنا دماغ بالکل استعمال نہیں کرتی۔ اُس دن بھی تمہارے اصرار اور ضد کے آگے بنا سوچے سمجھے بنا کسی کو بتائے تمہارے ساتھ موٹر سائیکل پر پہاڑوں پر گھومنے نکل پڑی۔ مانا کہ موسم بہت حسین، خوش گوار تھا، اس پر وہ خوبصورت وادیاں وہ ٹھنڈی ہوائیں، وہ فضاؤں میں ہواؤں کا سنگیت اور الگ سی درختوں اور پھولوں کی خوشبو جو دل و دماغ میں مستی کی کیفیت پیدا کر رہی تھی اور پھر ان سب سے اہم اِک دوسرے کا ساتھ۔ صبح شام میں کیسے ڈھل گئی پتا ہی نہیں چلا۔ پرندوں کی چہچاہٹ اور شور نے ہماری توجہ اپنی اُور کھینچی تو وقت کا احساس ہوا۔ وہ بھی شام ڈھلے اپنے اپنے گھونسلوں کو لوٹنے لگے تھے اور ہم ساری دنیا سے بے خبر بھول ہی گئے کہ گھر پر سب پریشان ہو رہے ہونگے۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ جس تیز رفتاری سے تم موٹر سائیکل چلا رہے تھے، سانسیں حلق میں اٹک رہی تھیں یہ نہیں کہ مرنے سے ڈر لگتا ہے۔ اپنی جان سے زیادہ عزیز مجھے تمہاری جان ہے۔ ماں، پاپا اندر باہر پریشان چکر لگا رہے تھے اور جب تُم نے جاتے ہوئے میری سہیلی کے اکسیڈنٹ کے بہانے کو کہانی بنا کر سُنایا تو اُن کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ ڈانٹ تو تب بھی پڑی تھی لاپرواہی کے لیے۔ اُس وقت سراسر ہماری غلطی تھی ہمیں اُن کی پریشانی کے بارے میں تو سوچنا چاہیے تھا۔

اچھا یہ بتاؤ! بنا سوچے سمجھے جو کہتے ہو میں کر لیتی ہوں اِس کی وجہ کیا ہے؟ جانتے ہو اپنے سے زیادہ تم پر بھروسہ ہے مجھے۔ جانتی ہوں تم کبھی کچھ غلط کر ہی نہیں سکتے۔ شاید میں تُم پر اتنا اعتبار نہ کرتی مگر اس واقعہ کے بعد جب میں جذبات کی رو میں بہہ نکلی تھی اُس وقت تُم ان کمزور لمحوں کا بھر پور فائدہ اٹھا سکتے تھے مگر تُم نے بڑی خوبصورتی سے اُن نازک لمحوں کو ہی نہیں مجھے بھی بہکنے سے سنبھال لیا تھا۔ اُس دن کے بعد میرے دل میں تمہارے لئے پیار اور بڑھ گیا تھا کیونکہ اب اس میں عزت اور اعتماد بھی شامل ہو چکا تھا۔

مجھے یقین ہے اس بار تُم دادا گری نہیں کرو گے اور اپنی شادی کا فیصلہ ہم ایک ساتھ سُنائیں گے۔ بس تمہارے آنے کا انتظار ہے۔

صرف تمہاری

شرمیلا

5/1/2011

مرے دلربا،

تمہارا خط اُداس کر گیا۔ میں نے مانا کہ ہم دونوں کے بیچ دُوریوں کا کرب ہمیں مسلسل پریشان کر رہا ہے مگر اس میں مایوس ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔ تم مجھ سے دُور ضرور ہو پھر بھی میرے ساتھ ہو، جیسے میں تمہارے ساتھ تمہارے دل میں، تمہاری آنکھوں میں، تمہاری رگوں میں لہو بن کر دوڑ رہی ہوں، اتنی قربت کے بعد یہ فاصلے کیا معنی رکھتے ہیں؟ دنیا میں کتنے خوش نصیب ہونگے جنہیں کسی کا سچا پیار نصیب ہوا ہو۔ محبت کے کچھ پل کبھی کبھی پوری زندگی پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایک ساتھ ایک چھت کے نیچے زندگی گزار دیتے ہیں، جسموں کی پیاس تو بجھ جاتی ہے مگر دِل تشنہ رہتے ہیں۔ سچی کھری محبت کے کچھ لمحوں کے لیے پوری زندگی ترستے رہتے ہیں۔ اس لئے آئندہ کبھی فاصلوں کی، دُوریوں کی، جُدائی کی مایوسیوں کی باتیں مت کرنا۔ جب یاد زیادہ ستانے لگے تو میری طرح ساتھ گزارے اُن خوبصورت حسین لمحوں کو یاد کر لینا، دل پر چھایا غبار خود بخود مٹ جائے گا اور ہماری محبت کی چاندنی تمہیں پُرسکون کر دے گی۔ پھر سب دُوریاں مٹ جائیں گی اور تم میرے لَمس کی خوشبو اپنے اندر محسوس کرو گے۔ تم میں اور مجھ میں فرق مٹ جائے گا۔ بقول شاعر:

رنگ کی جب گفتگو ہونے لگی
آپ سے تم، تم سے تُو ہونے لگی

اپنا زیادہ بہت زیادہ خیال رکھنا۔

تمہاری شرمیلا

2/2/2011

مرے چارہ ساز،

اس بار تمہیں خط کا جواب دینے میں تاخیر ہوگئی۔ تم خط کا بے صبری سے انتظار کر رہے ہوگے یہ میں جانتی ہوں۔ پچھلے دنوں بخار نے جکڑ لیا۔ یہاں بھی تو سردی پورے شباب پر ہے۔ اب بالکل ٹھیک ہوں فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس تاخیر کا جرمانہ بھی بھر رہی ہوں۔ تمہارے لیے ایک خاص تحفہ بھی ہے جسے دیکھ کر یقیناً تمہیں خوشی ہوگی۔

پچھلے کچھ دنوں سے میرے سر کے بال بہت گر رہے تھے۔ مجھے فکر ہونے لگی کہ اگر تمہارے لوٹنے تک یہ کم ہوگئے تو تُم تو مجھے چھوڑ دو گے نہیں۔ بچپن سے تمہیں میرے لمبے بال بہت پسند ہیں۔ تمہیں یاد ہے جب کبھی بچپن میں ہم لڑ پڑتے تھے تو میں تمہیں یہ ہی دھمکی دیتی تھی کہ میں بال کٹوا دوں گی اور تمہارا چہرہ اُتر جاتا تھا۔ پھر تم سب غصّہ بھول کر مجھے منانے لگتے تھے۔ غلطی چاہے میری ہی کیوں نہ ہو اُس وقت مناتے تم ہی تھے۔ تمہارا یہ بار بار کہنا'' مجھے تمہاری چوٹی بڑی پسند ہے اور جب تم بال دھو کر کھُلے رکھتی ہو تو اور بھی خوبصورت لگتے ہیں۔ انہیں کٹوانا نہیں کبھی، نہیں تو ہماری دوستی ختم۔'' مجھے یہ بہت اچھا لگتا

تھا۔

ہماری دوستی نے کب محبت کا روپ اختیار کیا پتا ہی نہ چلا۔ کب تُم میرے دل وجان کے مالک بن بیٹھے معلوم ہی نہ ہوا۔ میرا خود کا اب کچھ بھی نہیں رہا جو کچھ بھی ہے سب تمہارا ہی تو ہے۔ میرے سینے میں جو سانسیں چل رہی ہیں، میرے دل میں جو ارمان مچل رہے ہیں یہ اور ان ارمانوں میں ۔۔۔۔ یہ سب تو میرے پاس تمہاری امانت ہیں۔ پھر بالوں پر میرا حق کہاں رہا۔ یہ بھی تمہاری امانت ہیں جنہیں میں حفاظت سے رکھتی ہوں۔

مجھے معلوم ہے تمہیں بالکل اچھا نہیں لگتا تھا جب میں چوٹی بنا کر تم سے ملنے آتی تھی۔ تمہیں ہمیشہ سے یہ پسند تھا کہ یا تو میں بالوں کا جوڑا بنا کر اُس میں لمبا جوڑا پن لگا کر آؤں یا پھر پونی ٹیل کر کے صرف ربر سے بالوں کو باندھ کر۔ زبان کے ساتھ ساتھ تمہارے ہاتھ بھی چلتے تھے۔ تمہاری انگلیوں کو شرارت کی بچپن سے عادت ہے۔ پھر دھیرے دھیرے مچلتی ہوئی انگلیاں بالوں تک پہنچ جاتیں اور یکلخت جوڑے سے پن کھینچتے ہی ایک جھٹکے سے بال کھولنے کے بعد میری گردن اپنے چہرے پر جھکا لیتے۔ میرے کھلے گھنے بالوں سے تمہارا چہرہ چھپ جاتا۔ دن میں بھی رات کا گماں ہونے لگتا۔ تمہاری سانسیں میری سانسوں سے اُلجھنے لگتیں تو میری آنکھیں خود بخود بوجھل ہو کر پلکیں موند جاتیں اور تم اصرار کرتے کہ میں آنکھیں کھلی رکھوں کیونکہ تمہیں ان آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبنا اچھا لگتا تھا۔ میں خود کو آزاد کرنے کی کوشش کرتی تو تم مچل اُٹھتے۔ ''کچھ پل اور اِن سیاہ بادلوں میں رہنے دو۔ مجھے ان گھنے بادلوں میں چمکتا ہوا اپنا چاند جی بھر کر دیکھ لینے دو''۔ اُف! کیسے لمحے تھے وہ؟ وہ لمحے میری زندگی کے سنہرے یادگار لمحوں کی تجوری میں سمیٹ جائیں گے۔ اُس وقت محسوس نہیں کیا تھا۔ اب جب تنہائی میں وہ تجوری کھولتی ہوں تو اُن لمحوں کو دوہرانے کو جی مچل، مچل اُٹھتا ہے پھر یہ دُوریاں، یہ مجبوریاں، یہ تنہائی یہ کسک اور یادوں کی میٹھی میٹھی چبھن تڑپانے لگتی ہے۔ دل چاہتا ہے کاش میں کوئی پرندہ ہوتی اور اُڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاتی مگر ہم تو انسان ہیں۔ کہنے کو آزاد باشندے پھر بھی حالات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے۔

خیر چھوڑو! بات تو میں بالوں کی کر رہی تھی، بیچ میں زنجیریں کہاں سے آ گئیں۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ آج کل بال تیزی سے گر رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے بالوں کا علاج تو شروع کر دیا ہے اور ڈاکٹر کا کہنا ہے جلد ہی بال گرنے بند ہو جائیں گے۔ اس سے پہلے کہ میری وہ ''لٹ'' جس سے کھیلنا تمہارا محبوب شغل ہے اپنا نام و نشان ختم کر دے اسے میں نے کاٹ دیا ہے اور یہ تمہیں اس پُڑیا میں بھیج رہی ہوں۔ اسے سنبھال کر سامان کے ساتھ رکھ لینا۔ تمہاری امانت تمہیں لوٹا دی۔ اب یہ تو نہیں کہہ سکو گے کہ امانت میں خیانت کر دی۔

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہاری

شرمیلا

4/3/2011

مرے سر بسر مرے سرتاپا!

پچھلے دنوں جو برفانی طوفان آیا تھا، اُس کی خبر ٹی وی سے مل گئی تھی۔ کئی جوان اس طوفان میں مارے گئے اور جان مال کا کافی نقصان ہوا۔ کسی کروٹ چین نہیں آ رہا تھا اور پھر تمہارے دوست میجر ساہنی نے فون پر بتلایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں تُم بھی ٹھیک ہو اور تمہاری بٹالین بھی کیونکہ تمہاری بٹالین کو پہلے ہی وہاں سے دوسری جگہ بھیج دیا تھا۔ تو کہیں جا کر راحت ملی مگر جو طوفان کی زد میں آ گئے اُن کے لیے کل دِل بہت رویا اتفاق سے میڈم پریرنا سے ملاقات ہو گئی۔ تمہیں یاد ہے نا پریرنا میڈم؟ سکول میں انگریزی پڑھاتی تھیں ہمیں اور تُم اُن کے چہیتے ہوا کرتے تھے۔ اتنے سالوں بعد بھی ویسی کی ویسی ہیں۔ اُتنی ہی سمارٹ اور اُتنی ہی پُرکشش اور اُتنی ہی پُر خلوص اُتنی ہی شفیق اور مہربان صرف بالوں میں ہلکی سی چاندی جھلملانے لگی ہے۔ ایک اور بات جو نہیں بدلی وہ ہے اُن کا اکیلا پن۔ اتنے سال گزر گئے اُس حادثے کو جس میں اُن کے منگیتر کی موت واقع ہو گئی تھی، پھر اُنھوں نے شادی نہیں کی۔ کیا کوئی اس طرح بھی کرتا ہے؟ کیا محبت کرنے کی اتنی بڑی سزا؟ کیا زندگی ہنس کر نہیں گزاری جا سکتی؟ کیا وہ اپنے منگیتر کو خوش رہ کر یاد نہیں کر سکتی تھیں؟ کیا وہ اُنھیں اسی طرح تنہا دیکھ کر خوش ہوتا ہوگا؟ تُم ہی بتاؤ جب ہم کسی کو چاہتے ہیں تو کیا اُس کی خوشی میں خوش نہیں ہوتے۔ اگر تمہاری آنکھ میں آنسو آئے تو میرا دل ساتھ روتا ہے اور تمہیں خوش دیکھ کر میرے پورے وجود میں خوشی سرسرانے لگتی ہے۔ پھر یہ کیسا پیار ہوا کہ جس سے کسی کو دُکھ ہوتا ہو وہ ہی کام کرو۔ مجھے تو اُن کا یہ طرزِ زندگی بہت ناگوار گزرا۔ میں تو وہی کام کروں گی جس سے تمہیں خوشی ملتی ہو اور یہ وعدہ بھی لوں گی تُم سے کہ بس ہمیشہ ہنستے کھیلتے خوش رہنا۔ تمہیں خوش دیکھ کر ہی میں خوش ہولوں گی۔ زندگی بار بار نہیں ملتی۔ اسے ہر پل جینا چاہیے۔ بس خود بھی خوش رہنا اور دوسروں کو (سب سے زیادہ مجھے) بھی خوش رکھنا۔

سراپا انتظار

شرمیلا

6/4/2011

ڈیئر میجر دیپک،

میرا خط دیکھ کر آپ حیران ہوں گے۔ مجبوری ہے کیا کروں۔ آپ تو اس امر سے بخوبی آشنا ہیں کہ انسان کو فرض کی ادائیگی میں کبھی کبھی کڑے کوس بھی پار کرنا پڑتے ہیں۔

آپ کو شاید علم نہیں کہ اس وقت جس فرض کی ادائیگی کا ذمہ میں نبھا رہی ہوں اس کی ادائیگی میں میرے ساتھ آپ کو بھی پُل صراط سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ گذشتہ دنوں بخار کے ایام میں جب اُس کے کئی طرح کے ٹیسٹ ہوئے تب اُن کو علم ہوا کہ وہ کینسر کی آخری سٹیج میں ہے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ آپ کو اُس

باقی صفحہ آخیر پر ملاحظہ کیجیے

''پاگل گاندھی''

مراق مرزا
(ممبئی، بھارت)

وہ نہ رام تھا نہ رحیم، نہ مائیکل نہ کرتار سنگھ۔ اُس کا اصلی نام کسی کو معلوم نہ تھا۔ جب وہ راہ چلتے ہوئے کسی مندر کے قریب سے گزرتا تو اس کا سر خود بہ خود احتراماً جھک جاتا۔ اکثر وہ درگاہ پر بھی جاتا تھا اور اتوار کے دن لنگر کھانے گُرودوارہ میں بھی پہنچ جاتا۔ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتا تھا اس بارے میں کسی کو کچھ پتا نہ تھا۔ وہ کہاں سے آیا تھا اور کب سے اس چوراہے پر قیام پذیر تھا اس بات سے بھی لوگ قطعی طور پر ناواقف تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ لوگوں کو اُس کے ماضی میں جھانکنے یا اس کی حقیقت جاننے میں کوئی دلچسپی بھی نہ تھی۔ وہ گاندھی نگر کے چوراہے پر پاگل گاندھی کے نام سے مشہور تھا۔ کیا وہ واقعی پاگل تھا؟ اس سوال پر کبھی کسی نے غور کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

چوراہے کے عین وسط میں ایک بڑے سے گول چبوترے پر مہاتما گاندھی کا لائف سائز مجسمہ نصب تھا۔ یہ مجسمہ سفید تھا اور گاندھی جی ہاتھ میں اپنی مخصوص لاٹھی لئے نظر آ رہے تھے۔ اس مجسمے کے اطراف ہی پاگل گاندھی نے اپنی ایک دنیا آباد کر لی تھی۔ اس کا اپنا کوئی گھر بار تو تھا نہیں۔ وہ گاندھی جی کے چرنوں میں ہی رہتا تھا۔ دن بھر چوراہے پر اِدھر اُدھر بھٹکتا۔ پیٹ کی آگ جب ستاتی تو کسی ہوٹل کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا اور اسے دیکھتے ہی ہوٹل کا مالک سمجھ جاتا کہ وہ بھوکا ہے۔ پھر وہ فوراً اُسے بلا اکراہ واجبار کچھ کھانے کے لیے دے دیتا۔ جب کبھی چائے کی طلب لگتی تو کسی ٹی اسٹال کے پاس آ دھمکتا اور اسے چائے مل جاتی۔ چوراہے کے سبھی دکاندار اسے پیار کرتے تھے اور خوشی خوشی اس کی تمام ضرورتیں پوری کرتے تھے۔ وہ بڑا ہی پُرامن اور سیدھا سادہ انسان تھا۔ اپنی ذات سے کبھی کسی کو تکلیف یا نقصان نہیں پہنچاتا تھا۔ ورنہ پاگل خطرناک قسم کے بھی ہوتے ہیں جو پاگل پن کا دورہ پڑنے پر کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ بلاتکار اور قتل جیسے سنگین جرم کا ارتکاب بھی کر سکتے ہیں۔ مگر پاگل گاندھی میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔

وہ شاید Schizophrenic تھا۔ پاگل پن کی ایک ایسی نوعیت جس میں انسان کی دماغی حالت کچھ ساعتوں کے لیے بالکل ٹھیک ہو جاتی ہے اور اُسے اپنے بارے میں سب کچھ یاد آ جاتا ہے۔ پھر چند ہی لمحوں کے بعد پاگل پن کی کیفیت اُس پر دوبارہ طاری ہو جاتی ہے اور وہ سب کچھ فراموش کر کے اپنی دنیا میں لوٹ جاتا ہے۔ اور اِس دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

اس کی عمر قریب ساٹھ پینسٹھ سال تھی۔ جسم پر ضعیفی کے اثرات صاف دکھائی دیتے تھے تاہم چہرے پر تھوڑی چمک باقی تھی۔ بے ترتیب داڑھی، بکھرے لمبے بال جو سیاہ کم اور سفید زیادہ تھے۔ گھٹنوں سے قدرے نیچے تک لمبا کُرتا اور چوڑیدار پائجامہ میں ملبوس جب وہ سڑک سے گزرتا تو چوراہے کے عام آدمیوں سے بالکل مختلف دکھائی دیتا۔ اسکے کپڑے پرانے تھے اور ایک دوجگہ سے پھٹے ہوئے بھی تھے مگر وہ صاف صفائی کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ اگر کبھی کسی باہری آدمی کی نگاہ اس پر پڑتی تو اسے اکثر اس کے شاعر، ادیب، پینٹر یا کوئی بڑا ایڈ ری جیوی ہونے کا گمان ہوتا۔ وہ کسی بھی زاویے سے پاگل نہیں لگتا تھا۔ مگر وہ نارمل بھی نہ تھا۔

گاندھی جی کے مجسمے کے نیچے چبوترے پر ہی وہ رات کو سویا کرتا تھا اور اس کی صبح وہیں پر چائے اور انگریزی اخبار کے مطالعہ سے شروع ہوتی تھی۔ اخبار میں چھپی سنسنی خیز خبروں کو بلند آواز میں پڑھ کر وہ گاندھی جی کو سناتا۔ اس کا لہجہ اکثر طنز اور تیزابیت سے بھرا ہوتا۔

''آپ کے لیے اک دل دہلا دینے والی خبر ہے باپو، ایک اسکول کی چھاترہ کا بلاتکار!!۔۔۔ دو نوجوان دن دہاڑے اسے ایک سڑک سے اپنی ماروتی کار میں اغوا کر کے لے گئے۔ پھر باری باری اس کی عزت لوٹنے کے بعد اسے شہر کے مضافاتی علاقے میں چھوڑ کر فرار ہو گئے!!۔۔۔ پولیس نے دھارا 376 کا کیس رجسٹر کر لیا ہے۔ مگر اس سلسلے میں کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی ہے۔ اس حادثہ کو ہوئے چوبیس گھنٹے بیت چکے ہیں لیکن مجرمین اب تک قانون کی گرفت سے آزاد ہیں!!۔۔۔ کیا یہ وہی بھارت ہے جس کا سپنا آپ نے دیکھا تھا؟!!''

چائے کی چُسکیوں کے ساتھ ایسی اور بھی بہت سی خبریں وہ پڑھ کر سناتا۔ جیسے کسی ہوٹل مالک کی گولی مار کر ہتیا۔ چلتی ٹرین میں چین کھینچ کر ڈکیتی۔ بہار میں آئے دن ڈاکٹروں کا اغوا اور بعد میں پھروتی کی مانگ سنسند بھون اور آتنکوادیوں کا حملہ اور سنسد کی سُرکشا ویوستھا پر سوالیہ نشان۔ بمبئی میں سپاری لے کر قتل کرنے کی بڑھتی ہوئی وارداتیں۔ یہ تمام خبریں وہ کچھ اس طرح سناتا جیسے گاندھی جی انہیں بڑے دھیان سے سن رہے ہوں۔ اور تب وہ پاگل نہیں بلکہ ایک ذی شعور اور دانش ور انسان معلوم ہوتا تھا۔ جس کے اندر ملک کے حالات کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت تھی۔ جو اپنے اندر سماجی اور سیاسی ذمہ داریوں کی اچھی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ اور شاید یہی وہ لمحہ تھا جب چند ثانیوں کے لیے وہ نارمل ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھار وہ شراب نوشی بھی کر لیتا تھا۔ جب کبھی چوراہے کا کوئی دکاندار اسے وہسکی کا ایک کوارٹر خرید کر دیتا تو اس کی عید اور دیوالی ہو جاتی۔ وہ گاندھی جی کے سامنے چبوترے پر بیٹھ کر پانی کی بوتل میں شراب ملا کر بڑے مزے لے کر پیتا پھر گاندھی جی سے کلام کرتا۔ ''معاف کرنا آئی ایم سوری باپو۔ آپ کو برا لگ رہا ہوگا کہ میں شراب پی رہا ہوں!!۔۔۔ مگر اس میں برائی کیا ہے؟ مجھے سب پتہ ہے۔ انگور کی اس بیٹی کا مزہ تو آپ بھی لے چکے ہیں اپنے طالب

علمی کے زمانے میں!!۔۔۔ایک راز کی بات بتاؤں باپو؟ یہ شراب بڑے کمال کی چیز ہے۔اسے پینے کے بعد نیند بڑی اچھی آتی ہے۔اگر آپ بھی کبھی سکون کی نیند سونا چاہیں تو ایک دو پیگ مار لینا۔پھر دیش کی دِشا اور دَشا سب کچھ بھول کر آرام سے سوتے رہیں گے آپ!!۔۔۔لیکن آپ سو گئے تو دیش کا کیا ہوگا؟!! آئی ایم سوری۔ میں نے غلط مشورہ دے دیا آپ کو! اگر آپ سو گئے تو ملک اور قوم کی رہنمائی کون کرے گا؟ آپ کو تو جاگتے ہی رہنا ہے اور اسی طرح ہاتھ میں ڈنڈا لئے دیش کی چوکیداری کرتے رہنا ہے!!''

شراب پینے کے بعد وہ وہیں پر کھانا بھی کھاتا پھر دھیرے سے چبوترے پر دراز ہو جاتا۔اور نیند کی دیوی آہستہ آہستہ اُسے اپنی آغوش میں لے لیتی۔اور وہ خواب خرگوش کے گہرے غار میں گم ہو جاتا۔

وہ ایک طوفانی رات تھی۔بجلی کی چمک اور بادلوں کی ہیبت ناک گھن گرج کے ساتھ تیز ہواؤں کی یلغار بھی جاری تھی اور ساتھ ہی موسلا دھار بارش بھی ہو رہی تھی جس کے باعث پورے ماحول پر ایک دہشت سی چھائی ہوئی تھی۔ایسا لگ رہا تھا جیسے آسمان پھٹ کر زمین پر آ گرے گا اور دنیا آج ہی ختم ہو جائے گی۔

لائٹ جا چکی تھی۔یا شاید طوفانی بارش کے سبب پاور ہاؤس سے ہی بجلی کاٹ دی گئی تھی۔رات کے قریب بارہ بج چکے تھے۔چوراہے کی تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔سڑک پر ایک بھی آدمی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔کچھ دیر قبل ایک آدھ گاڑی گزر جاتی تھی مگر اب وہ بھی سلسلہ بند ہو گیا تھا۔بارش تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

پاگل گاندھی ایک بڑی دکان کے چھجے کے نیچے بیٹھا جاگ رہا تھا۔ اور اس وقت اس کے پاس شراب بھی نہ تھی جسے پی کر وہ موسم کے قہر کا مقابلہ کر سکتا تھا۔وہ بارش کے رکنے کا انتظار کر رہا تھا۔دراصل گاندھی جی کے مجسمے کے نیچے جو چبوترہ تھا وہی اس کا بچھونا تھا۔اور اسی جگہ اسے نیند آتی تھی۔کسی دوسرے مقام پر وہ سو نہیں سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد بارش رک گئی۔بجلی کے چمکنے اور بادلوں کے گرجنے کا سلسلہ بھی تھم گیا۔اب چوراہے پر اندھیروں کا راج تھا۔پاگل گاندھی چھجے سے باہر آ کر دھیرے دھیرے گاندھی جی کے مجسمے کی سمت بڑھنے لگا۔ابھی وہ چند ہی قدم کا فاصلہ طے کر پایا تھا کہ معاً ایک نسوانی چیخ اس کی سماعت سے ٹکرائی اور وہ چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔مگر دوسرے ہی پل پورے ماحول پر سناٹا چھا گیا جیسے چیخنے والی کو کسی نے مار دیا ہو یا اس کا منہ زور سے دبا دیا ہو تا کہ وہ دوبارہ چیخ نہ سکے۔

پاگل گاندھی ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے گاندھی جی کے مجسمے کی جانب بڑھ رہا تھا۔پھر اچانک بجلی کے کھمبوں کے بلب روشن ہو گئے اور سڑکوں پر تھوڑا اجالا پھیل گیا۔ایک بار پھر ہلکی سی چیخ فضا میں گونجی جیسے کوئی چیخنے کی کوشش کر رہا ہو اور اس کا منہ پھر ہاتھ سے دبا دیا گیا ہو۔اس بار چیخ جہاں سے ابھری تھی پاگل گاندھی کی نظروں نے اس جگہ کی نشاندہی کر لی تھی۔ چیخ تھوڑے فاصلے پر واقع پولیس چوکی کے اندر سے آئی تھی جس کا دروازہ بند تھا مگر کھڑکی کھلی تھی۔

وہ لپک کر پولیس چوکی کے قریب آ گیا۔ پھر جھانک کر اندر کی طرف دیکھا تو ایک شدید بھیانک منظر نے اس کی نظروں کا استقبال کیا۔ایک پولیس افسر بھیڑیئے کی طرح ایک معصوم لڑکی کا شکار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لڑکی کا منہ ایک بڑے سے رُومال سے بند تھا اور اب وہ چیخ چلا بھی نہیں سکتی تھی۔ پاگل گاندھی چلاّ کر چوکی کا دروازہ پیٹنے لگا اور اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔شاید وہ لڑکی کی آبرو بچانا چاہتا تھا۔گاندھی کے چیخنے چلانے کے باوجود افسر نے دروازہ نہیں کھولا۔وہ ایسی حالت میں تھا کہ لڑکی کو چھوڑ کر دروازہ کھولنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔اس کے اندر کا درندہ اس پر پوری طرح حاوی تھا۔ پاگل گاندھی بھاگ بھاگ کر کبھی کھڑکی کے پاس آ کر چلاّ تا تو کبھی دروازہ پیٹ کر اسے کھولنے کی کوشش کرتا۔دروازہ تو نہیں کھلا مگر لڑکی کی شلوار کھل گئی۔اور اسی کے ساتھ ایک بار پھر بجلی کی چمک کے ساتھ بادلوں کی گرج فضا میں گونجی۔مگر اس بار بارش نہیں ہوئی بلکہ پولیس افسر کے اندر کا لاوا برق کی طرح اُس معصوم لڑکی کے اندر اتر گیا اور کچھ ہی پلوں میں اس کی آبرو جل کر راکھ ہو گئی۔

اس چوراہے پر پاگل گاندھی کی آنکھوں میں کبھی کسی نے آنسو نہیں دیکھا تھا۔وہ ہمیشہ ہنستا مسکراتا رہتا تھا۔مگر اس وقت وہ گاندھی جی کے مجسمہ کے سامنے کھڑا رو رہا تھا۔بدقسمتی سے اس کے پاس شراب بھی نہ تھی کہ پی کر وہ اس شرمناک منظر کو اپنے ذہن کے پردے سے مٹا دیتا جواب سے کچھ دیر قبل اس نے پولیس چوکی کے اندر دیکھا تھا۔ وہ گاندھی جی سے بڑے ہی غیض بھرے انداز میں مخاطب ہوا۔''دنیا سمجھتی ہے میں پاگل ہوں! مگر میں پاگل نہیں ہوں باپو!۔۔ میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور میں خاموش نہیں بیٹھوں گا!!۔۔۔تم تو اپنے تینوں بندر کی طرح نہ کچھ دیکھتے ہو، نہ سنتے ہو، نہ بولتے ہو!!۔۔مگر میں میڈیا کو بلا کر پولیس افسر کے خلاف بیان دوں گا۔ کیوں کہ میں اس بلاتکار کا چشمہ دید گواہ ہوں!!'' بے حد جذبات بھرے لہجے میں پاگل گاندھی، گاندھی جی کے مجسمے سے نا جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ جب دل کی پوری بھڑاس نکل گئی تو وہ پھر رونے لگا بالکل بچوں کی طرح۔اس پولیس افسر کی موجودگی سے بالکل بے نیاز جو تھوڑے ہی فاصلے پر کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

دوسرے دن گاندھی جی کے مجسمہ کے پاس بڑی تعداد میں لوگ جمع تھے۔چوراہے کے سبھی دکاندار بھی اس بھیڑ میں کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ تقریباً دس بارہ ٹی وی رپورٹرس اپنی اپنی کیمرہ ٹیم کے ساتھ اس حادثے کی رپورٹنگ کے لیے آئے ہوئے تھے۔گاندھی جی کے مجسمے کے نیچے پاگل گاندھی کی لاش پڑی تھی۔کسی نے گلا دبا کر اس کا قتل کر دیا تھا اور بلاتکاری پولیس افسر اپنی پولیس پارٹی کے ہمراہ پاگل گاندھی کی لاش کا پنچ نامہ کرنے میں مصروف تھا!

سانپ اور پرندے

مہتاب عالم پرواز

(جمشید پور،بھارت)

گذشتہ شب میری پانچ سالہ بیٹی نوشینؔ نے JUBILEE PARK جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ جب میں ساڑھے چھ بجے سائبر بند کر کے اپنے گھر لوٹا، میری بیوی میری منتظر تھی۔اور میرا چار سالہ بیٹا فرازؔ مجھے دیکھ کر کافی خوش ہو گیا تھا۔لیکن میری آنکھیں اپنی پیاری سی بیٹی نوشینؔ کو تلاش کر رہی تھیں......

سمرنؔ نے بتایا کہ آپ کی پیاری بیٹی تو آپ کا انتظار کرتے کرتے تھک سی گئی تھی۔ پھر آپ نے فون کر کے جب یہ بتایا کہ میں ساڑھے چھ بجے آرہا ہوں۔جب آپ کا فون آیا تھا اُس وقت شام کا پانچ بجا تھا اور پھر ایسے حالات میں اُس کے اندر اتنا PATIENCE کہاں کہ وہ آپ کا انتظار کرے وہ تحسینؔ کے ساتھ جا چکی ہے۔تحسینؔ کے ممّی اور ڈیڈی جا رہے تھے۔اس سے اچھا موقع اُس کے لئے اور کیا ہو سکتا تھا۔

اور جب وہ جا ہی چکی ہے تو اب JUBILEE PARK جانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔سمرنؔ نے اظہارِ خیال کیا۔آپ تو یہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ مجھے بھیڑ بھاڑ سے شدید نفرت ہے۔

لیکن میرا چار سالہ بیٹا فرازؔ شور مچانے لگا۔اور اپنی توتلی زبان سے کہنے لگا''ام بی پا لک جاللا......''

ویسے پارک جانے کا میرا بھی ارادہ نہیں تھا لیکن فرازؔ کی وجہ سے مجبوراً جانا پڑا۔

پارک کے جانے والے راستوں سے ہی فرازؔ کی نگاہیں اپنی بہن نوشینؔ کو تلاش کر رہی تھیں اور وہ بار بار اپنی توتلی بولی سے کہہ رہا تھا۔امی نوشینؔ کہاں للا۔کیونکہ یہ دونوں معصوم بھائی، بہن ایک دوسرے سے بے انتہا پیار کرتے تھے۔

پارک کے مین گیٹ سے ہی لوگوں کی افراتفری شروع ہو گئی تھی، بھیڑ کافی تھی۔ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا کہ واپس لوٹ چلوں، اور سمرنؔ بھی واپس لوٹ جانے کا اصرار کرنے لگی تھی لیکن فرازؔ نے شور مچانا شروع کر دیا۔نہیں میں گھوم للا......اور خوب زور زور سے رونے لگا، آخر تھک ہار کر ہم لوگوں کو، لوگوں کے اس ہجوم میں شامل ہونا پڑا۔

گاؤں کے پُرسکون ماحول کی پروردہ میری بیوی نے جب لوگوں کی اس بھیڑ میں، اپنے آپ کو دیکھا تو کہنے لگی یہ آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں۔

''آپ یہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ مجھے بھیڑ بھاڑ سے شدید نفرت ہے۔اور یہ باتیں آپ کو میں نے پہلے بھی بتائی تھیں۔''

''جانتا تو ہوں۔''

''اُس کے باوجود آپ مجھے یہاں لے آئے ہیں۔''

''میں نہیں۔''

''ہمارے صاحب زادے نے ہمیں یہاں آنے پہ مجبور کیا ہے۔او رمجبوریاں انسان سے کیا کچھ نہیں کرواتی ہیں۔آپ تو یہ اچھی طرح سے جانتی ہیں کہ میں خود تنہائی پسند ہوں، بھیڑ بھاڑ سے مجھے بھی اتنی ہی نفرت ہے جتنی نفرت آپ کرتی ہیں۔''

بھیڑ اتنی بڑھ گئی تھی کہ میرا چار سالہ بیٹا اپنے آس پاس کے کسی بھی ماحول کو سوچنے سمجھنے سے قاصر تھا آخر میں نے اُسے اپنے کاندھے پہ اُٹھا لیا۔میرا بیٹا کافی خوش تھا کیوں کہ وہ خود کو میرے کاندھے پہ سوار ہو کر مجھے گھو لا کہہ رہا تھا اور اپنی توتلی زبان سے مجھے کہہ رہا تھا۔''چل میلے گھو لے تک تک تک......''

''چل میلے گھو لے تک تک تک۔''......سُن کر......

میری بیوی کافی خوش تھی کہ میرا بیٹا آج اپنے باپ کو صحیح طرح سے پہچان پایا ہے۔یہ الگ سی باتیں ہیں کہ رات کے ہر پچھلے پہر گھوڑے کے ہنہنانے کی آوازیں وہ اپنے پہلو میں محسوس کرتی ہے۔اور پھر وہ اُسے رام کرنا بھی جانتی ہے۔

میں بھی کافی خوش تھا۔

اچانک میری بیوی نے دوبارہ کہا کہ'' آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں آپ کا بیٹا آپ کو گھوڑا کہہ رہا ہے اور میری آنکھیں لوگوں کی اس بھیڑ میں انسان کو تلاش کر رہی ہیں۔لوگوں کی بھیڑ موجود ہے لیکن میں خوف زدہ ہوں، نہ جانے کیوں۔؟''

ایک لمحے کے لئے میں بھی چونکا اور بھیڑ کا باریک بین نگاہوں سے جائزہ لینے لگا، اور پھر میری آنکھیں پھیلتی ہی چلی گئیں۔میں نے دیکھا لوگوں کے سارے چہرے جانوروں کے خوفناک صورت اختیار کر چکے تھے۔اور کالج کی خوبصورت، خوبصورت سی لڑکیاں ریچھ کے سنگ گھوم رہی تھیں۔ریچھ کے ناخونی پنجوں میں خوبصورت لڑکیوں کی مخروطی انگلیاں سموئی ہوئی تھیں۔بھیڑیا صفت لوگوں کے ہاتھ خوبصورت سی لڑکیوں کے شانوں پر تھے اور کینہ توز نگاہیں اُس کے جسم کے نشیب و فراز پہ رینگ رہی تھیں، اور اُس کے وجود کو ٹٹول رہی تھیں۔کُتے جیسی خصلت کا وہ آدمی اپنے منھ سے رال ٹپکا رہا تھا۔اور اُس کے نوکیلے دانت اُن کے وجود کو چیر پھاڑ کر ننگی آنکھوں کی نذر کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

''چل میلے گھو لے تک تک تک.....''

میں پھر چلنے لگا تھا.......

سارا پارک رنگ برنگے قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔سانپ کے جیسی

بل کھاتی کالی لمبی سڑک، بھیڑیے، ریچھ، گُتے نما لوگوں کو اپنے وجود پہ سوار کیے رینگ رہی تھی۔ میں بھی گھوڑا بن کر اُس پہ سوار تھا۔اور میرا بیٹا گھڑسواری کر رہا تھا۔اور اُسے بڑا مزا آ رہا تھا لیکن سمرن اس بھیڑ سے اُکتانے لگی تھی۔

سمرن نے کہا''اب واپس چلیں۔آج ہی شادی کی پارٹی میں بھی جانا ہے، واپسی پہ کافی تھکان ہو جاتی ہے۔''

میں بھی یہی چاہ رہا تھا۔

خیر کسی طرح سے میں اپنے گھر لوٹ آیا تھا۔گھر کی واپسی کے وقت فراز آئسکریم کے مزے لیتا رہا اور ہم لوگ جھال موڑھی کے ذائقے کے سنگ اپنی پیاری سی بیٹی نوشین کو یاد کرتے رہے۔گھر پہنچتے ہی سمرن نے گرما گرم چائے بنا کر اچھی بیوی ہونے کا ثبوت دیا۔

ہم دونوں نے چائے پی کر خود کو فریش محسوس کیا۔اور شادی کی پارٹی میں جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

راج گارڈن میں شادی کی شاندار پارٹی کا انتظام کیا گیا تھا پورا ہال رنگ برنگے قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں بکھری پڑی تھیں۔اور ٹیڈی بیر کا جوڑا بچوں میں چاکلیٹ بانٹ رہا تھا۔اور میں انسان کو اس جانوروں کے خول میں لپٹا دیکھ کر نئی کہانیوں کے ادھیر بُن میں گم ہو گیا تھا کہ کہانیاں تو ایسی ہی سوسائٹی میں جواں ہوتی ہیں۔یا پروان چڑھتی ہیں۔

میری بیٹی نوشین بھی لوٹ آئی تھی اور پارٹی میں آئسکریم کے مزے لے رہی تھی۔

اور میں نہ جانے کیوں انسانوں کے اس ہجوم میں شامل اس انسان کی حرکتوں پہ نظر رکھے ہوا تھا جو انسان ہو کر بھی ٹیڈی بیر کے خول میں لپٹا ہوا تھا۔اور میرا ذہن نئی کہانی کے اُدھیر بُن میں گم ہو گیا تھا۔ایک ایسے انسان کی کہانی جس کی مجبوریوں نے اُسے ٹیڈی بیر بننے پہ مجبور کر دیا تھا۔اور میرے ذہن میں جب تک کسی نئی کہانی کا CONCEPT مکمل تیار نہ ہو جائے زندگی اجیرن سی لگنے لگتی ہے۔

نوشین نے آئسکریم کا کپ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیا سوچ رہے ہیں بابا جانی ۔ آپ یہاں کب آئے ، JUBILEE PARK میں بھیڑ کی وجہ سے آپ لوگوں سے ملاقات بھی نہ ہو سکی پارک میں فراز نے کیا کیا کھایا، میرے لئے کیا لائے۔آپ کہاں کہاں گھومے۔ہم لوگوں نے پارک کا پورا چکر لگایا، دہاڑتا ہوا شیر دیکھا۔جس کے دہاڑنے کی آوازیں سُن کر ہم سے چھوٹے بچے اپنی اپنی ماں کے پیچھے چُھپ جایا کرتے تھے۔اور میں بھی ڈرسی جاتی تھی۔اور ایسے وقت میں میری بانہیں آپ کو تلاش کرتی تھیں۔شیر کی آنکھوں میں لال رنگ کا بلب روشن تھا، اپنے سونڈھ سے پانی پھینکتا ہوا ہاتھی کا ایک بچہ دیکھا بہت اچھا لگا، اسپائیڈر مین دیکھا اور جلتے بجھتے قمقموں کی ڈھیر ساری چیزیں دیکھیں۔''

اور پھر وہ اُداس ہو گئی۔میں نے اُس کے اِس اُداسی کی وجہ جاننے کی کوشش کی تو وہ پھر کہنے لگی......

''اور بابا جانی ایک جگہ ایک پیڑ پہ سانپ لپٹا ہوا تھا۔پیڑ کی اُونچی شاخ پہ چڑیوں کا گھونسلہ بنا ہوا تھا۔اُس میں چڑیوں کے بچے چوں چوں کر رہے تھے۔سانپ رینگتا ہوا آتا، اور گھونسلے تک پہنچ جاتا پھر اُس کی لپلپاتی زبان باہر نکل آتی اور اُس کی سُرخ ہوتی ہوئی آنکھوں سے لال روشنی نکلنے لگتی اور پھر اُس سانپ کا بڑا جبڑا کھل جاتا اور وہ زہریلا سانپ چڑیا کے سارے بچوں کو کھا جاتا ایسے وقت میں، میں ڈرسی جاتی لیکن سلمان اور حمران بھائی جان نے کہا کہ یہ سچ کا تھوڑے ہے۔پھر تحسین آپی نے بتایا کہ یہ سب کچھ چھوٹے چھوٹے بلب جس کو منی بلب کہتے ہیں اُسی سے بنایا گیا ہے۔ میں اپنی پیاری سی بیٹی نوشین کی ساری باتیں بغور سُنتا رہا۔

''آپ نے چڑیا کے بچّوں کو کھانے والا وہ زہریلا سانپ نہیں دیکھا بابا جانی۔؟''

''نہیں۔''

''کیوں۔؟''

''بھیڑ کافی تھی میں........میں وہاں تک پہنچ نہیں پایا۔''

''اچھا ہوا آپ لوگ نہیں گئے۔''

''اگر آپ لوگ جاتے تو اپنا فراز بھی آپ لوگوں کے ساتھ جاتا وہ ابھی بہت چھوٹا ہے کہیں وہ زہریلا سانپ اُسے بھی کھا لیتا۔تو دوسرا بابو کہاں سے لاتے۔اب آپ نے بھی باہر جانا چھوڑ دیا ہے۔امّی کہا کرتی ہیں کہ آپ دونوں کو بابا جانی نے باہر سے بھیجا ہے پارسل کے ذریعے.......''

''فراز تو کافی ضد کر رہا تھا۔لیکن بھیڑ کی وجہ سے میں نے وہاں جانا مناسب نہیں سمجھا۔''

''ہاں بھیڑ تو کافی تھی۔سبھی لوگ وہاں پہ صرف تماشہ دیکھ رہے تھے کسی نے بھی سانپ کو نہیں بھگایا میرا تو دل کر رہا تھا کہ پتھر اُٹھا کر اُس سانپ کی آنکھ میں مار کر اُس کی آنکھیں ہی پھوڑ دوں جب سانپ اندھا ہو جائے گا تو وہ پیڑ پہ نہیں چڑھ سکے گا اور چڑیوں کے گھونسلے تک نہیں پہنچ سکے گا اور اندھا ہی مر جائے گا۔''

''میں نے وہاں بھیڑ ہونے کے باوجود پتھر بھی اُٹھا لیا تھا لیکن سلمان بھائی جان نے کہا تم پاگل ہو گئی ہو کیا۔؟ وہ سچ کا سانپ نہیں ہے، تم اگر پتھر سے مارو گی تو سارے بلب ٹوٹ جائیں گے۔اور سارا انظام کام کرنا چھوڑ دے گا۔سارے لوگ تم سے ناراض ہو جائیں گے۔اور وہاں دیکھو وہاں پولیس والے بھی کھڑے ہیں۔تمہیں پکڑ کر جیل لے جائیں گے۔''

پولیس کو دیکھ کر میں سہم سی گئی تھی۔اور سلمان بھائی جان نے پتھر میرے ہاتھ سے چھین کر سامنے کے نالے میں پھینک دیا تھا۔ جہاں شہر کا گندہ

پانی بہہ رہا تھا۔

''سلمانؔ بھائی جان اگر وہ سچ کا سانپ نہیں ہے تو وہ چڑیا کے بچّوں کو کیسے کھالیتا ہے۔؟''

''ایسے ہی پروسس میں اس کو بنایا گیا ہے۔''

''یہ پروسس کیا ہوتا ہے۔؟''

''اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔؟''

''پروسس آپ کو معلوم ہوگا تب نا آپ مجھے سمجھائیں گے۔''

یہ ساری باتیں وہ کہتی رہی اور میں سُنتا رہا صرف سُنتا ہی نہیں رہا بلکہ نوٹ کرتا رہا اپنے وجود کے اُن گوشوں میں......جہاں کہانیاں ہی کہانیاں تھیں......

باتیں ہوئیں اور ختم بھی ہوگئیں۔لیکن میرے اندر وہیں سے ایک نئی کہانی کا جنم ہوگیا تھا۔ایک ایسی کہانی جس کا انجام میں اپنی اِن آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔لیکن میرا CONCEPT کُچھ اور ہی تھا۔

کافی رات گئے میں شادی کی پارٹی سے لوٹا تھا۔اور کافی بے چین بھی تھا۔ساری رات کہانیوں کی اُدھیڑبُن میں گُم تھا۔نت نئی کہانیاں بنتیں اور تصور میں ہی گُم ہوجاتیں.....لیکن پارک کا وہ سانپ سر اُبھارتا رہا۔اور اب اُس کے سر کو کُچلنا لازمی تھا۔

رات کافی گہری ہوگئی تھی۔نوشینؔ میرے پہلو میں ہی سوئی ہوئی تھی۔اچانک ایک تیز چیخ کے ساتھ وہ اُٹھ بیٹھی اور سانپ، سانپ کہہ کر چلاّنے لگی ۔ وہ کافی ڈری اور سہمی ہوئی تھی۔ایسے حالات میں ، میں نے اُسے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا تھا۔سمرنؔ نے بیڈروم میں لائیٹ آن کر کے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔سارا بیڈروم ٹیوب لائیٹ کی دودھیا روشنی میں نہایا ہوا تھا۔سمرنؔ نے نوشینؔ کو اپنی گود میں لیتے ہوئے کہا، اس طرح نہیں ڈرا کرتے۔آپ تو اپنے کمرے میں سوئی ہوئی ہیں۔جہاں ایک MOSQUITO بھی نہیں آسکتا ، COKROACH بھی نہیں آسکتا ایسی صورتوں میں سانپ کیسے اور کہاں سے آئے گا۔

''میں.....میں نے کمرے میں سانپ نہیں دیکھا تھا۔میں تو سوئی ہوئی تھی۔پھر میں پارک میں کیسے چلی گئی۔''

''اس کا مطلب آپ خواب دیکھ رہی تھیں۔''

''خواب نہیں میں سانپ دیکھ رہی تھی۔''

''آپ نے خواب میں کیا دیکھا۔؟''

''باباجانی ایک جگہ ایک پیڑ پہ سانپ لپٹا ہوا تھا۔پیڑ کی اُونچی شاخ پہ چڑیوں کا گھونسلہ بنا ہوا تھا۔اُس میں چڑیوں کے بچّے چوں چوں کررہے تھے۔سانپ رینگتا ہوا آتا، اور گھونسلے تک پہنچ جاتا پھر اُس کی لپلپاتی زبان باہر نکل آتی اور اُس کی سُرخ ہوتی ہوئی آنکھوں سے لال روشنی نکلنے لگتی۔اور پھر اُس سانپ کا بڑا جبڑا کھل جاتا۔اور وہ زہریلا سانپ چڑیا کے سارے بچّوں کو کھا جاتا ایسے وقت میں میں ڈری سی جاتی۔

''وہ سانپ چڑیا کے بچّوں کو کھا رہا تھا۔میں نے جب پتھر اُٹھا کر اُسے مارنے کی کوشش کی تو وہ میری طرف آنے لگا تھا۔اور میں ڈر سے چلاّنے لگی تھی.....''

''باباجانی آپ ابھی تک سوئے نہیں۔؟''

''پارک کے سانپ نے مجھے بھی پریشان کر رکھا ہے۔''

''ہاں باباجانی۔''

''مجھے بھی سانپ کی اس حرکت پہ بہت غصّہ آیا تھا، لیکن میں ، میں مجبور تھی کسی نے بھی میری مدد نہیں کی۔''

''آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں۔میں آپ کی مدد کروں گا کل آپ کا اسکول ہے۔''

''نہیں۔''

''کل صبح آپ میرے ساتھ وہاں جانا پسند کریں گی۔''

''کیوں نہیں۔''

دوسری صبح پارک میں مکمل سکوت چھایا ہوا تھا، اکّا دکّا لوگ پارک کی سیر کر رہے تھے۔پولیس والے بھی نہیں تھے میں نے اپنی بیٹی نوشینؔ کے ہاتھ میں پتھر دے دیا تھا۔اور کہا تھا کہ جیسے ہی تمہیں موقع ملے پتھر سے اُس سانپ کی آنکھ کو پھوڑ دینا لیکن دھیان رہے کوئی دیکھے نہیں۔

میں نے نوشینؔ کے کہنے کے مطابق بائک کو پارک کر دیا تھا۔اور اُس جگہ کو تلاش کرنے لگے۔نوشینؔ ادھر اُدھر اپنی نگاہیں دوڑا رہی تھیں۔اچانک اُس مقام پہ پہنچ کر وہ کافی زور زور سے ہنسنے لگی۔پتھر اُس کے ہاتھ سے چُھوٹ گیا تھا۔اور وہ تالی بجا رہی تھی۔

میں اُس کی اس حرکت پہ حیران تھا۔

اور اُس سے بھی زیادہ حیران میں اُس وقت ہوا جب میری نگاہ اُس پیڑ پہ پڑی.......

پیڑ پہ سانپ لپٹا ہوا تھا، اور ڈھیر سارے پرندوں نے ایک ساتھ اُس سانپ پہ حملہ کر دیا تھا۔اور سانپ کی دونوں آنکھیں پھوٹی ہوئی تھیں........

''تمنا کا آخری اقدم''

تازہ ترین تجزیہ کے مطابق کان کنی کے شعبے سے وابستہ آسٹریلیا کی جینا رائٹ ہارٹ اَنتیس ارب ڈالر کے اثاثوں کے ساتھ دنیا کی امیر ترین خواتین کی فہرست میں اوّل نمبر پر آ گئی ہیں۔اس سے قبل وال مارٹ کرسٹی والٹن دنیا کی امیر ترین خاتون گردانی جاتی تھیں۔جن کے اثاثوں کی کُل مالیت چھبیس ارب ڈالر بتلائی جاتی ہے۔

''حسینانِ روزگار''

سید مشکور حسین یاد

(لاہور)

کیا بارشِ برون میں آئے ہوئے ہیں ہم
معنیٰ کی مون سون میں آئے ہوئے ہیں ہم

کیا بات ہے ہمارے جلال و جمال کی
زیبائی زبون میں آئے ہوئے ہیں ہم

سُنتے ہیں حق کی بات سناتے ہیں حق کی بات
شہنائی شیون میں آئے ہوئے ہیں ہم

ہیں دست بستہ عقل و خرد اپنے سامنے
جولانیٔ جنون میں آئے ہوئے ہیں ہم

جو پوچھنا ہے پوچھیے ہم سے بصد خلوص
ہر بات کے بطون میں آئے ہوئے ہیں ہم

ہے ہر طرف ہجومِ حسینانِ روزگار
اِندر کے اُندرون میں آئے ہوئے ہیں ہم

ہم دیدنی ہیں یاؔد ہمیں دیکھیے ضرور
گُل گونِ گونا گون میں آئے ہوئے ہیں ہم

○

سرور انبالوی

(راولپنڈی)

کِس نے باندھا تھا وہ پیمانِ وفا یاد نہیں
ذہن سے محوہُوا اُس کا پتا یاد نہیں

جو مرے سانسوں میں ہر آن بسا رہتا تھا
کِس لیے ہو گیا وہ مجھ سے خفا یاد نہیں

وہ جو چاہت کے چراغوں کی لویں توڑ گیا
آخری بار کہاں پر وُہ ملا یاد نہیں

ثبت ہے ذہن کی دیوار پہ یہ کس کی شبیہہ
کس کی یادوں کا جلا پھر سے دیا یاد نہیں

بھرے میلہ میں ملا تھا جو اچانک اک روز
کس نگر ہو گیا وُہ دل سے جُدا یاد نہیں

ہم کہ محرومیٔ قسمت کا گلہ کرتے ہیں
اُس نے کیا کیا نہ کیا ہم کو عطا یاد نہیں

دشتِ فرقت میں ہر اِک گام گڑی تھی سُولی
کون تھا جو مرے ہمراہ چلا یاد نہیں

جس کی یادوں کے دیئے آج بھی روشن ہیں سُرور
اُس نے جو درد دیا اُس کی دوا یاد نہیں

ڈاکٹر شباب للت
(شملہ، بھارت)

حلال رزق کا مولیٰ کچھ انتظام بھی دے
مجھے دیا ہے جو علم و ہنر، تو کام بھی دے
مری غزل کو خدا حسنِ ناتمام بھی دے
دِیا ہے نطق تو رنگینیِ کلام بھی دے
بلالیا ہے تم مہماں کو احترام بھی دے
اسے طعام بھی صہبائے لالہ فام بھی دے
جگا ذرا کوئی جادو نظر کی جنبش سے
نظر سے کوئی شرارت بھرا پیام بھی دے
پسند، دوستی، چاہت، نیاز، عشق ،طلب
جو ہے ترے مرے مابین اُس کو نام بھی دے
تو اُس کو جا کے جگا خواب ناز سے اَے صبا
مرا سلام دے اُس کو مرا پیام بھی دے
اُٹھا کے جبر وستم کس لیے خموش ہیں ہم
زبان دی ہے تو پھر جرأتِ کلام بھی دے
برہنہ تیغ وہ لہرا رہا ہے برسرِ عام
جو تیغ دی ہے اُسے تو کوئی نیام بھی دے
وہ ہے خلوص کا پیکر، سبھی کا ہو محبوب
ہے شرط یہ کہ زباں کو ذرا لگام بھی دے
کرے گا کب تلک اپنے حریف کو تُو معاف
قلم کو اپنے کبھی اذنِ انتقام بھی دے
زمامِ ملک نہ ہو مجرموں کے ہاتھوں میں
خدائے پاک تُو ایسا ہمیں نظام بھی دے
وہ جس کے پینے سے لَوٹ آئے میرا عہدِ شباب
کبھی تو ساقیِ دَوراں! مجھے وہ جام بھی دے
شبابؔ اگر ترے معیار پر کھرا اُترے
تو اِس کی شان کے شایاں اسے مقام بھی دے

غالب عرفان
(کراچی)

اس کی نظر سے میرے دل تک ایک کہانی ختم ہوئی
بے بس، بے کل مستقبل تک ایک کہانی ختم ہوئی

پورے چاند کے جذرومد نے لا پھینکا باہر تو پھر
موج موج میں گُم ساحل تک ایک کہانی ختم ہوئی

آرزوؤں کے خواب سجائے عمر کے روز وشب گزرے!
اور مراد لاحاصل تک ایک کہانی ختم ہوئی

اُس کے رُخِ روشن پر جس نے کشش کا افسوں چھڑکایا
اس کے عارض کے اُس تِل تک ایک کہانی ختم ہوئی

میرے قتل کا اصلی قاتل مل نہ سکا تو حاکم سے
پکڑے گئے نقلی قاتل تک ایک کہانی ختم ہوئی

تھاپ پہ طبلے کی ، رقاصہ اپنا سُدھ بُدھ بھول گئی
پھر اُس کی ٹوٹی پائل تک ایک کہانی ختم ہوئی

دو اجنبیوں کو شادی کا بندھن باندھ نہ پایا تو!
لا ینحل ایسی مشکل تک ایک کہانی ختم ہوئی

عشق کا سودا سر میں سمایا تو بھٹکا یارا ہوں
پھر عرفان کی اک منزل تک ایک کہانی ختم ہوئی

○

نسیم سحر
(جدہ)

ہَوَسِ زر میں جو خود ہاتھ میں کاسہ رکھے
کیسے مُفلِس کی ہتھیلی پہ وہ سِکّہ رکھے

مَیں نے تو دل کا لہو دے کے نکھاری ہے غزل
اب مِرے بارے میں جو رائے زمانہ رکھے!

ڈوبنا ہے تو کنارے کی ضرورت کیا ہے؟
کوئی اِس ڈوبتی کشتی میں کنارا رکھے

میری تنہائی کا تُونے جو مداوا نہ کِیا
''جا، خُدا میری طرح تجھ کو بھی تنہا رکھے''

جن پہ وحشت میں مَیں لکھتا رہا جانے کیا کچھ
سامنے اُس نے وہ اوراقِ گذشتہ رکھے

کون جا سکتا ہے یوں دشتِ جنوں کے اندر؟
کس کا جِگرا، کہ ہم ایسا تِرا سودا رکھے!

یہ جو اُبھرا تو کہیں ڈوب نہ جائے بستی!
میرے چشمے پہ کوئی ریت کا ٹیلہ رکھے!

نظر آ جائیں نہ دامن پہ لگے داغ نسیمؔ!
وُہ اِسی خوف سے بستی میں اندھیرا رکھے

○

مہندر پرتاپ چاند
(انبالہ، بھارت)

جو نیکیوں سے بَدی کا جواب دیتا ہے
خدائے پاک اُسے اجر و ثواب دیتا ہے

اُسی کے حکم سے گھر بار اُجڑ بھی جاتے ہیں
وہی پھر اُن کو بسانے کے خواب دیتا ہے

بشر پہ قرض جو ہوتے ہیں کارہائے جہاں
تمام عُمر وہ اُن کا حساب دیتا ہے

غرض یہ ہے نہ ہو فکر و عمل میں کوتاہی
خُدا دلوں کو اگر اضطراب دیتا ہے

قصور اس میں بھی ہے والدین کا شاید!
جو بچّہ اُن کو پلٹ کر جواب دیتا ہے

کٹی ہے عمر عذابوں میں۔ دیکھتے رہیے
مزید کیا دلِ خانہ خراب دیتا ہے!

وہ آزماتا ہے صبر آدمی کا کانٹوں سے
پھر اُس کے بعد مہکتے گلاب دیتا ہے

سوال دید و ملاقات کر چکے ہیں چاندؔ!
اب آگے دیکھیے وہ کیا جواب دیتا ہے!

○

جاوید زیدی

(یو۔ایس۔اے)

جہانِ روز وشب میں جبّہ و دستار بکتے ہیں
یہاں محراب و منبر مسجد و مینار بکتے ہیں

الگ ہیں دام لیکن قیمتیں سب کی مقرّر ہیں
خُدا ہوں نا خُدا دیکھو سرِ بازار بکتے ہیں

کسی کو کیا خبر ہے دل کی دُنیا ایسی منڈی ہے
غریبِ شہر بکتا ہے تو ساہوکار بکتے ہیں

نشہ ہے دین و دنیا کا سرایت جسم و جاں ایسا
اسیرانِ ہوس بے خود ہوں یا ہشیار بکتے ہیں

دواؤں کی فضا آلود ہے، تعلیم ہے جعلی
طبیب و عالم و فاضل یہاں بیمار بکتے ہیں

❍

اشرف جاوید

(لاہور)

خاک میں جو مہرِ امکان بھی ہو سکتا ہے
عشق سے آدمی انسان بھی ہو سکتا ہے

آئنہ بول پڑا اس کے مقابل آ کر!
حیرتی صاحبِ وجدان بھی ہو سکتا ہے

رقص کرتا نظر آتا ہے سرِ دست حیات
یہ بگولا کوئی طوفان بھی ہو سکتا ہے

آج جو دست و گریبان بنا بیٹھا ہے!
کل وہی دست و گریبان بھی ہو سکتا ہے

دیکھتے دیکھتے پانسہ نہ پلٹ جائے کہیں
نفع تیرا، ترا نقصان بھی ہو سکتا ہے

اک تماشا پسِ دیوار انا جاری ہے
اک تماشا سرِ میدان بھی ہو سکتا ہے

پلٹ آیا ہے، ہدف جس نے بنایا ہے مجھے
میرا چھوڑا ہوا پیکان بھی ہو سکتا ہے

چال وہ آن پڑی ہے، کہیں شہ مات نہ ہو!
کھیلنے والا پریشان بھی ہو سکتا ہے

کب تلک تیرے تسلط میں رہیں، جبر سہیں!
کوئی دن! جنگ کا اعلان بھی ہو سکتا ہے

❍

ہوا کے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستانِ حیات)

فیروز عالم

(کیلی فورنیا' امریکہ)

(پاکستان کے مختصر سفر کی روداد)

تقریباً سات سال بعد پاکستان جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک زمانہ تھا کہ ہر سال پاکستان جاتا تھا۔ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۹۵ء تک ہر سال بلکہ کبھی کبھی سال میں دو بار جانا لازمی تھا کیونکہ ۱۹۷۰ء میں جب پہلی بار جہاز پر چڑھنے سے پہلے امّاں کے گلے لگا تھا تو انہوں نے آنسوؤں سے رندھی آواز میں کہا تھا ''اتنی دور جا رہے ہو''بس اس وقت میں نے ان سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ''اماں آپ فکر نہ کریں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہر سال آپ سے ملنے آیا کرونگا'' اللہ نے مجھے سرخرو کیا اور ۱۹۹۵ء میں انکے انتقال تک ہر سال انکی پیار بھری آغوش کی گرمی اور انکی قدم بوسی کی سعادت نصیب ہوئی۔ اسکے بعد بھی گاہے بگاہے جاتا رہا مگر ۲۰۰۵ء میں اپنے بڑے بھائی سید سلطان عالم کی وفات کے بعد یہ سلسلہ ٹوٹ گیا اور خیال تھا کہ اب شاید ہی پاکستان جانا ہو۔ دراصل کوئی رہ ہی نہیں گیا تھا جسکی کشش پاکستان کھینچتی۔ حد تو یہ تھی کہ اگر جاتا بھی تو کہیں ٹھہرنے کا بھی ٹھکانہ نہ ہوتا۔ کیونکہ ہم اپنا گھر بیچ چکے تھے اور ایسا کوئی نہیں رہا تھا جو میری مہمانداری کا بوجھ اٹھاتا۔ مگر یہ معلوم نہ تھا کہ وطن کی کشش، اپنے ماحول اور ان شہروں اور گلیوں کی یاد کبھی نہیں مٹتی اور عمر کے اس حصے میں دل خواہ مخواہ یہ چاہتا ہے کہ

''لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو''

ادھر میرے پرانے دوست، خاص طور سے میرپورخاص اور حیدر آباد کے پرانے ساتھی بھی مستقل مجھے اپنی جانب کھینچ رہے تھے۔ پھر میں کچھ دنوں سے کام کی زیادتی سے مضمحل ہو چکا تھا اور دل چاہتا تھا کہ اس تیز رفتار اور مشینی زندگی سے کچھ ہی دنوں کے لئے فرار حاصل ہو۔ تو میں نے بھی ''پاکستان یاترا'' کا پروگرام بنالیا۔

روانگی

میں بروز جمعہ چار مئی کو ترکش ائر لائینز کے ذریعہ لاس انجلز سے روانہ ہوا۔ اس دفعہ روانگی سے چند ہی دن پہلے دل میں اچانک یہ خیال بھی آیا تھا کہ خالق کائنات، باری تعالی اور اللہ جل جلالہ کے در پر بھی سر جھکا دیا جائے۔ اسکے شکرانوں سے دل بوجھل تھا کہ جو کچھ اس نے مجھے عطا کیا اور جس طرح اس نے اپنی رحمتوں کے دروازے مجھ پر وا کئے ہیں اس کا شکرانہ ادا کرنے کا اس سے بہتر طریقہ مجھے نہیں آتا تھا۔ ہماری فلائٹ شام ساڑھے چھ بجے اڑی تھی اور دوسرے دن شام ساڑھے چار بجے استنبول پہنچی۔ جہاز بالکل نیا اور بیحد صاف ستھرا تھا۔ فزائی میزبان یوں تو یوروپین لگ رہی تھیں مگر سب کے نام وہی عربی یا فارسی تھے جو ہمارے لئے مانوس ہیں۔ میری میزبان کا نام انگریزی میں ''ہنڈے'' لکھا تھا جو میرے لئے نیا تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ یہ ترک کرسچین یا یہودی نام ہوگا مگر جب میں نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا نہیں یہ تو فارسی نام ہے جسکے معنی ''مسکراہٹ'' ہیں۔ اب مجھے خیال آیا کہ ترکی زبان میں ''خ'' کو ''ح'' لکھا جاتا ہے اس لئے اسکا نام ''خندہ'' ہے جیسے ''خندہ پیشانی''۔ مجھے یہ سب کچھ بہت اچھا لگا، پھر وہ تھی بھی بہت ہی خوش اخلاق اور اسنے استنبول تک میری خوب خاطر مدارات کی۔

استنبول

میں اس سے پہلے ۱۹۷۳ء میں استنبول کے ائر پورٹ پر اترا تھا۔ اس وقت استنبول کا ائر پورٹ میرپورخاص کے ریلوے اسٹیشن سے بھی چھوٹا اور پسماندہ تھا۔ مجھے وہ اسٹیشن دیکھ کر میرپورخاص کے ایک مضافاتی چھوٹے شہر ٹنڈو اللہ یار کا ریلوے اسٹیشن یاد آیا تھا۔ اس عرصے میں دوبارہ استنبول جانا نہیں ہوا تھا۔ اب مقامی وقت کے مطابق جب میں شام ساڑھے چار بجے وہاں اترا تو میری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ بلا شبہ اس وقت استنبول کا ائر پورٹ یورپ کے تمام ائر پورٹس میں جن میں لندن، پیرس اور فرینکفرٹ کے ائر پورٹ شامل ہیں کے مقابلے میں زیادہ جدید، بڑا اور خوبصورت لگا۔ بس ایک دوسری دنیا تھی اور جدید ترکی کی معاشی ترقی کا منہ بولتا ثبوت۔ میرے پاس سات گھنٹے تھے اور ابھی اول شام تھی ویسے بھی میں یہ سوچ کر چلا تھا کہ اگر موقعہ ملا تو میں مغرب یا عشاء کی نماز ''جامعہ سلطان احمد'' میں ادا کرونگا۔ مگر جب میں امیگریشن پر پہنچا تو مجھے ذرا حیرت اور پریشانی ہوئی کہ مجھے ترکی کا ویزا لینا ہوگا۔ مگر سامنے ہی ایک ویزا ڈیسک تھی جہاں دس منٹ سے بھی کم وقت میں بیس ڈالر فیس دینے پر میرے پاسپورٹ پر ویزا کی مہر لگ گئی۔ خیر مقدمی لاؤنج میں پہنچ کر جب میں نے پوچھا کہ مرکزی شہر جانے کے لئے بس یا شہر کی ٹیکسی کہاں سے ملے گی تو ایک اور خوشگوار حیرت ہوئی جب مجھے بتایا گیا کہ میں ''میٹرو'' یعنی زیرِ زمین ٹرین لے لوں۔ اس قسم کی ٹرینیں اب تک صرف لندن پیرس یا نیویارک کے لئے مختص تھیں۔ ہم گزشتہ سال یورپ کے تفریحی دورے پر تھے اور سارے بڑے شہروں کی زیرِ زمین ٹرینوں میں بیٹھے تھے مگر استنبول کی ٹرین سب سے نئی، صاف ستھری اور سبک رفتار تھی۔ زیرِ زمین اسٹیشن بھی خوبصورت اور نئے تھے۔ صرف اسکا مقابلہ سپین کے دارالحکومت میڈرڈ کی ٹرین سے کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ بھی ابھی ابھی بنی ہے اور نئی ہے۔

میں مغرب سے ذرا پہلے ''سلطان احمد'' کے علاقے میں پہنچ گیا۔ استنبول باسفورس کے کنارے واقع ہے اور یہ کئی سو سال عثمانیہ سلطنت کا

دارلخلافہ رہا ہے۔زیادہ تر شہر یورپین مزاج لئے ہے مگر سلطان احمد کا علاقہ قدیم شہر کا حصہ ہے اور یہاں مشرقی اور اسلامی تہذیب کا راج ہے۔یہ عظیم لشان مسجد سلطان احمد اول نے ۱۶۰۹ء میں تعمیر کی تھی۔یہ بالکل ''ہیا صوفیہ'' کے عظیم گرجا گھر کے سامنے ہے (جسے کچھ عرصے کے لئے مسجد میں تبدیل کردیا گیا تھا اور اب وہ عجائب گھر ہے) اسکے طرز تعمیر میں بازنطینی اور اسلامی رنگ کی آمیزش ہے۔اس سلسلے میں ایک روایت مشہور ہے کہ کسی نے طعنہ دیا کہ ''ہیا صوفیہ'' جیسی عظیم عمارت کو مسجد میں تبدیل کر کے کیا کمال کیا خود اپنی مسجد ایسی بنائیں جسے سن کر سلطان احمد نے بالکل اسکے سامنے یہ مسجد بنائی جو ہیا صوفیہ سے کہیں زیادہ عظیم الشان ہے۔وہاں بڑی رونق تھی۔میں نے وہاں مغرب کی نماز ادا کی اس کے بعد مسجد کے اطراف بنی درجنوں تکّے کباب کی دکانوں میں سے ایک میں کھانا کھایا جہاں ایک برطانوی جوڑا بھی میری میز پر تھا انہوں نے بڑی حد تک حسد سے کہا کہ آجکل یورپ کی جو مالی زبوں حالی ہے اور خاص طور سے ترکی کا رقیب یونان تو بالکل ہی دیوالیہ ہو چکا ہے اس کے مقابلے میں ترک معاشی حالت کہیں بہتر ہے۔اسکے باوجود ترک یورپین یونین میں شامل ہونے کو بیقرار ہیں اور یوروپین یونین انہیں کسی صورت میں اس کیمونٹی میں جگہ دینے کو تیار نہیں ہے۔اس نے کہا اگر وہ ترک وزیر اعظم ہوتا تو خود یورپین یونین کو ٹھوکر مار دیتا۔

کچھ دیر دکانوں کی سیر کی اور ترک دستکاری کے نمونے دیکھے لیکن جدّہ کے لئے میری فلائیٹ رات دو بجے تھی اس لئے میں واپس دس بجے ائر پورٹ پہنچا اور ائر پورٹ پر بنی بیحد صاف ستھری اور خوبصورت مسجد میں نماز ادا کر کے جہاز میں سوار ہو گیا۔نمازوں اور مسجدوں کا تذکرہ اس تناظر میں ہے کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مصطفیٰ کمال نے بڑی حد تک مذہب پر پابندی لگادی تھی اور ترکی کو مکمل طور پر مغربی رنگ میں رنگ دیا تھا۔ترکی وہ واحد ملک ہے جہاں سرکاری طور پر حجاب اور ترکی ٹوپی پر پابندی ہے۔مجھے بھی ۱۹۶۳ء میں کہیں نماز یا آذان وغیرہ کی آوازیں سنائی نہیں دی تھیں اور ۱۹۷۰ء میں ڈیٹرائٹ میں جن دو ترک لڑکوں سے ملا تھا انہیں نماز یا اسلام کے دوسرے فرائض سے کسی قسم کی آگاہی نہیں تھی مگر گزشتہ دس سالوں میں ترکی میں بڑی حد تک عوام کے طرز زندگی میں اسلام کی واپسی ہوئی ہے۔اس پر مجھے مولانا محمد علی جوہر کا یہ شعر یاد آیا

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دباؤ گے

جدہ آمد

رات دو بجے استنبول سے روانہ ہو کر میں صبح پانچ بجے جدہ کے ائر پورٹ پر اترا۔ائر پورٹ بہت چھوٹا ہے اور جہاز سے مسافروں کو بسیں ٹرمینل تک لے کر جاتی ہیں۔سعودی عرب ہمیشہ سے زائرین اور سعودی عرب آنے والے دوسرے مسافروں کے لئے ایک مشکل جگہ ہے کچھ تو زبان کا مسئلہ ہے اور کچھ ایسا لگتا ہے کہ وہاں کام کرنے والے جان بوجھ کر مسافروں کے لئے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔میں بالکل مطمئن تھا مگر جب میں امیگریشن پر پہنچا تو افسر نے (جو بالکل انگریزی نہیں جانتا تھا) مجھ سے استنبول سے روانگی کا بورڈنگ پاس طلب کیا جو میں ہوائی جہاز کی نشست کی پشت پر لگی پاکٹ میں چھوڑ آیا تھا۔اس پاس کی اب کوئی ضرورت نہیں تھی، بڑی ردو قدح کے بعد اور ایک ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے والے کارندے کی مدد سے مشکل حل ہوئی اور میرے پاس پورٹ پر ٹھپا لگا اور میں اندر داخل ہوا۔کسٹم سے باہر نکل کر جب وہاں آیا جہاں جدہ سے مکہ معظمہ جانے کے لئے سواری ملتی ہے تو ایک نئی پریشانی میرا انتظار کر رہی تھی۔

میں نے لاس انجلز سے اس بات کا انتظام کیا تھا کہ مجھے جدہ ائر پورٹ پر لینے کے لئے لیموزین آئیگی اور مکہ میں میرے ہوٹل پر چھوڑے گی۔باہر بہت سے لوگوں کو لینے سواریاں آئی ہوئی تھیں اور انکے ڈرائیور ناموں کی تختیاں لئے کھڑے تھے مگر میرے لئے کوئی نہیں تھا۔کوئی بتانے والا نہیں تھا، کوئی ''انفورمیشن ڈیسک'' نہیں تھی۔پرائیویٹ ٹیکسیوں کے ڈرائیور تیسری دنیا کے رواج کے مطابق آوازیں لگا رہے تھے۔۔مکہ مکہ مکہ۔۔۔میرے پاس لیموزین کا نمبر تھا مگر کوئی پبلک ٹیلیفون یا ایسا کائی طریقہ نہ تھا کہ میں فون کرتا۔اس پر یہ کہ میں انتہائی تھکا ہوا تھا پسینے میں شرابور تھا اور بڑی حد تک تھکن سے گرنے والا تھا۔پھر کسی کو انگریزی نہیں آتی تھی جو میری مدد کرتا۔خدا کا شکر ہے کہ ایک پاکستانی ڈرائیور مجھے نظر آگیا اسنے مجھے دیکھ کر کہا کہ وہ میری لیموزین کمپنی کو اپنے موبائل فون سے کال کر کے انہیں میرے متعلق بتا ئیگا۔اس نے بہت کوشش کی مگر ادھر سے کسی نے فون نہیں اٹھایا۔میں جلد سے جلد ہوٹل پہنچ کر بستر پر گرنا چاہتا تھا۔مکہ تک جانے کا کرایا پرائیوٹ وین میں پچاس ریال فی کس ہے، بڑی مشکل سے ایک وین والا دوسو ریال پر تیار ہوا کہ مجھے اکیلے لیجانے پر اتنا ہی کرایہ ہوگا مگر جب میں بیٹھ گیا تو اس نے دوسری سواریوں کے لئے آوازیں لگانی شروع کردیں اور چار سواریاں اور اٹھائیں بہر حال میں ائر پورٹ پر ایک ڈیڑھ گھنٹے دھکے کھانے کے بعد اپنی ہوٹل پہنچا۔تین دن سعودی عرب میں اچھے گزرے، ساتھ خیریت کے عمرہ کیا۔حرم شریف میں بیحد ہجوم تھا اور نماز کی جگہ مشکل سے ملتی تھی۔میرے ہوٹل کی لابی حرم شریف کے آنگن میں کھلتی تھی اور کبھی کبھی ہوٹل کی لابی ہی میں نماز کی صفیں لگ جاتی تھیں۔

میں جھک کے ڈھونڈ تا ہوں جوانی کدھر گئی

اس سے پہلے کہ میں اس باب کو ختم کروں یہ بیان ضروری ہے کہ عمرہ میں یہ احساس جاگ اٹھا کہ اب میں وہ فیروز نہیں جو ۱۹۶۷ء میں یہاں عمرہ کرنے آیا تھا۔اُس وقت میں نے ایک رات میں چار عمرے کئے تھے اور سعی کرنے میں لطف آیا تھا۔آخری عمرہ ۲۰۰۸ء میں کیا تھا جس میں سعی کے بعد ٹانگوں میں سخت اینٹھن اور درد ہوا تھا کئی دن چلا نہیں گیا تھا۔اس دفعہ طواف کے بعد ہی بری حالت ہو چکی تھی اور سعی کی جگہ تک جانا ہی محال لگ رہا تھا لڑکھڑاتا ہوا صفا کی پہاڑی تک پہنچا یہ طے تھا کہ سات چکر تو بڑی بات ہے آدھے چکر ہی

میں گر جاؤنگا۔سعودی عرب میں اس سے پہلے کرسیوں پرسعی ہوتی تھی جو وہاں کے مزدور پچاس ریال لے کر کروادیا کرتے تھے۔اس دفعہ ایسا کوئی انتظام نہیں تھا مگر یہ پتہ چلا کہ آپ اسکوٹر لے سکتے ہیں اور خود چلا کر سعی کر سکتے ہیں۔مگر میں اس قدر نڈھال تھا کہ سکوٹر بھی چلانے کے قابل نہیں تھا۔مگر یہ جان کر بہت ہی خوشگوار احساس ہوا کہ مکہ کے کالجوں کے طالب علموں کی ایک تنظیم مجھ جیسے بوڑھوں کو خدمت خلق کے طور پر پہیوں والی کرسی پر مفت سعی کرواتی ہے۔مجھے ایک نہایت کم عمر حبشی النسل نہایت پیارے لڑکے نے سعی کروائی میں اسے خوش ہو کر انعام کے طور پر کچھ ریال دینا چاہتا تھا مگر وہ مجھ سے بار بار کہتا رہا کہ آپ کی دعائیں میرے لئے سب سے بڑا انعام ہیں مجھے دعاؤں میں یاد رکھیں۔میں اس کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ اسکو جزا دے اور لمبی عمر، کامیابی اور خوشحال مستقبل عطا کرے۔دوسرے دن میں صبح اسلام آباد کے لئے روانہ ہوا۔

اسلام آباد۔۔اسلام آباد

ہمارا جہاز سہ پہر چار بجے اسلام آباد کے ائرپورٹ پر اترا، نیچے بے برگ گیاہ بھوری سرزمین تھی جو دھوپ اور گرمی کی وجہ سے چٹخ گئی تھی۔جہاز دور کھڑا ہوا، باہر آ کر ایسا لگا کہ آسمان سے آگ برس رہی ہو۔بس ائر کنڈیشن تھی مگر جب ہم ٹرمینل بلڈنگ میں پہنچے تو شاید لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے ائر کنڈیشن بند تھا۔میں اس سے پہلے ایک دفعہ راولپنڈی کے چکلالہ ائرپورٹ پر اترا تھا جو بین الاقوامی معیار کا ائرپورٹ نہ تھا۔اب یہ سن کر کہ ہم اسلام آباد کے ائرپورٹ پر اتر رہے ہیں میں سمجھا تھا کہ اسلام آباد کا ائرپورٹ نیا اور ہمارے دارالخلافہ کے شایان شان ہوگا مگر میرے ذہن کو جھٹکا لگا کہ یہ تو وہی ائرپورٹ ہے صرف اسکا نام بدل دیا گیا ہے۔امیگریشن ہال بہت ہی معمولی تھا۔میرے تصور میں استنبول کا ائرپورٹ گھوم گیا اور مجھے افسوس ہوا کہ ان چند دہائیوں میں دنیا کہاں کہاں سے پہنچ گئی اور ہم۔۔۔اگر ایمانداری سے اس کا اعتراف کیا جائے تو کچھ پیچھے ہی چلے گئے ہیں۔میں ایک سچا اور مخلص پاکستانی ہوں اور میں یہ سوچتا ہوں کہ کاش ہم بھی دنیا کے ان ممالک کی طرح (جیسے سنگاپور، جنوبی کوریا، ملیشیا، تھائی لینڈ اور ترکی جو ستر کی دہائی میں تیسری دنیا میں شمار ہوتے تھے اور نسبتاً پسماندہ تھے اب نظر خیز ترقی کر چکے ہیں) دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں شامل ہوتے۔مگر حیف ایسا نہ ہوسکا۔اس کا زیادہ افسوس ہے کہ ہمارا POTENTIAL ان تمام ممالک سے کہیں زیادہ تھا مگر ہم نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اور اب تو ہم تیزی سے تنزل پذیر ہیں۔

خدا خدا کر کے امیگریشن کاؤنٹر آیا۔میرے پاس امریکی پاسپورٹ ہے اور میں ہمیشہ پاکستان ویزا لیکر آتا ہوں۔اس دفعہ میرا ویزا ختم ہو چکا تھا مگر میرے پاس نادرا کا جاری کیا ہوا پاکستان کا شناختی کارڈ تھا اور مجھے بتایا گیا تھا کہ اس کارڈ کی وجہ سے مجھے ویزے کی ضرورت نہیں ہے۔میں یہاں یہ بھی لکھ دوں کہ میں پاکستان آ کر ہمیشہ اپنے سرکاری ہم وطنوں سے بہت ہی خاکساری، محبت اور عزت سے بات کرتا ہوں مبادہ وہ یہ نہ سوچیں کہ غیر ممالک سے آنے والے خواہ مخواہ پاکستانی عملے کو خود سے کمتر سمجھتے ہیں۔اس لئے میں نے بہت مسکرا کر اور خوش مزاجی سے امیگریشن افسر کو اپنا پاسپورٹ اور پاکستان کا شناختی کارڈ دیا۔اس نے خشمگیں نظروں سے مجھے دیکھا اور بار بار پاسپورٹ کے صفحے پلٹنے لگا۔اس کے بعد نہایت بدتمیزی سے مجھ سے کہا ویزا دکھائیں۔میں نے کہا میں نے شناختی کارڈ آپ کو دکھایا ہے۔اس نے پھر بڑی رعونت سے کہا شناختی کارڈ نہیں ویزا پوچھ رہا ہوں۔میں نے کہا مجھے تو بتایا گیا تھا کہ شناختی کارڈ (میرے پاس NICOP نہیں ہے) پر ویزا کی ضرورت نہیں۔بدتمیزی سے کہنے لگا جس نے یہ بتایا تھا اس سے جا کر ویزا لے آئیں میں تو آپ کو انٹری نہیں دونگا اور ابھی واپس جہاز میں بٹھا دونگا۔اب تو میں بہت پریشان ہوا۔میں نے کہا بھائی صاحب کوئی تو صورت ہوگی۔وہ اس پر کافی اپ سیٹ ہوا اور بڑبڑانے لگا کہ آ جاتے ہیں ہمارا بھی وقت ضائع کرتے ہیں اور اپنا بھی۔اس کے بعد اس نے نہایت سرد مہری سے مجھے الگ ہٹنے کا اور اگلے مسافر کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔میں ایک طرف کھڑا ہو گیا دو چار مسافروں کے بعد میں نے دبی زبان سے کہا میں کیا کروں؟ کہنے لگا جب سب مسافروں کو نمٹا لونگا تو آپ سے بات کرونگا۔ایک لمبی لائن تھی۔جب ختم ہوئی تو مجھے پھر بلایا اور ڈراتے ہوئے کہا ''کیا کریں آپ کو واپس بھیج دیں'' اب تو میں سچ مچ میں پریشان ہو گیا اس لئے کہ مجھے اسکا تو اندازہ ہے کہ ''یونیفارم'' میں ملبوس اہلکاروں کے پاس بڑے اختیار ہوتے ہیں۔میں نے اس سے درخواست کی کہ کم از کم وہ مجھے بڑے افسر سے ملنے دے یقیناً ایسا کوئی طریقہ ہوگا کہ مجھے عارضی پرمٹ مل جائے۔اس پر وہ مجھے اپنے بڑے افسر کے پاس، جسکے کاندھے پر تین ستارے تھے لے گیا۔یہ ایک نوجوان، بھوری مونچھوں اور نہایت گوری رنگت کا بہت ہی مہذب فرد تھا اس نے دو منٹ میں اس سے کہا انکو بہتر گھنٹے کا عارضی ویزا دیدو۔پھر مجھ سے کہا کہ آپ آئندہ بہتر گھنٹے میں یہاں کی وزارت داخلہ سے حقیقی ویزا بنوالیں۔مجھے غصہ تو بہت آیا کہ یہی بات وہ افسر بھی مجھ سے طریقے سے کہہ سکتا تھا مگر مجھے ایسا لگا کہ جیسے وہ مجھے ملک سے باہر رہنے کی سزا دے رہا تھا۔میں نے اللہ کا اور اس افسر کا تہہ دل دے سے شکریہ ادا کیا۔اس اثناء میں مجھے دو گھنٹے لگ گئے تھے اور مجھے اس کا بڑا افسوس تھا کہ باہر ''چہارسُو'' کے مدیر گلزار جاوید صاحب میرے انتظار میں کتنا پریشان ہو رہے ہونگے۔بہرحال جیسے ہی باہر نکلا انکے صاحب زادے افتخار جاوید نے بڑھ کر میرے ہاتھوں سے بیگ لیا اور دوسرے ہی لمحے گلزار صاحب نے گلے لگایا۔ہم انکی ائر کنڈیشن کار میں انکے گھر پہنچے۔مگر ایک تو میرے منہ کا ذائقہ اس امیگریشن افسر کی وجہ سے بڑا کڑوا ہو گیا تھا دوسرے یہ پریشانی تھی کہ وزارت داخلہ سے ویزا کے لئے اب کیا پاپڑ بیلنے پڑینگے۔میرے پاس پاکستان میں کل دس دن تھے اور راولپنڈی میں صرف دو دن اس دوران دفتروں کے چکر کیونکر لگاؤنگا۔

شام ہو چلی تھی ہم نے گلزار صاحب کے گھر کے سبزہ زار پر پرتکلف چائے پی اور نہایت دلچسپ گفتگو کا لطف اٹھایا رات میرے منع کرنے کے باوجود گلزاصاحب کی بہوؤں نے ڈنر پر رنگا رنگ کھانے چن دئے مگر اس سے کہیں زیادہ وہ دلچسپ اور معلوماتی گفتگو تھی جسمیں انکے تینوں بیٹوں اور بہوؤں نے حصہ لیا۔ عالمی سیاست، عام موضوعات، ادب اور اسلامی دنیا کو درپیش مسائل پر اس گھرانے کی معلومات سے میں بہت متاثر ہوا اور اس سے کھانے کا لطف دوبالا ہو گیا۔

دوسرے دن کی روئداد میں تفصیل سے بیان نہیں کرنا چاہتا کہ پاکستان میں رہنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ ایک مجبور انسان کے ساتھ سرکاری دفاتر میں کیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ بس اتنا کافی ہے کہ شدید گرمی میں مجھے، گلزار صاحب اور افتخار جاوید کو مرکزی حکومت کے ایک بلاک سے دوسرے بلاک اور ایک فرعون صفت افسر سے دوسرے افسر تک کتنے چکر کاٹنے پڑے کہ بقول شخصے ''نانی یاد آ گئی'' خدا خدا کر کے شام پانچ بجے مجھے ایک کاغذ ملا کہ اس کو لیکر کراچی کے پاس پورٹ آفس جانا پڑیگا۔ میرا خیال تھا کہ اتنی مشقت کے بعد مجھے یہیں سے ویزا مل جائیگا مگر انہوں نے کہا کہ ویزا مجھے کراچی ہی سے لینا ہوگا۔ پھر وہی فکر کہ اب کراچی میں دفتروں کے چکر لگیں گے۔ اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ لاس انجلز سے ویزا کھڑے کھڑے مل جاتا پھر کیوں یہ حماقت کی۔

خوشگوار دوپہر

اس دن کی خوشگوار یاد یہ ہے کہ میرے آنے سے پہلے گلزار صاحب نے پاکستان ٹیلیوژن کی نہایت ذہین وفطین اور خوش گفتار پروڈیوسر فرخندہ شمیم صاحبہ سے میری ملاقات طے کر دی تھی۔ ادھر ہمارے پاس بھی ویزا کے کاغذات جمع کروا کے دو گھنٹے کا وقفہ تھا تو ہم پاکستان ٹیلی وژن اسٹیشن پہنچے۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میں کسی بھی حوالے سے مشہور شخصیت نہیں ہوں مگر فرخندہ صاحبہ نے بہت ہی خندہ پیشانی اور محبت سے میرا استقبال کیا۔ چہارسو میں شائع ہونے والی تحریروں کے حوالے سے وہ میرے نام سے واقف تھیں۔ اگرچہ وہ بہت مصروف تھیں اور مجھے لگ رہا تھا کہ وہ ایک وقت میں کئی کام انجام دے رہی ہیں مگر وہ مجھے بھی پوری توجہ دے رہی تھیں۔ چونکہ وہ مجھ سے بہت چھوٹی ہیں اس لئے میں نے محسوس کیا کہ مجھ سے برتاؤ میں انکی طرف سے میرے لئے ایک خاص پاس ادب بھی شامل تھا۔ انہوں نے اس مصروفیت کے باوجود میرا انٹرویو کیا میرا خیال تھا کہ انٹرویو ادب یا میری کتاب کے حوالے سے ہوگا مگر جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں امراض گردہ کا ماہر ہوں اور طبی موضوعات پر اخباری کالم لکھتا رہا ہوں تو انہوں نے میرا انٹرویو طبی مسائل اور صحت عامہ کے عام موضوعات کے حوالے سے کیا۔ میں اس بات سے بہت متاثر ہوا کہ انہوں نے فی لبدیہ بہت اچھے، معلوماتی اور چبھتے ہوئے سوالات کئے اور مجھے جواب دینے کا پورا پورا موقع فراہم کیا۔ یہ انٹرویو کچھ ہفتوں بعد پاکستان ٹیلیوژن سے نشر ہو گا۔ یہ دوپہر میری یادوں میں ہمیشہ محفوظ رہیگی۔ اپنے اسقدر مصروف دن کے باوجود فرخندہ صاحبہ نے کمال محبت سے شام کو گلزار صاحب کے یہاں منعقد ہونے والی میری تعارفی محفل میں بھی شرکت کی جس کے لئے میں انکا ہمیشہ شکر گذار رہونگا۔

ادبی ستاروں کے درمیان ایک ٹمٹماتا دیا

۹ مئی ۲۰۱۲ کی شام میرے لئے ایک یادگار شام تھی جب گلزار جاوید صاحب نے مجھے اردو ادب کے ستاروں سے متعارف کرانے کے لئے اپنے گھر پر ایک بے تکلف تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ اگرچہ تمام دن شدید مشقت میں سیکریٹریٹ کے چکر لگاتے گزرا تھا پھر بھی اس توقع نے کہ میں آج ان لوگوں سے ملوں گا جن کو میں اپنی نوجوانی سے پڑھتا رہا ہوں مجھ میں ایک نئی تقویت پیدا کر دی۔ شام چھ بجے کا وقت دیا گیا تھا اور میں حیران ہوا کہ وقت کی انتہائی پابندی سے واقعی لوگ چھ بجے سے آنا شروع ہو گئے۔ فرخندہ شمیم تو ہمارے ساتھ ہی آ گئی تھیں ان کے بعد سب سے پہلے آنے والوں میں فنون لطیفہ کے قدردان اور پروموٹر کرنل کبیر احمد، بہاولپور کے حوالے سے نامور اسلامی محقق پروفیسر غلام رسول طارق، اردو ادب کے سنجیدہ قاری اور قدردان بریگیڈئر زبیر تھے۔ ان کے ساتھ ہی نامور شاعر اور ''سحاب'' کے مدیر نسیم سحر داخل ہوئے۔ اس کے فوراً بعد بین الاقوامی شہرت کے حامل افسانہ نگار، سابقہ اعلیٰ سول افسر اور سچے پاکستانی جن کی سقوط مشرقی پاکستان پر کتابوں نے تاریخی دستاویز کی حیثیت حاصل کر لی ہے یعنی مسعود مفتی ایک اور نامور اور منفرد افسانہ نگار وقار بن الٰہی کی معیت میں اس محفل کی عزت بڑھانے پہنچے۔ راولپنڈی کے ادبی منظر نامہ کے روح رواں ڈاکٹر نثار ترابی، ڈاکٹر سلیم اختر کے ہم جماعت سابق صحافی اور نثر نگار بریگیڈئر محمود احمد، تجزیہ نگار و محقق پروفیسر حافظ محمد احمد اور حبیب بنک کے جنرل منیجر اور شاعر جاوید ملک بھی آگے پیچھے داخل ہوئے۔ عبدالقدیر لیب کے ڈاکٹر محمد افضل جو نہایت فعال سماجی کارکن اور ادبی مزاج کے حامل ہیں، وزارت خارجہ کے ادب دوست اور چہارسو کے رفیق کار مصطفیٰ ملک، چہارسو کے سمندر پار ایڈیشن کے انچارج فاری شاہ، چہارسو کے آرٹ ڈیزائنر شعیب حیدر زیدی، نائب مدیر انعام الحق، ایڈیٹوریل بورڈ کے ممبران عظمیٰ رشید اور عروب شاہد اور چہارسو کے ہر دلعزیز اور خاکسار فطرت مدیر گلزار جاوید صاحب بھی میری عزت افزائی کے لئے موجود تھے۔ کچھ تاخیر سے ''سمبل'' کے ایڈیٹر اور نامور شاعر علی محمد فرشی بھی تشریف لے آئے تھے۔

مجھے یہ جان کر نہایت خوشگوار حیرت ہوئی کے تقریباً تمام حاضرین محفل مجھے چہارسو میں شائع ہونے والی سرگزشت ''ہوا کے دوش پر'' کے حوالے سے خوب پہچانتے تھے بلکہ مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ مجھ سے بھی زیادہ انہوں نے میری سرگزشت غور سے پڑھی ہے۔ اسکے متعلق انتہائی دلچسپ گفتگو رہی اور اس میں درج واقعات کے حوالے سے کئی سوالات کئے گئے۔ میں اپنی قسمت پہ

نازاں تھا کہ یوں تو سبھی میرے لئے قابل تعظیم تھے اور ادب میں بڑے نام کے حامل تھے مگر مسعود مفتی اور وقار بن الٰہی سے ملنا میرے لئے بڑے اعزاز کی بات تھی کہ میں کالج کے زمانے مین انکی تحریریں اردو کے عظیم اور معتبر جرائد میں پڑھا کرتا تھا۔

گفتگو میں ہر شخص نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا مگر ترابی صاحب نے خاص طور سے میری تحریر پر بہت ہی معروضی خیالات کا اظہار کیا۔اس کے بعد میں نے اپنی نئی شائع شدہ کتاب ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' مہمانوں کی نذر کی۔ آ خیر میں پروفیسر طارق نے مجھے قرآن پر اپنی ایک نادر کتاب سے متعارف کروایا اور جاتے ہوئے وہ کتاب مجھے تحفے میں بھی دی۔مجھ جیسے گمنام اور ادبی لحاظ سے کم حیثیت فرد کو ان سب نے بہت پیار اور عزت دی جسکے لئے میرے ل میں انکے لئے ہمیشہ تشکر کے جذبات رہیں گے۔تقریب میں یوں تو ''ریفریشمنٹ'' کا وعدہ کیا گیا تھا مگر اس قدر انواع واقسام کی چیزیں تھیں کہ انتخاب مشکل ہو رہا تھا۔رخصت ہوتے ہوئے مجھے تقریباً سبھی نے اپنی کتابوں سے نواز اور پیار بھرے الفاظ سے میری عزت بڑھائی۔اس شام کی یاد یقیناً آخری سانس تک میرے لبوں پر مسکراہٹ کا باعث ہوگی۔

کراچی

راولپنڈی سے دوپہر کو تین بجے پی آئی اے کے ذریعہ پرواز کر کے میں پانچ بجے شام کراچی پہنچا۔روانہ تو دو بجے ہونا تھا مگر روانگی کا وقت ہونے کے آدھے گھنٹے بعد تک چلنے کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا۔سب مسافر جہاز میں بندھے بیٹھے تھے اس کے ساتھ ہی جہاز میں سخت گرمی تھی کہ جب تک جہاز پرواز نہ کرے ائر کنڈیشن آن نہیں ہوتا۔سب مسافر پریشان تھے۔کچھ عرصے بعد کپتان کا پیغام ملا کے جہاز کا اپنا بجلی کا جنریٹر آن نہیں ہو رہا اس لئے اسکا جی پی ایس GPS کا کمپیوٹر بھی نہیں چل رہا۔مزید آدھا گھنٹہ اس گھٹن میں گزرا۔میرے پاس بیٹھے ہوئے مسافر نے یہ کہہ کر مجھے مزید ڈرا دیا کہ اگر دوران پرواز یہ کمپیوٹر فیل ہو گیا تو اللہ ہی حافظ!! خیر جہاز خیریت سے کراچی اترا۔ایک مزاحیہ چیز یہ ہوئی کہ میں جہاز کی آخری نشست پر تھا اور جہاز کے رکتے ہی میں باتھ روم میں گھس گیا تھا کہ جب تک مسافر اتریں گے میں نکل آ ؤنگا مگر میں جب نکلا تو سب مسافر جا چکے تھے اور ایک ایمبولنس نما وین دو تین معذوروں کو ویل چئر پر بٹھا کر اس میں لا د رہی تھی مجھے بھی انہوں نے ایک ویل چئر پر بٹھا دیا اور اس ایمبولنس میں سوار کروا دیا اگرچہ میں نے بہت منع کیا مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور کہا کہ اب ٹرمنل تک جانے کا یہی طریقہ ہے۔حالانکہ کراچی میں جہاز جدید اور بین الاقوامی اڈوں کی طرح ٹرمنل سے سرنگ کے ذریعہ منسلک ہوتا ہے۔مرتا کیا نہ کرتا میں ویل چئر پر بیٹھ کر ڈائرکٹ آمدہ لاؤنج میں پہنچا۔پنڈی کے بعد مجھے کراچی کا ائر پورٹ بہت اچھا لگا پھر کراچی میں بادل چھائے ہوئے تھے اور بہت جانفزا ہوا چل رہی تھی۔اسکے ساتھ ہی میرے سابقہ پروفیسر اور استاد ڈاکٹر محسن احمد بنفس نفیس اپنی نئی مرسیڈیس لئے میرا انتظار کر رہے تھے میں انہی کا مہمان تھا۔اف اللہ، یہ سب محبتیں، یہ سب عزت! میں اس کا کیونکر حقدار ٹھہرا۔۔رب العزت بس تیرا شکرانہ ہے۔ڈاکٹر احمد کے یہاں شام اچھی گذری وہ کلفٹن پر رہتے ہیں اس لئے کراچی کے ڈیفنس اور کلفٹن کے علاقوں سے گذرتے اور سابقہ میئر مصطفیٰ کمال کے بنائے فلائی اوور اور صاف اور شفاف سڑکوں نے مجھے متاثر کیا اور دل خوش ہوا۔کھانا کھا کر دیر تک باتیں ہوئیں اور پھر ایسا سویا کہ فجر کی آذان ہی سے آنکھ کھلی۔

پھر وہی ویزا کا مسئلہ

دوسرے دن جمعہ تھا پاسپورٹ آفس گیا۔انہوں نے کہا اسلام آباد کے کاغذ سے کوئی فائدہ نہیں یہاں آپ کو سارے کاغذات دوبارہ بھرنے پڑینگے۔میرے پاس ساری اسناد کی کاپیاں تھیں میں نے وہ دیں تو کہا مگر ہمیں فوٹو پر نیلا نہیں سفید بیک گراؤنڈ چاہیئے جبکہ اسلام آباد نے خاص طور سے نیلا پس منظر مانگا تھا۔نئی فوٹو کھنچوائی۔جب سب کاغذات مکمل ہو گئے تو انہوں نے کہا دو ہفتے بعد پاسپورٹ لے جائیں مگر میں تو سات دن ہی میں واپس امریکا آ رہا تھا اور منگل کو کراچی چھوڑ رہا تھا۔بڑی مشکل سے منگل کو پاسپورٹ دینے کا وعدہ کیا۔

کراچی میں وقت تو کم تھا مگر تمام دوستوں نے دعوتیں کیں اور خوب خوب ماضی کے واقعات دہرائے گئے۔یوں تو ساری دعوتیں قابل ذکر تھیں مگر میرے بچپن کے ہم جماعت کموڈور اشفاق بیگ نے کراچی بوٹ کلب میں جو برنچ کھلایا وہ خاص طور سے یاد رہیگا۔مشہور ادیب، شاعر اور پرواز وسفیر اردو کے مدیر معراج جامی قدم قدم میرے ساتھ تھے اور میر پورخاص بھی میرے ساتھ گئے تھے انکی محبتوں کا احسان تو میں اتار ہی نہیں سکونگا

حیدرآباد اور میر پور خاص روانگی

حیدرآباد سندھ میں میرے دوست بچپنی سے میرا انتظار کر رہے تھے مگر جس دن مجھے وہاں روانہ ہونا تھا اس دن وہاں کا مشہور ڈاکٹر اغوا ہو گیا۔میرے دوستوں نے پریشانی سے مجھے فون کیا کہ میں نہ آؤں۔مگر میرے سلسلے میں تقریبات طے تھیں اس لئے میں اللہ کا نام لیکر حیدرآباد چلدیا۔وہاں جیمخانہ میں رات کو ڈنر تھا۔افسوس لیاقت میڈیکل کالج نہ جاسکا کہ حالات خراب تھے دوسرے دن میر پور خاص پہنچا۔شہر کی حالت دیکھ کر سخت رنج ہوا یہ سرسبز شہر اب ریگستان ہے کہیں کوئی سبز پتہ نہ تھا ریلوے پلیٹ فارم اور اسکا شیڈ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔مگر ہمارا کالج اب بھی اچھی حالت میں تھا۔

شام کو کالج میں میری کتاب کی رونمائی تھی۔کالج کے پرنسپل خاصخیلی، پروفیسر مدد بلوچ اور مشہور شاعر اور ادب دوست نوید سروش اس کے روح رواں تھے۔اس قدر محبتیں دی گئیں کہ کہہ نہیں سکتا۔اجرکیں اور سندھی ٹوپی پہنائی گئی، پھولوں کی پتیاں نچھاور کی گئیں۔دوسرے دن سروش صاحب کے

بنگلے پر نجی تقریب میں مقامی ادیبوں وشاعروں سے جن میں احمد نصیر، بشیر عنوان، عاصی ودیگر شامل تھے ملاقات ہوئی۔

سنیچر کی شب حیدر آباد کے پریس کلب میں امین جالندھری صاحب کی قیادت میں پریس کلب میں بھی میرے اعزاز میں ایک بڑی محفل تھی جس کی صدارت سابقہ وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی عبدالحمید سندھی نے کی اور میری کتاب کے بارے میں نا قابل بیان اچھے خیالات کا اظہار کیا۔اس پروگرام میں بھی اس قدر پھول نچھاور کیے گئے کہ اس کی یاد ہمیشہ رہیگی۔اس تقریب کی رپورٹنگ ٹیلی وژن اور اخبارات میں بھی کی گئی۔اختصار کے سبب دیگر احباب کا تذکرہ کرنا ممکن نہیں مگر میرے پرانے ساتھی فخرالدین کیفی اور مرحب قاسمی کا مضمون بہت پسند کیا گیا۔ان تمام تقریبات میں جامی صاحب کا بڑا کردار تھا۔

واپسی

ساتھ خیریت کے اتوار کی دو پہر کراچی واپسی ہوئی اور اسی شام سات بجے میں کراچی ائرپورٹ روانہ ہوا رات دس بجے ہوائی جہاز کے پہیوں نے پاکستان کی سر زمین چھوڑ دی۔چند پریشانیوں کے باوجود یہ سفر اس قدر خوشگوار تھا اور مجھے اتنی محبتیں ملیں کہ میں تازہ دم ہو گیا اور جب واپس امریکا آ کر پہلے دن ہسپتال پہنچا تو میرے اسٹاف نے کہا تم کہاں سے ''آب حیات'' پی کر آئے ہو دس سال چھوٹے لگ رہے ہو۔اللہ اس ملک کو اور میرے احباب کو تا قیامت سلامت رکھے۔آمین

☆

...... دھنک کا آٹھواں رنگ ......

''ڈاکٹر فیروز عالم کا تازہ افسانوی مجموعہ''

فیروز عالم ڈاکٹر ہیں بلکہ ماہر امراض گردہ ہیں لیکن جن موضوعات پر یہ افسانے لکھتے ہیں، وہ بھی بڑے دل گردے کا کام ہے۔یہ معالج ہیں، جانتے ہیں کہ بوتل کے اندر موجود دوا کے خاص الخاص اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔آج میں بھی ان کے افسانوں کے Most Vital ingredents بتانا چاہتا ہوں۔سب سے پہلی بات تو یہ کہ قصہ خوانی اور لطف ولذت اور پورے رچاؤ کے ساتھ داستان گوئی کا ہنر انہیں فطرت سے ملا ہے۔ممکن ہے کہ انہیں اپنی والدہ مرحومہ سے ورثے میں ملا ہو۔داستان گوئی کے لیے بے حد ضروری ہے کہ داستان گو سب سے پہلے خود ہی پوری طرح کہانی سناتے ہوئے محظوظ ہو رہا ہو اور کہانی کے مطابق خود بھی یا تو شاداں وفرحاں یا مغموم وافسردہ ہو رہا ہو اور پھر اسے اپنے قاری کو بھی اسی کیفیت میں لانے کا ہنر آتا ہو اور فیروز عالم اس فن میں طاق ہیں۔ان کی افسانہ نگاری کے خاص الخاص اجزائے ترکیبی میں ایک اور نہایت اہم جزو ہے مناظر فطرت کا نہایت دل کش اور دل آویز بیان اور رومانوی کیفیت ان کے افسانوں میں ایسی ہے جیسے رات کے وقت گرتی ہوئی اوس جو گرتے وقت آپ کو محسوس نہیں ہوتی لیکن پورے طور پر اپنا کام کر گزرتی ہے۔

...... ابوالحسن نغمی

فیروز عالم کا تبحر علمی افسانوں کی بنت، بیان اور اسلوب جہاں انہیں ایک منجھا ہوا قلم کار ثابت کرتا ہے وہیں ان کے فکر وخیال طائر اونچی اڑان سے نت نئے مفاہیم بھی لاتا ہے۔فیروز عالم جہاں قارئین کو اپنے کرداروں کے ناسور سے آگاہ کرتے ہیں، وہیں ان ناسور پر مرہم بھی لگاتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ کامیاب عمل جراحی کوئی کمال نہیں اصل کمال ان ناسوروں کی نشاندہی اور ان کا شافی علاج ہے۔اسی لیے انھوں نے قارئین کو بتایا ہے کہ امید دھنک کا آٹھواں رنگ ہے۔امید کا دامن کبھی اور کسی لمحے نہیں چھوڑنا چاہیے کیوں کہ ناامیدی کفر ہے اور ہمارا ایمان بھی تو یہی کہتا ہے۔

......سید معراج جامی

دوسو آٹھ صفحات کی مجلد یہ کتاب مبلغ دوصد روپے کے عوض بزم تخلیق ادب پاکستان، پوسٹ بکس نمبر 17667، کراچی سے با آسانی دستیاب ہے۔

''چراغِ دل''

ڈاکٹرمناظر عاشق ہرگانوی

(بہار، بھارت)

نگہہ کو راز دارِ دل بنائیں کمالِ ذات کا جوہر دکھائیں
دلِ مضطر کا ہے اصرار پیہم کہ رودادِ الم تجھ کو سنائیں
پریشاں کون دنیا میں نہیں ہے کسی کا بارِ احساں کیوں اٹھائیں
ہوائے تیز سے کچھ صلح کر کے چراغِ دل بہر صورت جلائیں
مزاحم راستے کے دور ہوں گے قدم کو سوئے منزل ہم بڑھائیں
خدا والوں سے موقع گر ملے تو بتوں کے ناز بھی ہم کچھ اٹھائیں
ہے فریاد و فغاں آہ و بکا بھی وفا کے گیت کیا ایسے میں گائیں
ہیں دشمن امن کے آتنک وادی ہنر جینے کا ان کو ہم سکھائیں
مناظرؔ دھرم ہے جب دیش بھکتی گلے اس دھرم کو ہی ہم لگائیں

رب نواز مائل

(کوئٹہ)

قیامت بڑی اس سے کیا اور آئے جو ہستی سے اب گویا کچھ بھی نہ بھائے
کہ جیسے تغیر، ہی اب ہر گھڑی ہو سو کیسا سکوں کوئی جھوٹوں بھی پائے
کہاں تمنّائیں سب ایسی ہی ہوں کہ اِس اُس سے ہر حسن تا چشم آئے
یہ بےصوت سے سب تماشے وہ کیا ہیں کہ چُپ سے فغاں کا جہاں کون پائے
طلب تا طلب منزلیں سیکڑوں ہیں اگر جوششِ دل نہ سب کج دکھائے
یہ رُومانیت بھی تو اپنی عجب ہے کہ اب اس تو اب اُس پہ سب کچھ لٹائیں

ڈاکٹر انیس الرحمٰن

(سکھر)

ہم سے بچھڑ کر خوش ہو جاناں، ایسا کیسے ہوسکتا ہے ڈھونڈ لیا ہے درد کا درماں، ایسا کیسے ہوسکتا ہے
موسمِ گل ہے، دورِ طرب ہے، لیکن ایسے میں بھی تم کو یاد نہ آئے محفلِ یاراں، ایسا کیسے ہوسکتا ہے
دور کسی بستی میں جاکے، بھول گئے سب رشتے ناتے دل میں بسنے والے انساں، ایسا کیسے ہوسکتا ہے
جو دل میں تھے، دل تھا جن کا، یوں بدلیں گے کب تھا امکاں آنکھیں حیراں، عقل پریشاں، ایسا کیسے ہوسکتا ہے
اُن کے حصے میں تعبیریں، ان سے راضی ہیں تقدیریں ہم کہ اب تک خواب بداماں، ایسا کیسے ہوسکتا ہے

○

نثارترابی

(راولپنڈی)

بے موسم برساتیں اچھی لگتی ہیں — بھیگی بھیگی راتیں اچھی لگتی ہیں
پیاس کسی کی مٹ جائے تو اچھا ہے — بادل کی خیراتیں اچھی لگتی ہیں
خوشبو اپنے ساتھ چلے تو کیا کہنے — پھولوں کی سوغاتیں اچھی لگتی ہیں
ہنسنے والے چہرے آنکھ میں رہتے ہیں — دل والوں کی باتیں اچھی لگتی ہیں
پیار کا ہر اک درد سہانا ہوتا ہے — پیار میں ساری باتیں اچھی لگتی ہیں
ہم کو بس کردار کی دولت پیاری ہے — اور ہیں جن کو ذاتیں اچھی لگتی ہیں

○

ڈاکٹرانواراحمداعجاز

(گوجرانوالہ)

اب کے رستے میں اپنا پیارا نہیں — خود کو اس واسطے بھی سنوارا نہیں
کیسی کشتی ہے جس کی نہیں سمت ہی — کیسا دریا ہے جس کا کنارا نہیں
ایک پل کی بھی دوری بڑی بات ہے — ایک لحظہ جدائی گوارا نہیں
دل کی بے تابیوں نے پکارا جسے — ایک الجھن ہے یہ وہ ہمارا نہیں
زندگی ہے تو ہو گی کسی کے لیے — بِنا اب کسی کے گزارا نہیں
مشکلیں جس قدر بھی رہیں راہ میں — حوصلہ ہے کہ انوآر ہارا نہیں

○

یٰسین بھٹی

(بریڈفورڈ، برطانیہ)

جو حقیقت ہے اُسے دل سے بھلا دیتے ہیں — اِک ذرا بات کو افسانہ بنا دیتے ہیں
پھر سے کرتے ہیں رقم آپ کی الفت یارا — پھر سے دل کو بھی تو کچھ راز بتا دیتے ہیں
شام کے سائے بھی آجاتے ہیں آنگن آنگن — شام کے سائے تمنا کو جگا دیتے ہیں
وہ ہے مجرم تو اُسے پیار کا تحفہ دیں گے — وہ ہے قاتل تو اُسے دل سے دعا دیتے ہیں
تم جو کہتے ہو تو بھر لیتے ہیں صورت کوئی — تم جو کہتے ہو تو آئینہ دکھا دیتے ہیں
جن چراغوں سے ملے گا ہمیں رستہ یٰسین — اُن چراغوں کو ذرا اور ہوا دیتے ہیں

○

عرش صہبائی

(جموں، کشمیر)

دل کا لُہو نچوڑ نہ فن کی تلاش کر — اس بے شعور دور میں فکرِ معاش کر
ناحق بھٹک رہا ہے کس کے خیال میں — اس ضد کو چھوڑ اور خود اپنی تلاش کر
مجھ سے نہ پوچھ میری حقیقت کی داستاں — یہ زندگی کا راز ہے اس کو نہ فاش کر
شہرِ خرد اگر نہ تجھے راس آ سکے — شہرِ جنوں میں آ کے کبھی بود و باش کر
دل کو نہ حادثات کے رحم و کرم پہ چھوڑ — اس آئینے کو خود بھی کبھی پاش پاش کر
میں تجھ کو کیا بتاؤں مجھے خود خبر نہیں — بیٹھا ہوں کس کی یاد کے پتھر تراش کر
محلوں میں کیا ملے گا وفا کا سُراغ عرش — یہ چیز جھونپڑوں کی ہے ان میں تلاش کر

○

ایم زیڈ کنول

(لاہور)

تجارت خار وخس کی ہو رہی ہے — چمن میں آ گیا کوئی سخی ہے
درِ اثبات پر لکھا ہوا تھا — کسی کی آرزو کی یہ نفی ہے
لکھی ہے سب گلوں کے پیرہن پر — کہانی بُلبلوں نے جو کہی ہے
نئے اوزان رائج ہو گئے ہیں — کسی ٹکسال کی کوزہ گری ہے
لُہو کس نے محبت کو دیا ہے — یہ کس کے زخم کی صورت ہنسی ہے
نمک چھڑکو میرے زخموں پہ آؤ — تمہیں اُلفت نبھانے کی پڑی ہے
گلوں سے خار بھی یہ کہہ رہے ہیں — کنولؔ کی خاک میں اُترا ولی ہے

○

ایم جاویدؔ اقبال

(راولپنڈی)

حُسن والے بڑے انجانے نکل آئے ہیں — دل میں رہتے ہوئے بیگانے نکل آئے ہیں
میری یادیں جسے سیراب کیا کرتی تھیں — بعد صدیوں کے وہ ویرانے نکل آئے ہیں
کون احساس کی دنیا میں ہوا ہے داخل — کس حقیقت سے یہ افسانے نکل آئے ہیں
بزم آرائی کا تھا زعم جنہیں بستی میں — ہاں اُسی دیس سے دیوانے نکل آئے ہیں
تُم نے جاویدؔ کو دیکھا تھا کہیں پیتے ہوئے — بزم میں آتے ہی پیمانے نکل آئے ہیں

○

سیفی سرونجی

(سرونج، بھارت)

قد وَر کم ہیں پھر بھی میاں جھک کر ملنا — میری عادت ہے ہر اک شخص سے ہنس کر ملنا
ایک چہرہ ہے جو اس دل میں بسا ہے ابتک — یاد آتا ہے مجھے اس سے وہ چھپ کر ملنا
میں نے سوچا ہے کہ فٹ پاتھ پہ رکھ لوں بستر — ورنہ مشکل ہے ترے شہر میں اب گھر ملنا
مجھکو معلوم ہے یہ بات غلط ہے لیکن — فائدے مند ہے دشمن سے بھی اکثر ملنا
اجنبی شہر ہے اور تم بھی نئے آئے ہو — جس سے ملنا ہو بہت سوچ سمجھ کر ملنا
بھول سکتا نہیں وہ رات سہانی سیفیؔ — چاندنی رات میں اس کا کبھی چھت پر ملنا

○

تصور اقبال

(اٹک)

بے مکاں ہوں آج بھی اپنا مکاں رکھتے ہوئے — دھوپ میں جلتا رہا ہوں سائباں رکھتے ہوئے
لب نہیں کھولے کبھی اک داستاں رکھتے ہوئے — چپ رہے ہم ہر گھڑی غم کی دکاں رکھتے ہوئے
میں نہتا ہوں مگر پھرتا ہوں بے خوف و خطر — تو بہت ڈرپوک ہے تیر و کماں رکھتے ہوئے
اُس کے منہ میں جو بھی آیا اُس نے مجھ سے کہہ دیا — چپ رہا میں کچھ نہیں بولا زباں رکھتے ہوئے
کس طرح مل پائیں گے وہ ایک دُوجے سے بھلا — اک انا کا خول اپنے درمیاں رکھتے ہوئے
جس جگہ چلتے ہوئے چھالے پڑے تھے پیر میں — لڑکھڑا جاتا ہوں اب پاؤں وہاں رکھتے ہوئے
جانتا ہوں کھیل بچوں کا نہیں اقبالؔ یہ — ڈگمگاتے ہیں قدم کوئے بتاں رکھتے ہوئے

○

اجیت سنگھ حسرت

(لدھیانہ)

اک تماشہ ہے یہ جہاں لکھ دے — یہ عبادت یہاں وہاں لکھ دے
شام کو دوپہر نہیں کہتے! — بجھ رہی آگ کو دُھواں لکھ دے
جس کا منزل بھی راستہ دیکھے — اُس مسافر کو کارواں لکھ دے
مجھ قلندر کو آرزو ہے تری — غیر کو چاہے دو جہاں لکھ دے
کورا کاغذ ہے زندگی میری — اس پہ کچھ میرے مہرباں لکھ دے
وقت نے اور سب مِٹا ڈالا — رہ گیا دل پہ اک نشاں لکھ دے
تنکے تنکے سے گھر بنا حسرتؔ — حرف در حرف داستاں لکھ دے

○

''وارث علوی کا علم وفن''

شاہ فیصل
(بارہ مولا، کشمیر)

وارث علوی اردو میں عصر حاضر کے صف اول کے نقادوں میں شامل ہیں۔انہوں نے اپنے بے باک لب ولہجے میں اردو تنقید کو نئے امکانات سے روشناس کیا ہے۔اپنے وسیع مطالعہ اور منفرد تجزیاتی شعور کی بناء پر وارث علوی نے نہ صرف اردو شعر و ادب کے مختلف رجحانات‘ تحریکات‘ اسالیب او تخلیقی رویوں کا غیر جانبدارانہ تجزیہ پیش کیا ہے‘ بلکہ اپنے بعض مضامین کے ذریعے اردو تنقید کی سطحیت اور کم مائیگی کی طرف بھی واضح اور مدلل اشارے کیے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ہماری بیشتر تنقید مدلل مداحی اور بے جا عیب جوئی سے آگے نہیں بڑھ سکی ہے۔بہ ایں سبب وارث علوی نے اپنے معاصر ناقدین کی تنقیدات کی خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے۔ان کا لہجہ چونکہ جارحانہ اور بے رحمی کی حد تک حقیقت پسندانہ ہے۔اس لیے اردو کے اکثر و بیشتر ناقدین ان کی ناقدانہ صلاحیتوں کو تسلیم تو کرتے ہیں لیکن ان کو وہ مقام دینے کے لیے تیار نظر نہیں آتے ہیں جو ان کو ملنا چاہیے‘ تاہم نئی نسل کے قلمکار اس حقیقت کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ وارث علوی کا شمار عہد حاضر کے مقتدر نقادوں میں ہے۔اس سے پہلے کہ وارث علوی کی تنقید نگاری کا جائزہ پیش کیا جائے۔آیئے دیکھیں کہ ان کا تنقیدی بصیرتوں کو جلا دینے والے کون کون سے سوانحی کوائف بے حد اہم ہیں۔

وارث علو ی کا اصل نام وارث حسین علوی ہے۔آپ ۱۱جون 1928ء میں استوڈیا سید واڑہ احمد آباد (گجرات) میں پیدا ہوئے۔احمد آباد کے مشہور صوفی بزرگ حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ گجراتی سے ان کا خاندانی تعلق ہے۔ان کے دادا کا نام جناب امیر الدین علوی صاحب تھا اور دادی محترمہ کا نام قمر النساء تھا۔وارث علوی صاحب کے والد بزرگوار کا نام سید حسینی پیر علوی تھا۔جو اپنے وقت کے مشہور بزرگ مانے جاتے تھے۔انہوں نے شاہ وجیہ الدین علوی گجراتیؒ پر ایک کتاب ''تذکرۃ الوجیہ'' کے نام سے لکھی۔والدہ کا نام حفیظ النساء عرف دوسی بی بی علوی تھا۔ابتدائی تعلیم انہوں نے محلے ہی کے اسکول جو میونسپل کارپوریشن کی جانب سے چلتی تھی سے حاصل کی۔پانچویں کے بعد چھٹی جماعت سے انجمن اسلامیہ ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔وہاں سے میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔اس کے بعد ممبئی یونیورسٹی سے بی اے کیا۔بی اے میں بہترین کارکردگی کے عوض ممبئی یونیورسٹی کی جانب سے گولڈ میڈل ملا۔گجرات یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کیا۔اس کے بعد انہوں نے انجمن ہائی اسکول میں بحیثیت ٹیچر دو سال ملازمت کی۔بعد میں سینٹ زیویرس کالج احمد آباد میں اردو کے لیکچرار ہوگئے۔پھر بقول وارث علوی اردو کے طلباء کی تعداد کم ہوتی گئی اور مجھے اندیشہ ہوا کہ میری ملازمت سینٹ زیویرس کالج میں چل نہیں پائے گی۔اس لیے انہوں نے علی گڈھ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا اور ۱۹۵۵ء میں اسی کالج کے انگریزی ڈیپارٹمنٹ میں شامل ہوگئے اور یہیں سے انگریزی شعبہ کے صدر کے طور پر ۱۹۸۸ء میں سبکدوش ہوئے۔

وارث علوی نے ۱۹۵۲ء میں اپنی پھپیری بہن فاطمہ بیگم سے شادی کی اور یہ شادی اس عمر تک بہت خوشگوار ثابت ہوئی۔ان کی تین اولادیں ہیں اور تینوں لڑکیاں ہیں۔سب سے بڑی لڑکی شہنازہ ہے دوسری شاہدہ اور چھوٹی لڑکی کا نام فرزانہ ہے۔بڑی بیٹی کی شادی ڈاکٹر الیاس سے ہوئی‘ ان سے دو بیٹیاں سبا اور سبزہ پیدا ہوئیں۔دوسری بیٹی کی شادی محمد عثمان سے ہوئی‘ ان سے بھی دو بیٹیاں انجم اور عائشہ پیدا ہوئیں۔چھوٹی بیٹی کی شادی امتیاز صاحب سے ہوئی‘ امتیاز صاحب تقریباً ایک درجن کتابوں کے مصنف ہیں‘ ان کے دو بیٹے اویس اور ابرار ہوئے۔اس طرح وارث علوی صاحب کی چار نواسیاں اور دو نواسے ہیں۔اس وقت وارث علوی کے ساتھ اُن کی چھوٹی بیٹی فرزانہ‘ داماد‘ دو نواسے اور اہلیہ اپنے آبائی مکان سید واڑہ آستوڈیا احمد آباد میں فرصت کے دن گذار رہے ہیں۔

۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک وارث علوی انجمن ترقی پسند مصنفین احمد آباد کے سیکریٹری رہے پھر ساہتیہ اکادمی گجرات کے وجود میں آنے کے بعد اس کے صدر کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔اس کے علاوہ گجرات اردو ساہتیہ اکادمی کے رسالے ''سابر نامہ'' کی ادارت کے فرائض بھی سنبھالتے رہے۔اب تک وارث علوی کو ان کی ادبی خدمات کے عوض مندرجہ ذیل انعامات سے نوازا گیا ہے۔

۱۔ گوروپُرسکار ،اردو ساہتیہ اکادمی گجرات
۲۔ نیشنل ایوارڈ ،مہاراشٹر اردو اکادمی
۳۔ غالب ایوارڈ ،غالب اکادمی دہلی ۲۰۰۴ء
۴۔ عالمی فروغ اردو اکادمی، دوہا قطر ۲۰۰۷ء
۵۔ بنگال ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ۲۰۱۱ء

اپنے معاصرین کے برعکس وارث علوی کے انعامات کی فہرست مختصر ہے۔اس کی وجہ بقول فضیل جعفری کے ''انہوں نے انعام واکرام کی خاطر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا''[1]

وارث علوی اگرچہ تنقید میں سخت نظر آتے ہیں لیکن میل جول میں نرم، خندہ جبیں اور ہنس مکھ انسان ہیں۔ وہ مسکرانا اور مسکراہٹ پسند کرتے ہیں۔ ان کے شاگردوں کا کہنا ہے کہ ان کی بات چیت کا انداز، سمجھانے کا طریقہ اتنا دلنشین ہوتا تھا کہ غیر دلچسپ اور خشک سبق بھی دلچسپ بن جاتا تھا۔

وارث علوی کی شخصیت اور علمی و ادبی ذوق کی وضاحت کرتے ہوئے ان کی نوجوانی کے دوست اور معتبر دانشور پروفیسر محی الدین بمبئی والا صاحب نے ''بت خانہ چین'' کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''وارث علوی مشائخین کے گھرانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے والد کے ساتھ مریدوں میں بھی جاتے رہے۔ نماز کے پابند تھے۔ ایک شوق انہیں یہ تھا کہ شہر کی مختلف مسجدوں میں نماز ادا کرتے۔ اس وقت یعنی ۱۶، ۱۷ برس کی عمر میں سکول کے زمانہ میں وہ سوٹ ٹائی اور فیلٹ ہیٹ پہنتے تھے۔ مسجد میں جا کر موزے، جوتے، فیلٹ ہیٹ، کوٹ کہ اندر شلوار پہنی ہوتی پھر وضو بنا کر جماعت میں شامل ہوجاتے۔ نماز کے بعد پھر پتلون، کوٹ، ٹائی، موزے، جوتے اور ہیٹ پہن لیتے۔ خوبصورت تھے اس لیے لوگ انہیں دلچسپی سے دیکھتے کہ اتنا ماڈرن لڑکا بھی نماز سے اتنا شغفت رکھتا ہے۔ پھر کالج کے زمانے میں نئے طور طریقے ان کے اسلوبِ حیات کا حصہ بنتے گئے او ر پرانی عادتیں ترک ہوتی گئیں۔ وارث علوی صاحب رنگین مزاج کے آدمی ہیں، میں نے اتنا مست مولا آدمی نہیں دیکھا۔ ادب نواز دوست انہیں گھیر کر کافی ہاؤس لے جاتے اور وہاں خوب چہکتے۔ فلموں کا بہت شوق اور نہ جانے کیسے انگریزی ہندوستانی فلموں کا اہتمام ہوجاتا۔ مشہور اطالوی فلم 'بائی سِکل تھیف (Bicycle Thief) دیکھ کر ہوٹل میں دوستوں کے ساتھ باتیں کررہے تھے۔ فلم کا انتہائی دردناک انجام بیان کرتے کرتے آنکھوں میں آنسو آگئے اور سب دوست بھی اداس ہوگئے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف کتابوں اور اپنے بچوں میں جئے۔ اپنی لڑکیوں کو ہی نہیں بلکہ اپنے نواسے نواسیوں تک کو انہوں نے اپنی گود میں بڑا کیا۔ کانکریہ تالاب اور وہاں کے چڑیا گھر کے ہی عاشق تھے۔ بچوں کو لے جاتے اور جانوروں اور پرندوں کے سامنے خود بھی بچہ بن جاتے۔ باقاعدہ ورزش اور کانکریہ تالاب کے دو چکر لگانا ان کا روز کا معمول تھا۔ وہ تنقید میں سخت لیکن ادیبوں اور شاعروں سے میل جول میں بہت نرم اور خندہ جبیں تھے۔ علوی صاحب احباب نواز، کنبہ پرور اور مجلس ساز شخصیت کے مالک ہیں۔ کسی کے بھی دکھ درد کو دیکھ کر تلملا اٹھتے''۔[۲]

وارث علوی تقریباً دو درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن کی فہرست مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) تیسرے درجے کا مسافر ۱۹۸۱ء (۲) اے پیارے لوگو ۱۹۸۱ء (۳) حالی مقدمہ اور ہم ۱۹۸۳ء (۴) خندہ ہائے بیجا ۱۹۸۷ء (۵) کچھ بچالایا ہوں ۱۹۰۰ء (۶) راجندر سنگھ بیدی (مونو گراف) ۱۹۸۹ء (۷) پیشہ تو سپہ گری کا بھلا ۱۹۹۰ء (۸) جدید افسانہ اور اس کے مسائل ۱۹۹۰ء (۹) فکشن کی تنقید کا المیہ ۱۹۹۲ء (۱۰) سعادت حسن منٹو (مونو گراف) ۱۹۹۵ء (۱۱) اوراق پارینہ ۱۹۹۸ء (۱۲) ادب کا غیر اہم آدمی ۲۰۰۱ء (۱۳) بورژواژی بورژواژی ۹۹۹ء (۱۴) لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر ۲۰۰۱ء (۱۵) ناخن کا قرض ۲۰۰۳ء (۱۶) سعادت حسن منٹو ایک مطالعہ ۱۹۹۷ء (۱۷) منتخب مضامین ۲۰۰۰ء (۱۸) سرزنشِ خار ۲۰۰۵ء (۱۹) راجندر سنگھ بیدی ایک مطالعہ ۲۰۰۶ء (۲۰) گنجینۂ بازخیال ۲۰۰۷ء (۲۱) کلیات راجندر سنگھ بیدی جلد اول، دوم ۲۰۰۵ء (۲۲) بتخانہ چین ۲۰۱۰ء

اس کے علاوہ وارث علوی کے کئی مضامین رسالوں اور جرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔ کچھ نامکمل ہیں اور کچھ غائب ہوگئے ہیں۔

وارث علوی کی تصانیف کے غائر مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے مختلف النوع موضوعات پر مضامین ضبطِ تحریر میں لائے ہیں۔ ان کے یہاں فکر انگیز تنقیدی مباحث ملتے ہیں۔ بعض بہت ہی اہم، سنجیدہ اور مشکل تنقیدی موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے اور ان کے ساتھ کافی حد تک انصاف بھی کیا ہے۔ بڑے بڑے افسانہ نگاروں اور شاعروں پر بھی قلم زنی کی ہے۔ یہ مضامین بعض ایسی نوادرات سے بھرے ہوئے ہیں جو اپنے موضوع پر سنجیدہ گرفت ہی سے حاصل ہوسکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے رنگ طبیعت سے تنقید کو اتنا دلچسپ بنایا کہ ایک عام آدمی بھی لطف لے سکتا ہے۔ وہ باتیں جو دوسرے نقادوں کے یہاں اشکال کا شکار ہوگئیں، وارث علوی نے ان کو اتنے آسان اور دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے کہ مشکل سے مشکل مضمون بھی دو+دو=چار کی طرح سہل ہوگیا۔

وارث علوی کا اصلی میدان افسانوی تنقید ہے لیکن انہوں نے نظریاتی مضامین بھی بہت لکھے ہیں۔ یہ مضامین ان کے وسیع مطالعے کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً ادب اور کمٹ منٹ، ادب اور سماج، ادب اور سیاست، فسادات اور ادب، ادب اور پروپیگنڈا، ادب اور عوام، ادب اور آئیڈیولوجی وغیرہ۔ یہ مضامین بقول وارث علوی اس دور میں لکھے گئے جب نظریات کی باتیں بہت ہوتی تھیں لیکن سوائے صحافتی مضمون میں چھچھلے اشاروں اور خود درائی کے طور پر کچھ نہ ملتا تھا۔ مندرجہ بالا موضوعات پر عالمانہ اور جامع بحث وارث علوی کے بغیر کسی بھی نقاد کے یہاں نہیں ملتی۔ اس لیے اس زمانے میں کشور ناہید جب ہندوستان آئیں تو اپنی ایک ریڈیائی ملاقات میں انہوں نے کہا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں نظریاتی مضامین سوائے وارث علوی کے کسی نقاد کے یہاں نظر نہیں آتے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ مذکورہ بالا مضامین پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ وارث علوی کا مطالعہ کتنا گہرا اور وسیع ہے۔ ان نظریاتی مضامین میں انہوں نے اپنے موقف کی بڑے عالمانہ، ادیبانہ اور دانشورانہ انداز میں وضاحت کی ہے۔ ان موضوعات کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ وارث نے مختلف النوع موضوعات پر کتنی ساری کتابوں کا گہرائی

سے مطالعہ کیا ہے۔ پروفیسر محی الدین بمبئی والا اس سلسلے میں کہتے ہیں:

''وارث علوی نے ان موضوعات پر اس قدر جامع اور مبسوط طریقہ سے لکھا ہے کہ اکثر مضامین ان موضوعات پر حرف آخر بن گئے ہیں''۔۳؎

وارث علوی نے اردو شعراء پر کثرت سے مضامین لکھے ہیں۔ ان شعراء میں غالبؔ، سوداؔ، مرزا شوقؔ، اقبالؔ، ن۔م۔راشدؔ، اختر الایمان، جان نثار اخترؔ، مجازؔ، محمد علوی، جاوید اخترؔ، نداؔ فاضلی وغیرہ شامل ہیں۔ جوشؔ پر وارث علوی نے اس وقت مضمون لکھا۔ جب جوشؔ جیسے قادر الکلام شاعر کے متعلق اردو کے اس وقت کے نامور اہل قلم جوشؔ پر لفاظی ہونے کی پھبتی کستے تھے۔ وارث علوی کو طبعاً تنقید کا رویہ پسند نہ تھا کہ ہمارے بڑے بڑے فنکاروں کو پھبتیوں میں اڑایا جائے۔ چنانچہ ان نقادوں کے جواب میں انہوں نے جوشؔ پر مضمون لکھ کر ثابت کیا کہ کسی بھی شاعر کو اس کی اچھی شاعری کی بنیاد پر جانچنا چاہیے۔ اس سلسلے میں وارث علوی کہتے ہیں:

''جوشؔ کی شخصیت اور شاعری دونوں کے متعلق ہمیں یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ دونوں میں جوشؔ نے بڑی اندرونی کشمکش کے بعد ایک ایسا توازن پیدا کیا تھا جو بہت کم شاعروں کو حاصل ہوا ہے۔ دراصل جس چیز کو جوشؔ کی لفاظی سمجھا جاتا ہے وہ اسی کشمکش کے بے شمار پہلوؤں کو نازک ترین اور لطیف ترین تضادات کو ایک توازن میں بدلنے کی کوشش ہے''۔۴؎

ن۔م۔راشد کی شاعری پر وارث علوی نے ایک نہایت پُر مغز اور فکر انگیز مضمون اس وقت لکھا جب راشد پر بہت کم لکھا جاتا تھا۔ اس معنی میں یہ مضمون وارث علوی کے فکری تخیل کا ہی کارنامہ ہے۔ اس مضمون میں وارث علوی نے راشدؔ کے اساسی اور اہم نظریات پر ایسی ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور بالخصوص مذہب اور خدا کے حوالے سے راشدؔ کی نظموں پر ایسا تجزیہ کیا ہے، جو آج بھی اپنی انفرادیت قائم کیے ہوئے ہے۔

مشہور شاعر نداؔ فاضلی کی شاعری کے بارے میں وارث علوی نے اپنے مضمون میں اپنے تاثرات یا پسندیدگی کا اظہار بڑی حد تک جانبدارانہ انداز میں کیا ہے اور نداؔ فاضلی کی شاعری کی اہمیت اور انفرادیت کو منوانے کے لیے فراقؔ گورکھپوری اور علامہ اقبال کی نظموں سے موازنہ کیا ہے۔ نداؔ فاضلی کی ایک غزل نما نظم ''ماں'' کا تنقیدی جائزہ، اقبال کی نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' اور فراق گورکھپوری کی نظم ''جگنو'' کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ اور یوں فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ:

''میرے نزدیک اردو میں ماں کے موضوع پر صرف دو نظمیں یادگار رہیں گی ایک فراق کی نظم ''جگنو'' اور دوسری نداؔ کی نظم ''ماں''۔۵؎

وارث علوی نے نداؔ فاضلی کی شاعری کا بنیادی وصف ان کے اسلوب کی رنگا رنگی کو قرار دیا ہے اور لکھا ہے:

''نداؔ فاضلی کے یہاں اسالیب کی رنگا رنگی ہے۔ ایک اسلوب تو ''ماں'' کا ہے جسے ہم کسی مانوس یا مروج یا بہتر اصطلاح یا صنف شعری کی عدم موجودگی میں تشبیہ تشخص کہہ سکتے ہیں''۔۶؎

علاوہ ازیں وارث علوی نے جن دوسرے شعراء پر بھی مضامین لکھے، وہ بھی انتہائی دلچسپ ہیں اور ان کی ہر ایسی تحریر کسی نہ کسی بحث کا باعث بن جاتی ہے۔ شعر و ادب کے جدید موضوعات کے ساتھ ساتھ وارث علوی نے کلاسیکی شاعری اور شاعروں کے بارے میں بھی اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے کلاسیکی فنکاروں کو ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ یاد کیا ہے۔ اس ضمن میں مرزا شوق لکھنوی اور مرزا سوداؔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اپنے مضمون ''سوداؔ کا طنزیہ کلام'' میں انہوں نے سوداؔ کی ہجویہ شاعری کا مدلل تجزیہ پیش کیا ہے اور ان کی باغ و بہار طبیعت کے حوالے سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سوداؔ کی طنزیہ شاعری ایک خاص جاذبیت اور کشش رکھتی ہے اور دعوت مطالعہ دیتی ہے۔ سوداؔ کی انفرادیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سوداؔ کی قادر الکلامی کا اعتراف ان کے معاصرین سے لے کر آج تک ہر نقاد نے کیا ہے..... میر حسن نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ''تا حال مثل اُو در ہندوستانِ جنت نشان کسے بر نہ خواستہ'' انہوں نے اردو شاعری کی ابتدائی منزلوں میں ہی اسے اظہار و بیان کے سانچے عطا کئے، جو فارسی شاعری کی سینکڑوں سال کے ارتقاء کے بعد حاصل ہوئے تھے۔ غزل میں گو ان کا رنگ میرؔ اور دردؔ کے سامنے جم نہ سکا اور ان کی غزل میں وہ حلاوت گداز اور شیرینی پیدا نہ ہو سکی جس نے میرؔ کی غزلوں کو ایک امتیازی شان بخشی ہے۔ پھر بھی ان کی غزلیں ایک خاص معیار اور بلندی کی حامل ہیں..... قصیدہ اور ہجو کا میدان ان کا خاص میدان ہے جس میں آج تک کوئی شاعر ان کے مقابل نہیں رہا..... سوداؔ کی ہجوؤں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ آج بھی ہمارے ادبی ذوق کی بھرپور طریقہ پر تسکین کر سکتی ہیں اور امتدادِ زمانہ کے باوجود ان کی اہم ہجوؤں کا کوئی پہلو کوئی رُخ، کوئی گوشہ فرسودہ اور پارینہ نہیں ہوا، آج بھی اتنا ہی زندہ حقیقی اور درخشندہ ہے جتنا کہ سوداؔ کے زمانے میں تھا''۔۷؎

اسی طرح وارث علوی نے عطا اللہ پالوی کی کتاب ''تذکرۂ شوق'' پر بڑے عالمانہ اور ادیبانہ انداز میں تبصرہ کیا۔ انہوں نے اس مضمون میں جہاں مرزا شوق کا گہرا مطالعہ کیا وہی مصنف کے اختلافات میں علمی گہرائی پیدا کی۔ جدیدیت کے سیلاب میں وہ دوسروں کے مانند اس طرح نہیں ڈوبے کہ کلاسیکی فنکاروں کی اہمیت کو کم کرتے جب حالیؔ پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے تھے، تب وارث علوی نے ''حالی، مقدمہ اور ہم'' جیسی کتاب لکھی جو آج بھی حالیؔ پر بے مثال تنقید کا نمونہ ہے۔ اس کتاب کی عظمت کا اعتراف پروفیسر شافع قدوائی اس طرح کرتے ہیں:

''حالیؔ، مقدمہ اور ہم، مقدمات کی تدوین اور نتائج کے استخراج

کے اعتبار سے اردو کی کسی کتاب پر خیال انگیز اور احساس تنقید کی بہترین مثال ہے جس کی تحسین نہ کرنا ناسپاسی کے مترادف ہے''۔۸

وارث علوی نے اردو کے بڑے نقادوں پر بڑی سخت لیکن طنز و مزاح سے لبریز تنقید کی ہے' جو ان کی کتاب ''خندہ ہائے بے جا'' میں شامل ہے۔اس کتاب کا نام وادیٔ کشمیر کے نامور شاعر مرحوم حکیم منظور کا تجویز کیا ہوا ہے۔اس میں وزیر آغا' آل احمد سرور' شمیم حنفی' ڈاکٹر محمد حسن اور سردار علی جعفری جیسے اس وقت کے نقادوں پر اس قدر سخت لیکن طنزیہ اور مزاحیہ جملوں سے بھری تنقید لکھنا بہت جرأت کا کام تھا۔وارث علوی کا یہ شعار رہا ہے کہ وہ ادب میں جب اور جہاں بھی غلط اور نا گوار تنقید کو دیکھتے ہیں تو بھڑک اٹھتے ہیں پھر قلم سے اسی انداز کا بھڑکیلا مضمون صفحۂ قرطاس پر لائے ہیں۔ان مضامین کی حیثیت ادب میں بم دھماکوں جیسی رہی ہے ۔ان کا کہنا ہے کہ تنقید کے آنگن میں وہ جرأت کے ساتھ کود ے۔

کودا تیرے آنگن میں کوئی ہم سا نہ ہوگا
جو کام ہوا ہم سے اور اس تن سے نہ ہوگا

انہوں نے کسی بھی نقاد کا خاکہ اُڑانے کی کوشش نہیں کی' شخصیت پر حملہ نہیں کئے بلکہ اس کے نظریات' خیالات اور افکار وآراء سے اختلاف کرتے ہوئے طنز ومزاح کی ایسی پھلجھڑیاں چھوڑیں کہ تنقید جیسا خشک مضمون بھی دیوالی کی رات کی طرح جگمگا اٹھا۔

وارث علوی نے شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب ''شعر غیر شعر اور نثر'' پر بڑی محنت سے ایک ناقدانہ مضمون لکھا۔اس مضمون کی تیاری میں انہیں تین مہینے لگے۔یہ مضمون انہوں نے سورت (گجرات) میں اپنے داماد کے گھر کے باغ میں بیٹھ کر ضبط تحریر لایا تھا۔دہلی میں ایک سیمینار میں فاروقی صاحب بہت خوشدلی سے وارث علوی سے ملے اور کہا کہ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ کسی نے میری کتاب کو اتنے توجہ سے پڑھا ہے۔اس پر وارث علوی نے کہا کہ حضرت آپ کی تعریف بھی بہت کی ہے۔جس پر فاروقی صاحب نے کہا کہ تعریف کیا کی بھس بھر دیا ہے ۔وارث علوی کا کہنا ہے کہ انہیں بہت تعجب ہوا اور گھر جا کر انہوں نے جب یہ مضمون پڑھا تو واقعی انہیں لگا کہ جب جب تعریف کرنے کی کوشش کی تب تب اختلافات کے پہلو نکلتے آئے اور انہیں مضمون لکھتے وقت احساس بھی نہ ہوا کہ وہ تعریف سے زیادہ تنقید کر رہے ہیں ۔بہر حال یہ مضمون وارث علوی کے اہم تنقیدی مضامین میں شامل ہے جو انہوں نے بڑی محنت او ر ریاضت سے لکھا ہے۔بڑی گاڑھی تنقید ہونے کے باوصف یہ بہت دلچسپ اور نہایت فکر انگیز مضمون ہے۔حالیؔ کے بارے میں وارث علوی کا کہنا ہے کہ:

''مجھے حالیؔ کا نظریہ شعر' جو بنیادی طور پر اخلاقی ہے' بہت زیادہ پسند نہیں' اس کے باوجود میں حالیؔ کو اردو کا سب سے بڑا نقاد سمجھتا ہوں۔کسی نقاد کے نظریے کو قبول نہ کرنے کے باوجود اسے بڑا نقاد سمجھنے کا مطلب ہے اس کی فکر ونظر کی اس طاقت کو شناخت کرنا جو اسے اس کی نظریاتی حدود سے بلند کرتی ہے''
۹

اس اقتباس سے وارث علوی کے تنقیدی مزاج کو آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ان کی تنقید نگاری کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ کسی بھی فن پارہ یا کسی بھی فنکار کے بارے میں کوئی بھی رائے اس کے گہرے مطالعے کے بعد ہی دیتے ہیں۔چنانچہ اردو کے پہلے باضابطہ نقاد حالیؔ کے بارے میں اکثر و بیشتر ناقدین نے مختلف اور متضاد خیالات ظاہر کئے ہیں۔حالیؔ کے مقدمہ کو اردو تنقید کا نقش اول تو سب نے مانا ہے لیکن حالیؔ کو ایک معتبر نقاد کم ہی لوگوں نے تسلیم کیا ہے۔کلیم الدین احمد نے جہاں حالیؔ کا ''مطالعہ محدود اور نظر تنگ'' ہونے کا طعنہ دیتے ہوئے مذاق اڑایا' وہیں شمس الرحمٰن فاروقی نے حالی کو احساس کمتری کا شکار بتایا ہے' لیکن وارث علوی غالباً عصر حاضر کے پہلے معتبر نقاد ہیں جنہوں نے حالیؔ کو اردو کا سب سے بڑا نقاد قرار دیا ہے۔

یہ بات سب تسلیم کرتے ہیں کہ اردو تنقید کی داغ بیل ڈالنے میں حالیؔ اور شبلیؔ کا نمایاں کردار ہیں۔لیکن وارث علوی' محمد حسین آزاد کو بھی ان کی صف میں شامل کرتے ہیں۔عبادت بریلوی کی کتاب ''اردو تنقید کا ارتقاء'' پر تبصرہ کرتے ہوئے آزادؔ حالیؔ اور شبلیؔ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آزادؔ حالیؔ اور شبلیؔ وہ عناصر ثلاثہ ہیں جنہوں نے اردو تنقید کی بنیادوں کو استوار کیا حالیؔ کا مقدمہ اردو کی پہلی باقاعدہ تنقید ہے۔''شعر العجم'' تنقیدی تحسین کا پہلا غیر فانی نمونہ ہے۔آب حیات اردو ادب کی پہلی تنقیدی تاریخ ہے.....حالیؔ پہلے نقاد ہیں جنہوں نے تنقید کو ایک جداگانہ صنف ادب کے طور پر پیش کیا۔حالیؔ اور شبلیؔ کی ادبی حیثیت اتنی زبردست اور شاندار ہے کہ وہ باقاعدہ ٹھوس کتابوں کے مستحق ہیں۔اکا دُکا مضامین ان سے پورا انصاف نہیں کر سکتے''۔۱۰

اپنی کتاب ''اوراق پارینہ'' میں عبادت بریلوی کی تنقیدی خدمات کو کافی سراہا ہے۔اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''عبادت بریلوی کی تنقیدی نگارشات اردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہیں۔گو انہوں نے اردو کے قدیم ادب پر بھی ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔لیکن جدید ادب کے تنقیدی تقاضے اور مطالبات نے ہی ان کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا ہے۔ادب کی جدید تحریکوں اور نظریوں کا کوئی پہلو اور ادب کی کوئی صنف' شاعری' افسانہ' ناول اور تنقید ایسی نہیں جس پر انہوں نے اپنے زاویہ سے نگاہ نہ ڈالی ہو اور اپنے شعور کی گرفت میں نہ لائے ہوں۔ان کی تنقید کا میدان بھی نظریاتی زیادہ عملی کم رہا ہے لیکن جہاں جہاں ان کی تنقیدوں میں عملی تنقید کے نمونے ملتے ہیں۔وہ بھی اہم بصیرت افروز ہیں''۔۱۱

وارث علوی نے عبادت بریلوی کے علاوہ بھی بیشتر نقادوں اور ان کی تنقید نگاری کی خوبیوں اور خامیوں پر جا بجا بے حد خوبصورت اشارے کئے

ہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وارث علوی فکشن تنقید کے شہسوار ہیں۔انہوں نے بڑی گہرائی اور سنجیدگی سے اردو فکشن کا مطالعہ کیا ہے اور اس پر بھرپور تجزیاتی مضامین قلمبند کئے ہیں۔اس لحاظ سے وارث علوی کو اگر اس میدان کا باوا آدم قرار دیا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ان سے پہلے نہ کسی نے اس میدان میں اس شان سے لکھا اور نہ ان کے ہم عصروں میں سے کسی نے اس انداز کے نظریاتی اور تجزیاتی مضامین لکھنے کی بنیاد رکھی ہے۔

اردو میں افسانے لکھے تو جاتے تھے لیکن ان پر تنقید برابر نہیں تھی جتنے بڑے افسانہ نگار پیدا ہوئے۔اس قد وقامت کے نقاد ان کو نہیں ملے۔دور جدید میں بھی بہت بڑے افسانہ نگار پیدا ہوئے مثلاً کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت چغتائی وغیرہ اور حسنِ اتفاق سے انہیں نقاد بھی اچھے ملے۔ان نقادوں میں وارث علوی کا نام بطور فکشن نقاد کے بہت مشہور ہے اور بے شک انہوں نے اس تنقید کا حق بھی ادا کیا۔بیدی اور منٹو کے افسانوں پر تنقید کی ضخیم جلدیں لکھیں۔بیدی کے لگ بھگ سبھی افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا۔اسی طرح منٹو کے افسانوں کا بھی بہت تفصیل سے جائزہ لیا اور ان پر جو الزامات لگائے جاتے تھے کہ وہ جنس نگار ہیں تو اس کا انہوں نے بہت اچھا جواب دیا۔اس طرح دور جدید میں وارث علوی نے فکشن کی تنقید کو معتبر بنایا۔

وارث علوی نے بعض افسانوی کرداروں کا اور افسانے کی زبان اور اس کی خوبیوں کا اتنا اچھا جائزہ لیا کہ کہا جانے لگا کہ ان کی یہ تنقید اتنی ہی دلچسپ ہے جتنے کہ افسانے۔مثلاً بیدی کا افسانہ جوگیا، بل، حجام الہ آباد کے، لمبی لڑکی، گالی، کشمکش، آلو، اغوا، گرہن، گرم کوٹ، نا گفتہ وغیرہ اور منٹو کے افسانے ہتک، ٹوبہ ٹیک سنگھ، سرمہ، بابو گوپی ناتھ، سوگندھی وغیرہ ان افسانوں کے جو دلچسپ تجزیے انہوں نے پیش کیے ہیں وہ کئی حیثیتوں سے اردو کے تنقیدی سرمائے میں گراں قدر اضافے ثابت ہوئے۔

وارث علوی نے فکشن کی تنقید میں افسانے اور ناول کی ساخت اور اس کی تکنیک کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔اس لیے فکشن پر ان کی نظریاتی تنقید اردو میں ایک نیا تجربہ ہے۔پلاٹ، کردار، واقعہ نگاری، افسانے کی زبان اور بیان اور مختلف تکنیکوں کا افسانہ میں استعمال، ان پر بصیرت افروز طریقے سے لکھا۔ان کا انگریزی، روسی اور فرانسیسی ادب کا مطالعہ جو انگریزی کے ذریعے عمل میں آیا، بہت وسیع تھا۔اس لیے وہ جو مثالیں دیتے تھے، وہ بہت فکر انگیز ہوتی تھیں۔ فضیل جعفری، وارث علوی کی افسانوی تنقید پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وارث علوی موجودہ دور میں اردو فکشن کے سب سے اہم نقاد ہیں، وہ واقعی بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ان کی ایمانداری اور ان کے خلوص نیت پر ہزار اختلافات کے باوجود شک کرنا ممکن نہیں ہے۔"[۱۲]

وارث علوی نے دوسرا کام یہ کیا کہ انہوں نے افسانوں کے تجزیوں کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاروں کے فن پر بھی تنقیدی مضامین لکھے۔مثلاً کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، عزیز احمد، عصمت چغتائی، رام لعل، انتظار حسین، غیاث الدین گدی اور دوسرے بہت سے افسانہ نگاروں پر جامع مضامین لکھے۔دوسرے نقادوں کی طرف وارث علوی کو یہ پریشانی نہیں تھی کہ اردو ادب میں جو نئے لکھنے والے آتے ہیں، ان میں بڑا کون ہے؟ کسی کی پرواہ کئے بغیر وہ افسانہ نگاروں کا انتخاب خود کرتے تھے اور ان پر مضامین لکھتے تھے مثلاً انہوں نے دو خواتین افسانہ نگار لالی چودھری اور ترنم ریاض پر مضامین لکھے۔وارث علوی پر طنز بھی کیا گیا اور کہ وہ خوبصورت چہروں کو دیکھ کر مضامین لکھتے ہیں۔لیکن لالی چودھری تو امریکہ میں تھی اور وارث علوی کو ان سے کوئی شناسائی نہیں تھی۔جب ان کے افسانوں کی کتاب "حد چاہیے سزا میں" انہیں دستیاب ہوئی تو انہیں محسوس ہوا کہ یہ امریکہ میں بسے ہوئے ہندوستانی اور پاکستانی لوگوں کے مسائل پر بہت اچھے ڈھنگ سے لکھے ہوئے افسانے ہیں۔

اسی طرح انہوں نے ترنم ریاض کے افسانوں کا جائزہ لیا۔جن پر لکھنے سے لوگ گھبراتے تھے کیونکہ یہاں وہی مسئلہ پیدا ہوتا تھا کہ ترنم ریاض جیسی خوبصورت افسانہ نگار پر لکھنے سے کہیں شکوک وشبہات تو پیدا نہیں ہوں گے۔وارث علوی نے ان کے افسانوں پر اہم اور چونکانے والا مضمون لکھا۔اس وقت تک ترنم ریاض کے ساتھ ان کی کوئی ذاتی پہچان نہیں تھی۔لیکن انہیں اس خاتون کے افسانوں میں بہت سی اچھائیاں نظر آئیں اور ان میں تخلیقی تخیل کی کار فرمائی بھی دکھائی دی۔اس لیے انہوں نے بے دھڑک ہو کر ان پر لکھا:

"ان کے یہاں کاوش اور کاہش کی جگہ برجستگی اور بے ساختگی ہے۔تہ در تہ معنویت، پیچیدہ ڈیزائن اور معنی خیز اشاروں اور کنایوں کی ایک دوسرے کو کاٹتی لکیروں کے باوصف افسانہ اپنے حسن سادہ کو برقرار رکھتا ہے"۔[۱۳]

اس مضمون کے آخر میں وارث علوی نے ترنم ریاض کے فن کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی حوصلہ افزائی بھی کی۔یوں لکھتے ہیں:

"اپنے بہترین افسانوں میں ترنم ریاض نے آرٹ کی بلندیوں کو چھو لیا ہے۔بس ان کے لیے یہی دعا ہے کہ ان کی ہر کامیابی ایک نیا چیلنج ثابت ہو اور خوب سے خوب تر کی ترقی کا سلسلہ اسی طرح جاری رہے"۔[۱۴]

وارث علوی کے اس غیر جانبدارانہ رویے کا اثر یہ ہوا کہ لوگ جان گئے کہ وارث علوی جہاں صلاحیت پاتے ہیں وہیں علوی خود بخود اس پر قلم اٹھاتے ہیں اور جہاں نظر نہیں آتی ہے، وہاں بے شمار سفارشوں کے باوجود وہ کچھ بھی نہیں لکھتے۔

اردو ادب میں آج کل جس طرح گروہ بندی کا ماحول گرم ہے اور اس کے تحت اپنے گروہ میں آنے والے ہر لکھنے والے کے متعلق ایسی رائے دینا بہت عام ہو گیا ہے۔جس کا وہ مستحق نہ ہو۔اس ماحول میں وارث علوی کی غیر جانبدار شخصیت کی قدر کی گئی۔لوگوں نے جان لیا کہ گروہ بندی سے دور، اردو کے

مراکز سے دور شہر احمد آباد میں اکیلا اور تنہا یہ نقاد نہ خریدا جا سکتا ہے نہ کسی کتاب پر اس کے مزاج کے خلاف کچھ لکھوایا جا سکتا ہے۔

وارث علوی کی تنقید کی امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کبھی بھی غلط بیانیوں کو برداشت نہیں کرتے۔ جب شمس الرحمٰن فاروقی نے افسانے کو تیسرے درجے کی صنف ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اردو کے تمام نقاد اور افسانہ نگار خاموش رہے۔ البتہ وارث علوی جن کا اوڑھنا بچھونا فکشن تھا' خاموش نہ رہ سکے اور ایک سخت طویل مضمون ضبط قلم کیا' جو بعد میں کتابی صورت میں ''فکشن کی تنقید کا المیہ'' کے نام سے شائع ہوا۔ وارث علوی کی ستم ظریفی دیکھئے کہ انہوں نے یہ کتاب خود شمس الرحمٰن فاروقی کے نام منسوب کی اور انتساب کے نیچے غالب کا یہ شعر لکھا۔

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات

وارث علوی نے فکشن اور اردو افسانوں پر بے جا حملوں کو کبھی برداشت نہیں کیا۔ منٹو کے تمام متنازعہ افسانوں کا بچاؤ کیا اور دوسرے افسانوں پر بے جا تنقید کا انہوں نے سخت جواب دیا۔ مثلاً راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ'' گرہن'' پر فاروقی صاحب نے بے جا تنقید کے ذریعے اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی اور اس تکلیف دہ حرکت سے اردو کے ان تمام لکھنے والوں کو بہت آزار پہنچا جو بیدی کے پرستار ہیں اور'' گرہن'' کو اردو کا شاہکار افسانہ سمجھتے تھے ۔ وارث علوی کہاں خاموش بیٹھنے والے تھے۔ انہوں نے فاروقی صاحب کے مضمون کے جواب میں ایک پورا مضمون لکھ دیا۔ جس میں فاروقی صاحب کے ایک ایک اعتراض کو غلط ثابت کیا۔ بے لاگ اور سخت تنقیدی لہجے کی وجہ سے وارث علوی کی تنقید میں بعض نزاعی معاملات بھی آتے ہیں۔ رسالہ ''سوغات'' کے ایڈیٹر مرحوم محمد ایاز نے انہیں لکھا بھی تھا کہ آپ اپنی تنقید کا نزاعی لب ولہجہ ترک کیجئے اور جو کچھ کہنا چاہتے ہو براہ راست کہیے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ نزاعی لب ولہجہ ان کے مزاج کا ایک جزو بن گیا ہے۔ اسی لیے ابتدائی زمانے کی تنقیدوں کے پیش نظر ان کا ایک کارٹون (Cartoon) بھی شاہد علی خان نے اپنے پرچے'' ہماری زبان'' میں شائع کیا تھا۔ جس میں وارث علوی کی تنقید میں آمد کو ایک ایسے ڈکٹیٹر (Dictator) کے طور پر بتایا تھا جس کے بدن پر خنجر اور تلوار سے لے کر بندوق اور روالور تک تمام ہتھیار سجے ہوئے تھے۔ دراصل وارث علوی ادب میں کسی بھی ایسی چیز کو برداشت نہیں کرتے تھے جو غیر عقلی اور غیر منتہی ہوتی تھی اور ان کے اس رویے کے سبب تنقید میں ایک صحت مند فضا قائم ہونے میں مدد بھی ملی۔

بہرحال فکشن کی تنقید ہو یا شاعری کی تنقید وارث علوی کے یہاں تجزیاتی رنگ ہمیشہ حاوی رہا ہے۔ جس کی ہمارے یہاں تنقید میں بہت کمی تھی ۔ ہماری تنقید' تنقیدی جارگوں کا شکار تھی' تنقیدی اصطلاحوں اور گھسے پٹے الفاظ پر بہت زیادہ دار و مدار تھا اور رائے زنی اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی ۔

وارث علوی نے تنقیدی جارگون' اصطلاحوں اور کلیشز (Cliches) کو یکسر اپنی تنقید میں نابود کیا اور اس کی جگہ مزاح' طنز اور Irony سے سجے ہوئے اسلوب کا استعمال کیا۔ بات چیت کی زبان میں تنقید لکھی۔ اس طرح انہوں نے تنقید کو ایک عام آدمی کے لیے بھی پڑھنے کی چیز بنایا۔ وہ بڑی سے بڑی اور مشکل و پیچیدہ ترین باتوں کو بھی اتنے آسان اور دلچسپ پیرائے میں بیان کردیتے ہیں کہ عام آدمی بھی اس سے فیض اٹھا سکتا ہے۔ ایک بڑی خوبی ان کی یہ بھی رہی کہ انہوں نے تنقید میں کبھی مصلحت سے کام نہیں لیا۔ وہ ہمیشہ غیر جانبدارانہ (احمد آباد) میں تنہا بیٹھے تنقیدیں لکھتے رہے۔ اس لیے ان کا گروہ یا گروپ یا پیروکاروں کا ایسا حلقہ نہیں بنا' جو ان کی خوشامد کرتے۔ آخر پر میں حافظ عبدالمنان ترین کے ان اشعار سے اپنے مضمون کا اختتام کرتا ہوں۔

نقد ادب میں قامتِ اعلیٰ وارث علوی — کشور فن میں عظمت والا وارث علوی
حالی' بیدی' منٹو اور بلونت و عصمت — جس نے اشک و جوش کو تولا وارث علوی
دیکھا پہلے فن پارے کے متن کُل کو — تب قائم اک رائے بھی کرتا وارث علوی
ایسے عمل میں بات نئی جب پاتا کوئی — اس کی خوبی پھر بتلاتا وارث علوی
مشرق و مغرب کی تنقیدیں سامنے رکھ کر — نقش میں اپنے رنگ سے بھرتا وارث علوی
اردو کے ہے بے شک جید نقادوں میں — ذہن بھی ہے آفاقی رکھتا وارث علوی
طرز بیان سے ہے شکوہ گر کچھ لوگوں کو — ہر ناقد کے ساتھ ہے ایسا وارث علوی
فن پارے کے بطن معانی میں ہی اترے — تنقیدی وہ طرز ہے جس کا وارث علوی
کیسے کیسے نکتے اس نے ڈھونڈ نکالے — کیا کیا پہلو ہے دکھلاتا وارث علوی

حواشی:

۱۔	آبشار اور آتش فشاں	ص۔۲۲۰
۲۔	بتخانۂ چین	ص۔۱۰۔۱۱
۳۔	بتخانۂ چین	ص۱۱
۴۔	ناخن کا قرض	ص۔۳۷
۵۔	ناخن کا قرض	ص۔۹۱
۶۔	ناخن کا قرض	ص۔۹۶
۷۔	اوراق پارینہ	ص۔۸۳
۸۔	رسالہ ''سابرنامہ''	ص۔۷۳
۹۔	ادب کا غیر اہم آدمی	ص۔۲۵
۱۰۔	اوراق پارینہ	ص۔۸۵
۱۱۔	اوراق پارینہ	ص۔۳۵
۱۲۔	آبشار اور آتش فشاں	ص۔۲۵۲
۱۳۔	گنجینۂ باز خیال	ص۔۱۲۲
۱۴۔	گنجینۂ باز خیال	ص۔۱۶۰

''بارش میں بھیگتا چاند''

سدا سہاگن

(فراز کی رومانوی غزل کے نام)

شبنم شکیل (اسلام آباد)

جیسے ملہار چھیڑ دے کوئی
جیسے برسے بہار کا بادل
جیسے بارش میں بھیگتا ہو چاند
جھیل میں جیسے کھل رہا ہو کنول
جیسے رانجھے کی بانسری سن کر
ہیر کے پاؤں کی بجے پائل
ایک مدھر راگنی محبت کی
''جس میں لگتی ہوں سب سُریں کومل''
جیسے داسی ہو کامدیو کی اِک
''سانوری نار مدھ بھری چنچل''
مالا جپتے ہیں نام کی اس کے
عشق نے جن کو کر دیا پاگل
روپ اس کا کبھی ہے اگنی سا
کبھی شبنم کے جیسا نرمل جل
خود بخود دیپ جل اٹھیں جیسے
روشنی شاعری میں جائے ڈھل
دل میں سب کے مچادے اِک ہلچل
ایسا لہجہ کہ جایئے بل بل
بیت جیسے امیر خسرو کی
میر کی جیسے کوئی تازہ غزل

○

دعوتِ رقص

تشنہ بریلوی (کراچی)

دنیا ہے آج تشنہ ؔ دیدار ناچئے
محفل کو چھوڑ کر سر بازار ناچئے
جوشِ قدح سے آپ ہیں سرشار ناچئے
کوئی نہیں ہے بزم میں ہُشیار ناچئے
اُلٹا پڑا ہے مصر کا بازار ناچئے
یوسف ہے آج خود ہی خریدار ناچئے
سب دوریاں مٹایئے، آجایئے قریب
رُخسار سے ملایئے رُخسار ناچئے
بھر دیں خیال وخواب کو خوشبوئے وصل سے
سب پر کھُلیں جمال کے اسرار ناچئے
حوروں کو بھی سکھائیں ادائیں نئی نئی
رضوان آپ کا ہے طلب گار ناچئے
دیوانہ وار ہاتھ بڑھے جسم کی طرف
باقی نہیں بدن پہ کوئی تار ناچئے
یزداں و اہرمن ہوئے ہم رقص الاماں!
بخشے گئے تمام گنہ گار ناچئے
کرنیں بھی انگ انگ سے پھوٹیں بوقتِ رقص
جب تک کہ ہوں نہ صبح کے آثار ناچئے
جلوہ فگن ہو بزم میں رعنائیِ بہار
پھولوں کا بس گلے میں سجے ہار ناچئے
شمشیرِ صبح کاٹ کے رکھ دے گی زلفِ شب
ہاں کھنچ رہی ہے نیام سے تلوار ناچئے

سحرزدہ

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ
(دہلی، بھارت)

اِتفاقاً،تحفتاً
جنّتی قربت میں لپٹی
پیکرِ اخلاص ومحبت
اِک مہ لقا، دفعتاً نازل ہوئی تھی!
دیکھتے ہی دیکھتے، ذہن رسا پر چھا گئی وہ
پھر عالمِ ازخودرفتگی میں ناگہاں،
سرگذشتِ عشق کا ورق ورق
صُورتِ آبِ دریا تھا رواں!!
رازسارے جن کو وہ خود سے بھی مخفی رکھے تھے، منکشف ہونے لگے
ہورہا تھا فیصلوں پہ اپنے نادم، جو کئے تھے اُس نے وقتاً فوقتاً
اور وہ پیکرِ اخلاص ومحبت، سادگی پہ اُسکی مرمٹی تھی
آنِ واحد میں ہوئے یک جان دو قالب!!!

○

امن کی آشا

پروفیسر خیال آفاقی
(کراچی)

وارداتِ دل لکھیں اہل قلم دونوں طرف
کیوں نہ ہوگی دوریوں کی دُھندکم دونوں طرف

راحتیں دونوں طرف ہیں، رنج وغم دونوں طرف
زندگی کی راہ میں ہیں پیچ وخم دونوں طرف

کہنے کو موجود ہیں دیروحرم دونوں طرف
پھر ہیں کیوں مضبوط پتھر کے صنم دونوں طرف

مرے پُرکھوں کی ہو دھرتی یا مری ارضِ وطن
میرے جذبوں کے لیے ہے محترم دونوں طرف

آیئے یہ عہد کرتے ہیں کہ اپنے طور سے
پیار کی شمعیں جلائیں گے ہم دونوں طرف

چاہتے ہیں دونوں ملنا، پر کریں کیا کہ ہے عام
مغربی اقوام کا لطف و کرم دونوں طرف

شانتی بھی دونوں کو مل جائے گی اک دن خیاؔل
امن کی آشا ہو من میں کم سے کم دونوں طرف

○

''دستِ دعا''

(سانحہ گیاری ساچن کے تناظر میں)

یونس صابر

(پشاور)

دنیا میں پاک فوج کا اُونچا رہے گا نام
کوئی نہ کر سکا جو دکھایا وُہ کر کے کام
سب سے بڑی خبر ہے سیاچن گلیشیر
تو دوں تلے دبے ہیں جوان اور آفیسر
اُن کی تلاش میں ہے برابر فضائیہ
رہ جائیں کیوں جوان بے گور و کفن وہاں
نیچے ہیں وہ اور اونچی برف پوش چوٹیاں
دستِ دعا اُٹھائے ہوئے حاکم و عوام
مائیں ہیں منتظر تری آمد کی، صبح و شام
ملّت کے جانباز مجاہد تجھے سلام!

❍

آ گہی پکار ہم کو

ثروت زہرا

(دبئی)

ہم کہ راندہ کوچۂ و دل
ہم مسافر ہستی
کھل رہے ہیں خوابوں میں
دفن ہیں سرابوں میں
زندگی پکار ہم کو
منجمد لہو کو کھینچ
گرمی زمانہ بھیج
خاک سے نکال ہم کو
تشنگی پکار ہم کو
اذن دے نئے دن کو
سورجوں کی کرنیں کھول
پیاس میں سنبھال ہم کو
آ گہی۔۔۔ہم کو
جبر کے اندھیروں میں
خوف بستہ شامیں ہیں
دست بستہ آنکھیں ہیں
روشنی سے پال ہم کو

❍

ہائیکو

قیصر نجفی (کراچی)

پوچھو مت پھر حال
اوڑھ لے میری دھرتی جب
ہریالی کی شال

کس کی ہے یہ بھول
پھول سے نازک چہروں پر
دیکھی ہم نے دھول

منظر ہے خون رنگ
فاقہ کش نے کی ہے اب
ایسی خود سے جنگ

حشر کے ہیں آثار
رب کے گھر میں دیکھے ہیں
لاشوں کے انبار

بے معنی ہے شور
اس گھر کے تو نکلے ہیں
گھر والے ہی چور

کہساروں پر برف
جب جب پگھلے دیکھیں ہم
دریاؤں کا ظرف

کیسی ہے تزئین
گھر گھر بچھتے دیکھے ہیں
خوں کے اب قالین

جینا ہے دشوار
سر پر وہ مہنگائی کی
لٹکی ہے تلوار

○

دوھے

نورزمان ناوک

(تلہ گنگ)

مان نہ کرنا ناوکؔ چاہے پُوت ہوں چھ یا سات
کرموں بن کچھ ہاتھ نہ آئے اور بنے نا بات

وید حکیم پڑوسی اپنا دارُو لیویں لوگ
اُس کی بھی ہے مت چکرائی دیکھ ہمارا روگ

کرموں نے یوں تان دیا ہے مجبوری کا جال
بُھول گئے ہیں ناوکؔ سارے سُندر خواب خیال

اپنے کرموں کی ہے ناوکؔ ڈور سمے کے ہاتھ
کتنے کارن کر دیکھے یاں، سب نے چھوڑا ساتھ

ناوکؔ جی بس چُنتے رہ گئے جھڑ بیری کے بیر
کرموں والوں کے گھر لاگے مونگ پھلی کے ڈھیر

جب تک تھے کچھ کرنے جوگے کرتے تھے سب پیار
اب ہم سو سو نام دھرائیں، ہے کرموں کی مار

رِکن کرموں، ہم چھوڑ آئے ہیں ناوکؔ جی ملتان
تلہ گنگ بھی خوب ہے لیکن مشکل ہے جلپان

○

ایک صدی کا قصہ
امیہ چکرورتی

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

اُسنے کل سات فلمیں بنائیں۔صاف ستھری ، بے داغ اور با مقصد فلمیں۔ ’’داغ ‘‘ ’’پتیتا‘‘ ’’سیما‘‘ ’’کٹھ پتلی‘‘ ’’دیکھ کبیرا رویا‘‘ اور’’شہنشاہ‘‘۔یہ فلمیں ست رنگی قوس قزح کی طرح ہیں۔میں ان فلموں کے خالق کا ذاتی طور پر بیحد مداح و پرستار رہا ہوں۔آپ جانتے ہیں کہ میں کس کی بات کر رہا ہوں۔میں امیہ چکرورتی کی بات کر رہا ہوں۔امیہ چکرورتی ہندی فلمی صنعت کی ایک برگزیدہ شخصیت کا نام ہے جو ایک فلمساز ہی نہیں بلکہ بلند پائے کا صاحب قلم بھی تھا۔وہ ہمہ جہت فن کار تھا۔اُسنے فلمیں لکھیں،فلمیں بنائیں اور فلمیں ڈائرکٹ کیں۔کتابوں کا مصنف اور کئی بنگالی گیتوں کا تخلیق کار بھی رہا ہے۔

امیہ چکرورتی کا جنم 30 نومبر 1912 کو مغربی بنگال کے بوگرا نام کے ایک گاؤں میں ہوا۔کہتے ہیں کہ پوت کے پاؤں پالنے میں ہی دیکھے جاتے ہیں۔امیہ چکرورتی بچپن سے ہی بڑا ذہین اور تیز تھا۔امیہ نے جونہی ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کر دئے تو وہ سیاسی سرگرمیوں کی طرح راغب ہونے لگا۔1926 میں اُسے رابندر ناتھ ٹیگور کی صحبت میں اُٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا۔اُسے ٹیگور نے اپنا ادبی سیکرٹری مقرر کیا ۔وہ 1926 سے لے کے 1933 تک رابندر ناتھ ٹیگور کی چھتر چھایا میں رہا۔

امیہ چکرورتی میں ادبی میلان بچپن سے ہی تھا۔وہ جوں جوں بڑا ہوتا گیا اُسکا گیان دھیان بڑھتا چلا گیا۔ٹیگور کے ساتھ رہ کر اُسے کئی سارے ممالک گھومنے کا موقع مل گیا تھا۔اس دوران اُسے بہت سارے لوگوں سے ملنے کی سعادت نصیب ہوئی۔یہ وہ لوگ تھے جو دھرم اور فلاسفی میں بہت بڑا نام کما چکا تھے۔ان لوگوں کا اثر امیہ چکرورتی پر اس قدر پڑا کہ وہ بھی کم عمری میں ہی فلاسفی اور گیان میں کمال حاصل کر گیا۔اُس میں ادبی صلاحیتیں بدرجہ اُتم موجود تھیں۔ ٹیگور کی صحبت میں رہ کر اُسکے تخلیقی عمل کو جلا ملی۔اُسنے کم عمری میں کئی کتابیں لکھیں۔۔وہ بڑا جوشیلا اور نڈر تھا۔دیش بھگتی کا جذبہ اُس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔وہ کئی بار جیل بھی چلا گیا۔جب مہاتما گاندھی نے دیش بھر میں نمک ستیہ گرہ کی تحریک شروع کی تو امیہ چکرورتی بھی اُس تحریک میں شامل ہو گیا۔ستیہ گرہ کے آندولن میں جب اُسے گرفتار کیا گیا تو برٹش سرکار کی طرف سے اُسے بنگال چھوڑ کر جانے کا فرمان ملا۔

وہ جائے تو کہاں جائے۔؟ وہ کئی روز تک اسی تگ و دو میں رہا۔کافی سوچ و بچار کے بعد اُس نے بمبئی جانے کا فیصلہ کیا۔وہ ٹرین میں بیٹھ کر بنگال سے سیدھے بمبئی پہونچ گیا۔بمبئی میں جتنے بھی بنگالی تھے اُن میں سے بیشتر اُس کے نام سے کماحقہ واقف تھے اسلئے اُسے زیادہ دوڑ دھوپ نہ کرنی پڑی۔وہ بمبئی ٹاکیز کی مالکن اور اُسوقت کی سپر اسٹار دیویکا رانی سے جا کر ملا۔1940 میں اُسے دیویکا رانی کی طرف سے پہلا بریک تب ملا جب اُسے فلم بندھن کی کہانی لکھنے کے لئے کہا گیا۔یہ فلم این۔آر آچاریہ کی زیر ہدایت بن رہی تھی۔اس فلم میں اشوک کمار اور دیویکا رانی مرکزی کردار میں تھے۔چونکہ اشوک کمار بھی بنگالی تھا اسلئے بہت جلد امیہ چکرورتی کی دوستی اشوک کمار سے ہوگئی۔

ایک سال بعد یعنی 1941 میں اُسے اپنی پہلی فلم ’’انجانا‘‘ کو ڈائرکٹ کرنے کا موقع ملا۔اس فلم میں اُس زمانے کے سب سے بڑے اور کامیاب اداکار اشوک کمار اور دیوکا رانی کام کر رہے تھے۔یہ فلم خوب چل پڑی۔اس کے بعد 1942 میں اُس نے فلم ’’بسنت‘‘ کی ہدایت دی۔اس فلم کے مرکزی کرداروں میں ممتاز شانتی ،اُلہاس،ممتاز علی،سریش، پرمیلا اور بی بی ممتاز تھی۔یہ بی بی ممتاز وہی تھی جو بعد میں مدھو بالا بن گئی اور جس نے کئی دہائیوں تک کروڑوں دلوں پر راج کیا۔اس فلم کی موسیقی پنا لال گھوش نے ترتیب دی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بار امیہ چکرورتی اور دیویکا بوس کی نظر ایک خوبرو شرمیلے لڑکے پر پڑی جس کی پونے کی کی آرمی کنٹونمنٹ علاقے میں ایک فروٹ کی دوکان تھی جسے وہ خود چلا رہا تھا۔امیہ چکرورتی اور دیویکا رانی کو یہ لڑکا بھا گیا اور اُنہوں نے اُسے فلموں میں کام کرنے کی پیشکش کی جو اُسنے قبول کی۔دیویکا رانی نے یوسف خان نام کے اس شرمیلے سے لڑکے کو اپنی اگلی فلم میں بریک دینے کا فیصلہ کیا تھا۔اُنہوں نے امیہ چکرورتی کو اپنی اگلی فلم کے لئے سائن کیا جس کا نام ’’جوار بھاٹا‘‘ تھا۔مشہور رائٹر بھگوتی چرن ورما نے یوسف خان کو نیا فلمی نام دیا۔وہ نام تھا دلیپ کمار۔فلم ’’جوار بھاٹا‘‘ میں یوسف خان کو دلیپ کمار کے نام سے پیش کیا گیا۔امیہ چکرورتی نے اپنی یہ فلم ’’جوار بھاٹا‘‘ دل سے بنائی جس میں دلیپ کمار کو پہلی بار پیش کیا جا رہا تھا مگر نہ جانے کہاں کیا کمی رہ گئی کہ یہ فلم بری طرح ناکام رہی۔اس فلم کی ناکامی کو دیکھ کر لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ایک ستارے کا طلوع کے ساتھ ہی غروب ہوگیا۔اُن کا اشارہ دلیپ کمار کی طرف تھا۔

اس فلم نے امیہ چکرورتی کو بھی بڑا مایوس اور دل برداشتہ کر دیا۔اُنہیں فلم کی ناکامی سے کافی دکھ پہونچا تھا۔اس فلم کے بعد امیہ چکرورتی نے سن 1945 میں ایک اور ناکام فلم ’’گرلز سکول‘‘ بنائی۔یہ فلم بھی باکس آفس پر کوئی کمال دکھا نہ سکی۔امیہ چکرورتی یکے بعد دیگرے ناکامیوں سے دوچار ہوتا جا رہا تھا۔

1951 میں پریم ناتھ اور مدھو بالا کو لے کر امیہ چکرورتی نے ایک رومانٹک فلم ’’بادل‘‘ بنائی جسکی موسیقی شنکر جے کشن نے ترتیب دی تھی۔یہ وہ زمانہ تھا جب شنکر جے کشن کے نام کا ڈنکا پورے ملک میں بج رہا تھا۔’’بادل‘‘ کے گیت اتنے مدھر اور رس بھرے تھے کہ فلمی دیوانے اس سنگیت کو بار بار سننے کے لئے تھیٹر

میں گھستے تھے۔ یہ فلم ٹھیک ٹھاک رہی۔ امیہ چکرورتی جو ناکامی سے جوجھ رہا تھا اس فلم کی کامیابی سے اُسے قدرے راحت ملی۔

امیہ چکرورتی کی زندگی میں جو ڈرامائی موڑ آیا وہ فلم "داغ" کی بدولت آ گیا۔ جس ستارے کو فلمی نقادوں نے پردہ سیمیں سے اُوجھل ہونے کی بشارت دی تھی وہ پورے تب وتاب کے ساتھ فلمی اُفق پر جگمگا اُٹھا تھا۔ نتن بوس کی "ملن" اور شوکت حسین رضوی کی فلم "جگنو" نے اس شرمیلے سے ستارے کو شہرت کی معراج تک پہونچا دیا تھا۔ دلیپ کمار کی کامیابی کا ستارہ عروج پر تھا۔ امیہ چکرورتی 1954 میں فلم "داغ" بنانا چاہتے تھے جس میں وہ مرکزی رول دلیپ کمار سے ادا کروانا چاہتے تھے مگر اُن کا بجٹ بڑا محدود تھا۔ ایسے قلیل بجٹ میں وہ ایک اسٹار کا مالی بوجھ اُٹھا نہیں پاتے۔ در اصل امیہ چکرورتی نے "داغ" سے اپنے بینر کی نیوڈالی تھی۔ وہ آرٹسٹوں کی تلاش میں ادھر اُدھر پھر رہے تھے کہ ایک دن دلیپ صاحب کو یہ خبر لگی کہ امیہ چکرورتی "داغ" بنا نا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے محسن کو بھولے نہیں تھے۔ وہ سیدھے اُنکے پاس چلے گئے اور اُن سے کہا کہ وہ اُن سے معاوضہ کے طور پر ایک روپیہ لے کر معاہدہ پر دستخط کرنے کے لئے تیار ہیں۔۔ امیہ چکرورتی دلیپ کمار کی فراخدلی دیکھ کر جذباتی ہو گئے اور اُنہوں نے اُسی وقت دلیپ کمار کو "داغ" کے شنکر کے لئے سائن کیا۔ اس فلم نے امیہ چکرورتی کو کامیاب ترین پروڈیوسر، ڈائرکٹر کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔ اس فلم نے دلیپ کمار کی شہرت میں چار چاند لگا دئے۔ یہ فلم ہر لحاظ سے لاجواب تھی۔ وہ چاہے اس کی کہانی ہو، مکالمے ہوں (جو راجندر سنگھ بیدی کے زور قلم کا نتیجہ تھے) چاہے ایکٹروں کی پرفارمنس ہو۔ دلیپ کمار کا شرابی پن، للتا پوار کی پر اثر جذباتی ادا کاری اور نمی کا چلبلا پن۔ علاوہ ازیں اس کا مدھر اور مدہوش کرنے والا سنگیت فلم دیکھنے والوں کو مسحور کر کے رکھتا تھا۔ اس فلم کی بدولت امیہ چکرورتی کے گھر میں دھن برسنے لگا۔ اُنکے تو پوبارہ ہو گئے۔ یہ فلم پورے ملک میں کامیابی کے جھنڈے گاڑتی چلی گئی۔

مجھے اس فلم کے بارے میں ایک قصہ یاد آ رہا ہے۔ اس فلم کی بیشتر شوٹنگ مہاراشٹر کے ایک گاؤں میں ہوئی۔ کہتے ہیں کہ شوٹنگ مکمل ہونے کے بعد امیہ چکرورتی نے پیک اپ کا اعلان کر دیا۔ سارا سامان گاڑیوں میں لادا گیا۔ آرٹسٹ گاڑیوں میں جا کر بیٹھ گئے۔ تبھی سی۔ ایل۔ دوبے کو یاد آیا کہ ایک گانا تو شوٹ ہوا ہی نہیں۔ سی۔ ایل۔ دوبے ایک منجھے ہوئے اداکار کے ساتھ ساتھ ایک قابل معاون ہدایت کار بھی تھا۔ فلم "داغ" میں دلیپ کمار کے شرابی ساتھی کا رول دوبے نے ہی بڑی خوبی سے نبھایا تھا۔ اُسے جب یاد آیا کہ دلیپ صاحب پر ایک گانا شوٹ ہونے سے رہ گیا تو اُسکے ہوش اُڑ گئے اور وہ بھاگا بھاگا امیہ چکرورتی کے پاس گیا۔ اُسکے چہرے پر ہوائیاں اُڑتے دیکھ کر امیہ چکرورتی گھبرا گیا اور اُسنے دوبے سے اس قدر بدحواس ہونے کی وجہ پوچھی تو دوبے نے ڈرتے ڈرتے اُسے یہ خبر سنا ڈالی۔ امیہ چکرورتی نے اُسے سمجھایا کہ اسقدر پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ وہ جا کر کیمرہ گاڑی سے نیچے اُتروا دے۔ دوبے دوڑ کر کیمرہ یونٹ کے پاس چلا گیا اور اُنہیں کیمرہ گاڑی سے اُتارنے کے لئے کہا۔ ادھر امیہ چکرورتی نے دلیپ صاحب اور للتا پوار کو یہ کہہ کر روک لیا کہ کچھ شارٹس رہ گئے ہیں۔ وہ شاٹس لینے ضروری ہیں۔ دلیپ صاحب اور للتا پوار جا کر تیار ہونے لگے اور امیہ چکرورتی کیمرہ مین کو شاٹ سمجھانے لگا۔

قارئین شاید یقین نہیں کریں گے کہ تین منٹ کا گانا تین گھنٹے میں شوٹ ہوا۔ آج جب کہ ایک گانے کی فلمبندی کرنے میں نہ صرف آٹھ سے دس دن لگتے ہیں بلکہ کروڑوں روپے صرف ہوتے ہیں۔ وہی پر امیہ چکرورتی نے گانے کو تین گھنٹوں میں مکمل کر دیا۔ وہ گانا تھا دلیپ کمار پر فلمایا گیا طلعت محمود کا گایا گانا۔ "اے میرے دل کہیں اور چل۔ غم کی دنیا سے دل بھر گیا۔ ڈھونڈ لے اب کوئی گھر نیا۔" آج بھی وہ گانا دیکھئے کہیں پر بھی ایسا نہیں لگتا ہے کہ یہ اتنی عجلت میں شوٹ کیا گیا ہے۔

ایک طرف دلیپ کمار ہاتھ میں ایک سوٹ کیس لے کر گاتا ہوا گھر کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا جا رہا ہے، وہیں دوسری طرف ایک دکھیاری ماں جسے ایک سودخور بنئے نے گھر سے بے گھر کر دیا، بے نیل و مرام گاؤں کی پگڈنڈیوں پر لاٹھی کا سہارا لئے بوجھل قدموں کے ساتھ بھٹکی بھٹکی سی پھر رہی ہے تبھی اُسکے بیٹے کی آواز اُسکی سماعت سے ٹکراتی ہے۔ اُسکے بعد جو خوشی جو بیقراری اُسکی ہر ادا سے جھلکتی ہے وہ فلم بین کو رلا ڈالتی ہے۔ اُسکے بعد ماں بیٹے کا ملن۔ ماں کو دیکھ کر بیٹے کا خوشی اور انبساط کا اظہار کرنا۔ اپنی بوڑھی ماں کو گود میں اُٹھا کر خوشی سے ناچ اُٹھنا، یہ ساری چیزیں اُس گانے کو جاوداں کر گئی ہیں۔

اسی فلم کے تعلق سے ایک اور قصہ مجھے یاد آ رہا ہے۔ یہ دلیپ صاحب نے خود مجھے ایک روز سنایا تھا۔ ایک بار وہ ایک کلچرل وفد لے کر بنگلہ دیش چلے گئے تھے۔ وہاں پر ایک دن اُنکی ملاقات بیگم ضیا خالدہ سے ہو گئی۔ اُنہوں نے دلیپ صاحب سے "داغ" کے اُس سین کے بارے میں پوچھا جس میں اُنکی ماں للتا پوار مر جاتی ہے اور وہ اس صدمے سے اس قدر حواس باختہ ہو جاتے ہیں کہ بس ایک ہی جملے کا وہ ورد کرنے لگتے ہیں۔ میری ماں مر گئی۔ میری ماں مر گئی۔ دلیپ صاحب کا کہنا تھا کہ للتا پوار پان بہت کھایا کرتی تھی۔ جب بھی وہ یہ شاٹ دینے جاتے تھے تو للتا پوار اپنا منہ چلانے لگتی تھی۔ اُن کا سارا ٹمپو بگڑ جاتا تھا اور وہ حزنیہ اور المیہ اداکاری کرنے کی بجائے ہنسنے لگتے تھے۔ اُنہوں نے امیہ چکرورتی سے کہا کہ جب تک للتا بائی اس شاٹ میں پان کھانا بند نہیں کرے گی وہ یہ شاٹ دے ہی نہیں پائیں گے۔

امیہ چکرورتی نے دلیپ صاحب کو الگ لے جا کر کہا۔ تصور کرو یہ تمہاری ماں ہے۔ تمہاری اپنی ماں اور وہ تمہارے سامنے مردہ پڑی ہے۔ اس کے بعد تم کیا کرو گے۔

دلیپ صاحب نے اب کے جو للتا پوار کی طرف دیکھا تو اُنہیں اپنی حقیقی ماں یاد آ گئی اُسکے بعد وہ جس طرح روئے اور جس طرح تڑپے، اُنہیں روتے دیکھ کر سیٹ پر کھڑے سبھی لوگوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ آج بھی جب فلم

بین وہ سین دیکھتے ہیں تو اُنکے رونگٹھے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

1953 میں امیہ چکرورتی نے فلم ''شہنشاہ'' بنائی جو باکس آفس پر اوندھے منہ گری۔اس فلم کوکسی بھی سرکٹ میں کامیابی نہیں ملی۔اس فلم کی ناکامی سے امیہ چکرورتی کو مالی بحران کا شکار ہونا پڑا۔اُنہوں نے ''پتیتا'' کا مسودہ تیار کرکے رکھا تھا پراس فلم پرکوئی پیسہ لگانے کے لئے تیارنہیں ہو پارہاتھا۔کہا جاتا ہے کہ کہیں سے دیوآنند کو بھنک لگ گئی۔امیہ چکرورتی کے ساتھ کام کرنے کے لئے ایک سے ایک ایکٹرمراجارہا تھا کیونکہ وہ جس طرح کا کردار اپنے ہیرو کے لئے تخلیق کرتے تھے اور پھرجس طرح کا کام اُس سے لیتے تھے یہی تو اُسکا خاصہ تھا۔دیوآنند نے امیہ چکرورتی کواس فلم کو بنانے میں مالی مدد کی۔اُسنے 1954 میں فلم ''پتیتا'' بنائی جسمیں دیوآنند اوراوشا کرن مرکزی کردار میں تھے۔للتا پوار اس فلم میں بھی ایک کلیدی رول میں تھی۔اس فلم کی موسیقی بھی شنکر جے کشن نے ہی ترتیب دی تھی۔اس فلم نے زبردست کامیابی حاصل کی۔یہ بھی ایک سماجی فلم تھی۔اس میں ایک ایسی عورت کا کردار پیش کیا گیا تھا جوشادی سے پہلے ہی ماں بن جاتی ہے۔بعد میں دیو آنند کواس سے پیار ہوجاتا ہے۔ہمارے سماج میں اس طرح کی لڑکیوں کو''پتیتا'' کہا جاتا ہے جن کا پتی نہیں ہوتا ہے۔اس فلم کوفلمی شائقین نے بے حد سراہا۔خاص طور سے اس کا جوسنگیت تھا وہ بھی مقبول ہوا تھا۔وہ زمانہ شنکر جے کشن کا تھا۔اُن کا ہر گانا سرچڑھ کے بولتا تھا۔اس جوڑی کے اوج موج کا دورتھا وہ۔اُنکے نام پرفلم بک جاتی تھی۔اس فلم نے امیہ چکرورتی کوایک بارپھرسربلندی عطا کی۔

امیہ چکرورتی کی سب سے بہترین فلم ''سیما'' ہے۔اس فلم کے مرکزی اداکاروں میں بلراج ساہنی،نوتن اورشوبھا کھوٹے کے نام شامل ہیں۔یہ ایک ایسی سماجی فلم تھی جس نے فلمی ناقدین کو امیہ چکرورتی کی فنی صلاحیتوں کا گرویدہ بناکے رکھ دیا۔اس فلم میں نوتن کوبہترین اداکاری کے لئے فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔نوتن تازہ تازہ ہی فلمی اُفق پرنمودار ہوئی تھی۔اُسنے تین چارفلمیں کی تھیں مگراُسے وہ کامیابی نہیں ملی تھی جس کی وہ حقدارتھی۔اُسکی اداکارانہ صلاحیتوں کواُجاگر کرانے والا امیہ چکرورتی ہے جس نے نوتن کواُسکی زندگی کا سب سے خوبصورت اور یادگار رول دے دیا۔''سیما'' میں نوتن کا جورول تھا اُسے ''آتھر بیک رول'' کہا جاتا ہے۔اُس رول میں سارے شیڈ تھے۔غصہ،نفرت،بغاوت اورمحبت۔اس فلم نے نوتن کوراتوں رات شہرت کی بلندیوں پرپہونچا دیا۔اس فلم کے بعد وہ سب سے کامیاب اورخوبصورت اداکاراؤں میں شمار کی جانے لگی۔ امیہ چکرورتی کوبہترین کہانی کار کے لئے فلم فیئر ایوارڈ ملا۔

اس فلم کی کامیابی کے بعد 1957 میں امیہ چکرورتی نے ایک ہلکی پھلکی کامیڈی فلم بنائی جس کا نام ''دیکھ کبیرا رویا'' تھا۔کہا جاتا ہے کہ یہ فلم کامیڈی فلموں کی سرتاج ہے۔اس فلم میں کوئی نامی گرامی اداکارنہیں تھا۔اُس زمانے کے چھوٹے موٹے کلاکار تھے،جیسے انیتا گوہا، انوپ کمار، جواہرکول، دلجیت، امیتا اورشوبھا کھوٹے۔یہاں یہ بتانا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ شوبھا کھوٹے بھی اُنکی ہی دریافت تھی۔ہوا یوں کہ شوبھا کھوٹے سائکلینگ چمپین تھی۔کالج کی پڑھائی کے دوران اُسنے ایک سائیکل ریس میں حصہ لیا تھا جہاں وہ اول آئی تھی۔اُس کا فوٹو ایک مقامی اخبار میں چھپا تھا۔امیہ چکرورتی نے یہ فوٹو دیکھی۔اُنہیں لڑکی کا فوٹو بڑا پسند آیا۔اصل میں وہ اپنی اگلی فلم ''سیما'' کے لئے ایک ایسے چہرے کی تلاش میں تھے جونوتن کے مدمقابل رول کرسکے۔ اُنہیں شوبھا کھوٹے اتنی بھاگئی کہ اُنہوں نے اپنے پروڈکشن منیجر کواُس کے گھر بھیج کر اپنے دفتر میں بلوایا۔اُن دنوں امیہ چکرورتی پالی ہل پردلیپ صاحب کے بالکل پڑوس میں رہتے تھے۔شوبھا کھوٹے کو''تتلی'' کے اس لاجواب رول کے لئے چنا گیا اور پھرامیہ چکرورتی نے اُس نوخیز اورخام کاراداکارہ سے ایسا کام لیا کہ دنیا دیکھ کردنگ رہ گئی۔اس فلم میں پہلی بارامیہ چکرورتی نے سنگیت کار مدن موہن کے ساتھ کام کیا تھا۔

1957 میں امیہ چکرورتی نے بلراج ساہنی،وجینتی مالا اورجواہرکول کو لے کر فلم ''کٹھ پتلی'' بنائی جس کی موسیقی اُنکے پسندیدہ موسیقارشنکر جے کشن نے ترتیب دی تھی۔''کٹھ پتلی'' پیار کی ایک تکونی کہانی تھی جسمیں وجینتی مالا کے دلفریب ناچ اورشنکر جے کشن کے روح پرورسنگیت نے چارچاند لگادئے تھے۔گوکہ یہ فلم امیہ چکرورتی کہ سابقہ فلموں کی طرح موضوعاتی اعتبار سے انوکھی اورپراثرنہ تھی مگراس کے ناچ اورسنگیت میں وہ اثر تھا کہ فلم ڈوبتے ڈوبتے بچ گئی۔ہوا یوں کہ اس فلم کی فلم بندی کے دوران امیہ چکرورتی کا دل کا دورہ پڑنے سے موت ہوگئی۔فلم آدھی ہی بن پائی تھی۔چند خیرخواہوں کی کوششوں سے اس فلم کونتن بوس نے مکمل کر لیا۔نتن بوس مانا ہوا ہندی فلم ڈائرکٹر تھا جس نے کئی ہٹ فلمیں دیں تھیں۔فلم تو اُس نے مکمل کرکے دی مگریہ فلم اُس پائے کی ثابت نہیں ہوئی جس طرح کی فلمیں امیہ چکرورتی بنایا کرتے تھے۔امیہ چکرورتی کی فلموں کا طرہ امتیازیہ تھا کہ وہ موضوعاتی اعتبار سے اچھوتی ہوا کرتی تھیں اورناظرین پرگہرا تاثر چھوڑتی تھیں۔

امیہ چکرورتی کے شاگردوں میں گورودت اورگیان مکرجی بھی شامل تھے۔گورودت نے اُن کے اسسٹنٹ کے طورپرفلم ''گرلز اسکول'' میں کام کیا تھا۔یہ فلم باکس آفس پرکوئی خاص کمال نہ دکھا سکی۔دراصل امیہ چکرورتی اُسوقت بہت برے دور سے گزر رہا تھا۔گیان مکرجی تو اپنے گورو کا نام کچھ خاص روشن نہ کرسکا البتہ گورودت نے اپنے اُستاد کا نام نہ صرف روشن کیا بلکہ اُس میں چارچاند لگادئے۔

یہ ذہین اور نابغہ ہدایت کار 6 مارچ 1957 کو ہزاروں لاکھوں چاہنے والوں کوسوگوار کرکے اس جہاں فانی سے کوچ کرگیا۔چھوڑ گیا بس اپنی شہکار فلمیں جنہیں لوگ آج بھی چاؤ سے دیکھتے ہیں اور امیہ چکرورتی کی فن کارانہ صلاحیتوں کوسراہتے ہیں۔یہ دبلا پتلا سا ڈائرکٹر اپنے دور کا سب سے کامیاب اورگنی فن کارتھا جواپنی ہرفلم میں کوئی نہ کوئی پیغام دے کے جاتا تھا۔اُسنے بڑی ہی صاف ستھری اور بامقصد فلمیں بنائیں۔فلمی شائقین اسے صدا یاد کرتے رہیں گے۔

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین
وقار جاوید (راولپنڈی)

عزیز محترم گلزار جاوید صاحب! سلام مسنون کے بعد بہت ساری پُرخلوص دعائیں۔

حسب معمول تازہ چہارسو میں ایک سے ایک عمدہ مضمون اور نظم و غزل موجود ہیں۔ پھر ''گلزار صاحب'' کے بارے میں آپ نے جتنے مضامین جمع کر دیئے ہیں وہ بھی لاجواب ہیں۔ مگر معاف کرنا میری جان آپ نے جو گلزار صاحب کا انٹرویو لیا ہے اُس میں جو آپ نے اُن سے سوالات کئے ہیں وہ بہت ہی عام قسم کے ہیں یہی وجہ ہے کہ موصوف نے صحیح معنی میں آپ کے اتنے سارے سوالات میں سے کسی ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ بس آپ کو ٹرخایا ہے یا پھر موصوف نے جس انداز سے جواب دیے ہیں آپ کے سوالات اُن کے سامنے بہت بچگانہ سے نظر آ رہے ہیں۔ ماشاء اللہ آپ اتنے سمجھدار آدمی ہی نہیں بہت سمجھدار مدیر بھی ہیں پھر آپ نے ادبی لحاظ سے مادر پدر آزاد قسم کے سوالات کیوں کیے۔ اُسی انداز کے سوال کرتے جس انداز کے گلزار شاعر ادیب فلم ساز ڈرامہ نگار وغیرہ وغیرہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بول کے لب آزاد پڑھ کر لطف نہیں آیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ گلزار صاحب کو اپنے سے بہت بلند ثابت کرنے کی سعیِ بلیغ فرما رہے ہوں۔ اور مجھ ایسا عام فہم آدمی اُسے نہ سمجھ سکا ہو۔

مشکور حسین یاد (لاہور)

میرے گلزار خوش رہو۔

چہارسو کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ دیکھ کر جی خوش ہوا۔ گلزار صاحب کی فوٹو بھی کچھ ایسی چھپی ہے جیسے ابھی لب کشائی کو بیتاب ہوں۔ چہارسو میں جابجا گلزار کھلے ہیں۔ اور براہِ راست کے بجائے آپ کا ''بول کے لب آزاد ہیں تیرے'' پڑھتے پڑھتے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ نے گلزار صاحب کا شکار کرنے کی ان تھک کوشش کی مگر وہ ہر بار صاف کنی کاٹ کر چلتے رہے اور آپ کی تشنگی کے لیے انہوں نے از خود ''نکتہ چین ہے غمِ دل'' کے عنوان پر آپ کی پیاس کا سامان کر دیا۔ آغاز میں طاہر ظہیر بٹ کا ''اگر میں لوٹنا چاہوں'' اور میگھنا گلزار کا تجھ سا کوئی سخی کہاں (ف۔س۔اعجاز) خوشگوار یادیں لیے ہے۔ گلزار صاحب کا شہریار سُو بھی خوب رہا۔ مگر نند کشور وکرم بھی کہاں پیچھے رہنے والے تھے اُن کا ''نور آ گیا'' اچھا لگا اور گزشتہ زمانے کی یادیں تازہ ہوئیں۔ بمل رائے کا جانشیں۔ خواجہ احمد عباس بھی اپنے اندر کیف کی نئی دنیا لیے ہوئے ہے جو دلچسپی سے کم نہیں۔ زندگی کا ذائقہ گلزار صاحب کی شاعری سے وابستگی خوب ہے اور مایا میم صاحب کا خاکہ بھی اچھا لگا یہ شہر بڑا پرانا ہے۔ اپنے عہد میں عجب درد و کرب سموئے ہوئے ہے اور ساتھ ہی انگریزی کا ترجمہ بھی خوب ہے۔ غرضیکہ ہر مضمون ایک سے ایک نیا پن لیے ہے۔ عظمیٰ صدیقی کی نظم دیس پردیس تنہائی۔ دیپک کنول کا ایک صدی کا قصہّ (بی۔آر۔چوپڑہ) کافی دلچسپ ہے۔ آئینوں کو عادت نہیں، ستیہ پال آنند صاحب کا مضمون اور محمد اقبال بھٹی کا گلزار صاحب کی غزلوں کا انتخاب پسند آئے اور نظم کی ٹھنڈی خوشبو، گلزار صاحب کا نظمیہ انتخاب ڈاکٹر رینو بہل پسند آیا۔ فیروز عالم کا ''ہوا کے دوش پر'' اور پروین شیر کا ستارۂ نابینا پسند آئے۔ ''اِٹاں روڑے، حسن عسکری کاظمی۔ یاری لانا سوکھا کم اے، توڑ نبھانا اوکھا'' اچھا لگا۔

یوگیندر بہل تشنہ (دہلی، بھارت)

محترم بھائی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم

تازہ شمارہ آپ نے اپنے ایک ہم نام کے نام کیا جو واقعی آپ کی مسلسل جستجو کی شاندار مثال بن کر قاری پر چھا گئی۔ گلزار نہ صرف ایک اچھے شاعر اور ادیب ہیں بلکہ فلمی دنیا کے ماہر ترین ہدایت کار، فلم ساز، گیت نگار اور مصنف بھی ہیں۔ اب تک صلاحیت کے ذریعے انہوں نے جو بھی فلمیں بنائیں وہ سب اس بات کا منہ بولتا ثبوت رہیں کہ بمل رائے جیسے نامور فلمی تخلیق کار کے لائق شاگرد ہیں۔ ان کے لیے مضامین لکھنے والوں میں کن کن کے نام گنوائے جائیں: نند کشور وکرم ہوں کہ خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی ہوں کہ گوپی چند نارنگ، انتظار حسین ہوں کہ ستیہ پال آنند غرض کہ ایک لمبی فہرست ہے جن کی کہکشاں آپ نے ان کی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لیے روشن کی۔ پھر ان میں سے ہر ایک نے انہیں اپنی اپنی نظر سے دیکھا اور سراہا ہے۔ سب سے زیادہ پُرلطف تو ''بول کے لب آزاد ہیں تیرے!'' میں گلزار جاوید کا تیکھا سوال نامہ اور مایوسانہ گلزار کا جواب نامہ تھا۔ کئی سوال تو جناب گول کر گئے اور کئی سوالوں کا جواب دیتے وقت تلملا بھی گئے اگرچہ آپ نے نہایت سادگی سے وہ سوال کئے تھے بہر حال اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں! ہاں ایک بات اور آپ نے اُن کا ایک افسانہ ''تلاش'' شائع کیا ہے جس میں افسانہ نگار کی اُس روش پر حیرت ہوتی ہے جس نے انہیں جنسی تلذذ کا شکار بنا دیا۔ مجھے نہیں معلوم یہ اُن کے ابتدائی افسانوں میں سے تھا یا اُن کے بعد کے افسانوں میں سے!

دیپک کنول صاحب نے ''ایک صدی کا قصہ'' میں بی۔آر چوپڑہ کی جن فلموں کا تذکرہ اور جن اداکاروں کی اداکاری کا بیان کیا ہے۔ اُس سے فلمی دنیا کا سنہرا دور سامنے آ گیا ہے نیا دور، ایک ہی راستہ، سادھنا اور قانون وغیرہ ایسی فلمیں نہیں، جنہیں آسانی سے بُھلایا جا سکے۔ آہ! کیا دور تھا وہ بھی! ہندوستانی فلموں کا!!! اور کیا لوگ تھے جو فلم کے ایک ایک فریم پر محنت کرتے تھے!!!

غالب عرفان (کراچی)

برادرِعزیزم گلزار جاوید صاحب' تسلیم و نیاز

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ مئی، جون ۲۰۱۲ء اس وقت میرے سامنے ہے۔قرطاسِ اعزاز پر بھارت کی علمی اور ادبی دنیا کی مشہور ہستی گلزار جلوہ افروز ہیں۔اس شمارے میں ان پر اردو ادب کی مایۂ ناز ہستیوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ کمال ہے۔بہت پسند آیا اسلئے بار بار پڑھا اور اب ایسا جی کرتا ہے کہ چہارسو کا یہ شمارہ سارے کا سارا حفظ کرلوں۔لیکن بقول غالب

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
اب عناصر میں اعتدال کہاں

اس شمارے میں جتنے بھی مضامین ہیں وہ سو فیصدی عالمانہ اور معیاری ہیں کوئی کسی سے کم نہیں۔ان کے مصنف اردو ادب کے بہت اونچے مینار ہیں جن کے مقابلے میں مَیں تو ایک کوتاہ قد ہوں میں ایک نفسیاتی حقیقت کو عرض کرنے کی ناگزیر جسارت کررہا ہوں کہ میں ایک Extrorest (ظواہر پرست) کے بجائے ایک Introrest (باطن پرست) ہوں۔اس دنیا میں ہر شخص کی idiosyncrasies (جبلّت کی انفرادی اور راہ عام سے ہٹ کر مخصوصیات) ہوتی ہیں جو مجھ میں بھی ہیں۔لہٰذا باقی سب ہستیوں سے معافی مانگتے ہوئے یہ عرض کرتا ہوں کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کا مضمون بعنوان ''کتابِ زیست'' (صفحہ ۲۴) مجھے بہت ہی جچا۔یہ مضمون پروفیسر موصوف کا ایک monumental کارنامہ ہے۔چار صفحات پر مشتمل یہ مضمون ۴۰۰ صفحات سے زیادہ وزن رکھتا ہے۔دریا کو کوزے میں بند کردیا گیا ہے

''سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے''

''چہارسو'' کے کئی شمارے میری نظر سے گزر چکے ہیں۔سب کے سب اعلیٰ وارفع معیار کے ہیں۔جب بھی میں یہ مؤقر اور منفرد المقام جریدہ پڑھتا ہوں تو میرے ادنی سے ذہن کے ذخیرے میں معلومات کا گراں قدر اور بیش بہا اضافہ ہوتا ہے۔چہارسو صرف ایک رسالہ نہیں بلکہ اردو ادب کا قاموس یعنی Encyclopoedia ہے جو قسطوں میں شائع ہورہا ہے۔وہ دن دور نہیں جب میرا یہ خواب ایک حقیقت میں تبدیل ہوجائے گا۔بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔چہارسو کی افادیت علمی، ادبی اور ثقافتی ہونے تک محدود نہیں ایک بہت توجہ طلب بات عرض کررہا ہوں۔انسانی تہذیب اور معاشرے کی تواریخ میں جابجا عصری تقاضے بھی ہوتے ہیں۔بات یہ ہے کہ دنیا اس وقت تیسری عالمی جنگ کے تقریباً دہانے پر کھڑی ہے۔نہ معلوم کس وقت آناً فاناً کسی بھی ایٹمی طاقت کے دماغ میں فتور آجائے اور بقول ساحر لدھیانوی

''گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں ہے کہ پرچھائیاں بھی جل جائیں''

''چہارسو'' میں مجھے سب سے بڑی خوبی یہ نظر آئی ہے کہ یہ پُر وقار اور ہر دل عزیز جریدہ قارئین کو انسانی اخوت، مساوات، بھائی چارہ، عدم تعصب، عدم تشدّد، مذہبی اور ملّی رواداری نیز عالمی امن کی ترغیب دیتا ہے۔اس میں چھپنے والے اہل قلم ہر مذہب وملت کے ہیں اور پڑھنے والے بھی۔اس میں کسی بھی مذہب وملت وسیاسی نظام یا نظریات کا پراپیگنڈہ نہیں۔اس کے ورق ورق سے مترشح ہے کہ بھارت اور پاکستان کے لوگ واقعی آپس میں بھائی ہیں۔ان میں آپس میں کوئی تضاد نہیں کوئی لسانی، ثقافتی تفرقہ نہیں دونوں کی مسرّتیں اور مسائل ساجھے ہیں، جو نفرت سے نہیں بلکہ محبت سے سلجھ ہی جائیں گے۔

''ان کا جو کام ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

پرواز انبالوی (انبالہ، بھارت)

پیارے محسن گلزار جاوید' سلام مسنون۔

''چہارسو'' کے اتنے اچھے، بھرپور اور بامعنی نمبر کے لیے مبارک باد گلزار صاحب کے بارے میں بہت سی نئی باتوں سے آشنائی ہوئی خصوصاً بوسکی (میگھنا) کے مضمون سے۔خود گلزار صاحب، بمل رائے کا جانشیں مرحوم، خواجہ احمد عباس، ستیہ پال آنند، سید تقی عابدی اور طاہر ظہیر بٹ کا مختصر مضمون چار چاند لگانے کو کافی ہیں کہ ''گلزار'' کا پیدائشی نام سمپورن سنگھ کالرا تھا کیا دونوں نام انہیں کے ہیں؟ شہریار پہ ان کا اپنا مضمون خوب تر ہے اور سب سے مزے کا انٹرویو نما اظہار، اظہار بھی اقرار بھی۔اعتراف بھی انکار بھی۔کیا خوب نمبر ہے۔ میں سب ابھی نہیں پڑھ سکا جتنا پڑھ سکا ہوں بار بار پڑھتا ہوں۔جیتے رہیے خوش رہیں۔پاگل کہیں یا ابنارمل۔لوگ بُرا منا لیتے ہیں۔البتہ اہل جنوں میں شامل کہوں گا تو آپ بُرا نہیں مانیں گے۔آپ یوں بھی اہل دل میں بھی شامل ہیں اہلِ جنوں میں بھی (سچ پوچھیں تو یہ کام جنوں والا پاگل یا ابنارمل ہی کرسکتا ہے جو آپ نے اپنے ذمے لے رکھا ہے) ربّ کریم آپ کو استقامت دے۔سلامتی ہو صحت مندی کے ساتھ اور سب گھر والوں کی چھاؤں ہو جس میں محبت کی سرمائی دھوپ بھی ہو، اپنائیت اور سکون بھی۔اللہ دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرتے رہیں۔اور اپنے لیے آسودگیاں جمع کرتے رہیں (آمین)

یونس جاوید (لاہور)

پیارے بھائی جان! سلام شوق اور خلوص بیکراں۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ (مئی جون ۲۰۱۲ء) گلزار صاحب کے نام کے قرطاسِ اعزاز کی ہزار ہا خوشبوؤں کے ساتھ موصول ہوکر فردوس نظر ہوا۔ یوں تو اُن پر پہلے بھی کئی مؤقر جریں خصوصی شمارے شائع کرچکے ہیں اور قریب آٹھ سال قبل ان کی دخترِ نیک اختر میگھنا نے بھی ان کی باتصویر سوانح عمری ''Because he is....'' کے نام سے کتابی شکل میں پیش کی تھی جو گلزار صاحب کے بچپن سے لے کر ان کے ادبی اور فلمی سفر کا بھرپور احاطہ کرتی ہے۔ لیکن گلزار صاحب جیسی کثیر الجہت شخصیت کے بارے میں کچھ بھی نئی تحریریں سامنے آئیں تو یقیناً اس سے ان کی ذات وصفات کے کئی نئے گوشے وا ہوتے

ہیں۔اس سلسلے میں چہارسو کے اس تازہ شمارے میں حضرات خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، ستیہ پال آنند اور ڈاکٹر ہری دیو کرشن سرے وغیرہم کے پُر مغز مضامین کے ساتھ ساتھ ''نکتہ چیں ہے غمِ دِل'' اور ''بول کہ لب آزاد ہیں تیرے'' کے منفرد انداز کی تحریریں اس کی شاہد ہیں۔

ہاں ایک بات کہنے کی گستاخانہ جرأت کر رہا ہوں کہ اگر چہ (بقول آپ کے بھی) گلزار صاحب صرف شاعری کو اپنی شناخت بنانے پر بضد ہیں اور انہوں نے بھی اس بات کی تصدیق فرماتے ہوئے یہی کہا ہے کہ ''شاعری سے مجھے وہ سب کچھ حاصل ہوتا ہے جو چھوٹی بڑی سکرین تو کیا دنیا کی تمام تر دولت سے حاصل نہیں کیا جا سکتا''۔ لیکن میری ذاتی رائے میں ان کی شہرت اور ناموری بطور کہانی کار اور فلم ساز اور نغمہ نگار زیادہ ہے، اور لفظیات کی جدّت طرازی اور جادوگری کے باوجود ان کی ادبی شاعری خواص پسند ہے۔ عام لوگ ان کی فلمی شاعری کے حوالے سے انہیں زیادہ جانتے ہیں اور مانتے بھی ہیں گو اس میں بھی موسیقاروں خصوصاً آر۔ڈی۔برمن (مرحوم) کا بہت بڑا ہاتھ ہے جنہوں نے ان کی کئی نثری نظموں کو بھی سنگیت کے ایسے سُروں میں ڈھالا کہ وہ گیت آج بھی مقبول خاص و عام ہیں۔

گلزار صاحب کی کہانی ''تلاش'' لائق ستائش ہے، دیگر افسانے اب کی بار قدرے بے کیف ہیں۔ حصہ نظم میں نصیر احمد ناصر، نورین طلعت عروبہ، سرور انبالوی، نذیر فتح پوری، پرواز انبالوی، عارف شفیق، عرش صہبائی، زاہدہ عابد حنا، محمود شام، عظمیٰ صدیقی، سیفی سرونجی اور حسن عسکری کاظمی صاحبان کا کلام لائق توجہ ہے۔ ''ہوا کے دوش پر'' اور ''ایک صدی کا قصہ'' دونوں کی دل چسپی برقرار ہے بلکہ فزوں تر ہے۔ بی۔آر۔چوپڑہ صاحب کی اہلیہ کا انہیں اپنی کمپنی کھولنے کے لیے اپنے پس انداز کیے ہوئے پیسے اور گہنوں کی پیش کش کرنا اس قول کا ثبوتِ واثق ہے کہ ہر کامیاب انسان کی کامیابی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ہاں دیپک کنول صاحب اب کی بار چوپڑہ صاحب کے بارے میں دو تین اہم باتیں درج کرنا بھول گئے:

وفات سے پہلے چوپڑہ صاحب نے دو نہایت کامیاب فلمیں اور بنائی تھیں۔ ''باغبان'' (جو اکتوبر ۲۰۰۳ء میں ریلیز ہوئی تھی) اور ''بابُل'' (جو دسمبر ۲۰۰۶ء میں آئی تھی) اور اسی فلم کے ساتھ ہی بی۔آر۔فلمز نے اپنے فلمی سفر کے پچاس سال بھی پورے کیے تھے۔ گو ان دونوں فلموں کے ہدایت کار ان کے بیٹے روی چوپڑی تھے لیکن ان کے پروڈیوسر خود بی۔آر۔چوپڑہ تھے۔ اور یہ دونوں فلمیں بی۔آر۔کے بینر کے تلے بنی تھیں۔ ''باغبان'' کی کہانی میں بھی بی۔آر۔چوپڑہ ہی کا دخل تھا۔ دراصل وہ تیس سال پہلے ہی دلیپ کمار اور راکھی کو لے کر یہ فلم بنانا چاہتے تھے لیکن بوجوہ یہ اُس وقت بن نہ سکی اور اب ۲۰۰۳ء میں انہوں نے امیتابھ بچن اور ہیما مالنی کو مرکزی کرداروں میں لے کر اپنے اس دیرینہ خواب کی تکمیل کی تھی اور اُسی برس انہیں فلم فیئر لائف اچیومنٹ ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔ اس سے قبل ۱۹۹۸ء میں انہیں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا جا چکا تھا۔

مہندر پرتاپ چاند (انبالہ، بھارت)

محترم جاوید گلزار صاحب

اس قدر خوبصورت شمارہ نکالنے پر مبارکباد قبول کیجیے۔ سرورق کے لئے سیاہ رنگ کا استعمال بہت اچھا تھا، اس سے گلزار صاحب کی تصویر اور نمایاں ہوگئی۔ ویسے آپ کے سب ہی شمارے قابلِ لائق صد تحسین ہوتے ہیں لیکن یہ شمارہ اپنی سادگی و پرکاری کی وجہ سے بازی لے گیا۔ گلزار صاحب سے گفتگو بہت بے ساختہ اور پرلطف تھی، جیتے رہیئے۔ طاہر ظہیر بٹ کا مضمون اس سے بہتر ہو سکتا تھا، گلزار صاحب کا اصل نام تک غلط تحریر تھا۔ پھر یہ پورا مضمون ایک عجیب superlative شکل میں لکھا گیا ہے، جہاں ہر چیز، چاہے وہ گاؤں کا نام ہو، پیپل کا درخت ہو گلزار کے والد کے ساتھ مشہور اسی نوعیت کے دوسرے الفاظ کا بے جا استعمال ہے۔ میگھنا گلزار کا مضمون بہت خوبصورت تھا اس سے اس عظیم فنکار کے اندر چھپے عام آدمی سے تعارف حاصل ہوا۔ ترجمہ اچھا کیا گیا تھا۔ انتظار حسین، گوپی چند نارنگ اور ستیہ پال آنند کے مضامین نے بہت مزا دیا۔ ادھر کینیڈا سے تقی عابدی صاحب نے بھی گلزار کی نظم کے گرد ایک دلچسپ مضمون بنا ہے۔ یہ ایک خوبصورت نظم ہے جسے عابدی صاحب نے اپنے اندازِ تحریر سے دوآتشہ کر دیا۔ مرزا کی سمجھیئے پوری سوانح حیات کی دوبارہ سیر ہوگئی۔ گلزار صاحب کے دونوں افسانے بہت خوبصورت تھے۔ ''تلاش'' کی بنت ایسی ہے کہ افسانے کو درمیان سے شروع کیا گیا ہے، پھر فلیش بیک میں ربط جوڑا گیا اور پھر واپس زمانہ حال میں افسانہ آگے بڑھ گیا۔ ''اسٹون ایج'' ایک آفاقی افسانہ ہے، اس کے پس منظر میں کسی جدو جہد کو ڈال دیجئے، کشمیر، فلسطین، بوسنیا، حتیٰ کہ دوسری جنگِ عظیم میں یہودیوں کے ساتھ ہونے والا ظلم۔ صرف کرداروں کے نام اور زمانہ بدل جائے گا، افسانے کے ماخذ پر حرف نہ آئے گا، کیا اچھا افسانہ ہے۔ بول کہ لب آزاد ہیں تیرے پڑھنا شروع کیا تو رسالہ درمیان میں چھوڑنا مشکل تھا۔ تیکھے سوالات اور اس سے بڑھ کر جوابات۔ نہ سوال کرنے والے نے کسی ابہام، یا بد دیانتی سے کام لیا اور نہ ہی گلزار صاحب نے کوئی رعایت بخشی۔ افسانے اس دفعہ بس ٹھیک تھے۔ ڈاکٹر فیروز عالم کا ''ہوا کے دوش پر'' اپنی سادہ بیانی اور کہانی کی روانی کی وجہ سے مزا دے جاتا ہے اور آئندہ قسط کا انتظار رہتا ہے۔

ایک نجی بات کہ نجیب عمر صاحب ہمیشہ مہربان ہوتے ہیں اس دفعہ بھی انہوں نے میرے افسانے ''دامِ آگہی'' پر پسندیدگی کا اظہار کیا، شکریہ۔ ایک مرتبہ میں نے فون پر وعدہ بھی کیا تھا کہ اپنی کتاب بھیجوں گا مگر پتہ ہی کھو بیٹھا ہوں۔ نجیب صاحب ممکن ہو تو ای میل کے ذریعے اپنا پوسٹل ایڈریس بھیج دیجیے۔

سید سعید نقوی (نیویارک)

برادرِعزیز گلزار جاوید

سلام مسنون۔ آپ کا ازحد ممنون ہوں کہ آپ نے کیلیفورنیا، امریکہ سے تشریف لائے ہوئے افسانہ نگار ڈاکٹر فیروز عالم کے اعزاز میں اپنے ہاں ہونے والی (نثری) تقریب میں بُلایا اور ''چہارسُو'' کے تین تازہ شمارے یعنی سن ۲۰۱۲ کے سب شمارے عطا فرمائے۔ ویسے تو آپ مجھے گذشتہ کئی سال سے ہر شمارہ بذریعہ ای میل ارسال کر رہے ہیں مگر سچی بات ہے کہ جو مزہ کاغذ پر مطالعہ کرنے میں ہے وہ کمپیوٹر کی سکرین پر پڑھ کر کبھی نہیں آتا۔ اب مَیں الف سے ی کی ترتیب سے نہیں بلکہ ی سے الف کی ترتیب سے ان شماروں کا مطالعہ کر رہا ہوں، یعنی مئی جون کا شمارہ پڑھ رہا ہوں اور اس کے بعد باقی کے دو شماروں کی باری آئے گی۔ اور خبردار، ہوشیار کہ اب جو کچھ لکھوں گا وہ حُسنِ طلب کے دائرے میں آئے گا، یعنی مَیں چند مزید گذشتہ شماروں کی فرمائش کرنے والا ہوں کیونکہ جب میں نے اِس شمارے میں ان کی داستانِ حیات کی ۱۲ویں قسط پڑھی تو جی چاہا اور یہ محسوس بھی ہوُا کہ کم از کم کسی داستانِ حیات کو 'ی' سے 'الف' کی طرف سفر کرتے ہوئے نہیں پڑھا جا سکتا اور ضروری ہے کہ پہلی قسط سے ایک ترتیب کے ساتھ پڑھا جائے۔ آپ البتہ سابقہ شمارے مہیّا کرنے کی (محبت بھری) مشقت سے بچ سکتے ہیں اگر یہ بتا سکیں کہ کیا اُن کی داستانِ حیات کتابی صورت میں شائع ہو کر پاکستان میں کسی بکسٹال یا ناشر سے دستیاب ہے تا کہ مَیں اُسے حاصل کر سکوں۔ یہ اِس لئے کہ ڈاکٹر فیروز عالم سے آپ کے ہاں جو مختصر سی ملاقات ہوئی اُسے مَیں ان کی کتابِ حیات کا سرِ ورق ہی کہوں گا، چنانچہ لازم ٹھہرا کہ پوری کتاب کا مطالعہ کیا جائے!

تازہ شمارے میں قرطاسِ اعزاز کے لئے گلزار جیسی ہمہ جہت شخصیت کا انتخاب کر کے آپ نے چہارسُو کے لئے بھی ایک اعزازِ خصوصی حاصل کر لیا ہے، ان کے دو افسانے، ان کی شاعری، ان پر لکھے گئے مضامین، ان سے آپ کا بھرپور انٹرویو سبھی کچھ پڑھا ہے، مگر لگتا ہے گلزار کا تعارف اب بھی ادھورا ہے، وہ اس سب کچھ سے بھی بہت آگے چلے جا رہے ہیں کہ ان کا فنی سفر کہیں ٹھہرتا ہی نہیں۔ شمارے کے پہلے مضمون میں ان کا اصل نام جسمیر سنگھ اور دوسرے مضمون میں سمپورن سنگھ کالرا پڑھ کے کچھ الجھن سی ہو رہی تھی مگر پھر آپ سے فون پر بات ہوئی تو یہ معلوم کر کے بات صاف ہو گئی کہ ان کا اصل نام سمپورن سنگھ کالرا ہی ہے اور پہلے مضمون میں غلطی سے ان کے بڑے بھائی کے نام کو ان کے نام کے طور پر لکھ دیا گیا تھا۔ آپ نے ان سے انٹرویو میں جو سوال کئے اور انہوں نے جو جواب دیئے، ایسا لگ رہا تھا کی ''گلزارین'' میں برابر کا ٹکراؤ تھا، اور یہ حقیقت بھی ہے کہ کسی بھی شخصیت کے اندر سے حقیقت اگلوانے کے لئے ''گائیڈڈ میزائل'' جیسے سوالات کی تشکیل پہلا مرحلہ ہوتی ہے۔ اور آپ تو یہ مرحلے کئی مرتبہ طے کر چکے ہیں۔ انٹرویو پڑھ کر تو مَیں بھی گل و گلزار ہو گیا!

''چہارسُو'' ابھی تک زیرِ مطالعہ ہے، ۱۲۰ صفحات میں آپ ماشاء اللہ اتنا کچھ سمو دیتے ہیں کہ اُسے پوری طرح پڑھنے کے لئے اور پھر اُسے اپنے سسٹم میں اتارنے کے لئے بھی وقت چاہئے، لہٰذا دیگر تخلیقات پر تبصرہ محفوظ!
(جب عدلیہ اپنے کئی فیصلے محفوظ رکھ سکتی ہے تو ہم کیوں ایسا نہ کریں؟)

نسیمِ سحر (جدہ)

- بقیہ -

''بندگیِ صنم''

کی بیماری کا علم ہو۔ وہ نہ تو آپ کے سامنے سسک سسک کر مرنا چاہتی تھی اور نہ آپ کو کسی اذیت سے دوچار کرنا اُسے منظور تھا۔ اُس نے سب کچھ اکیلے سہتے ہوئے مجھ سے عہد لیا کہ میں اُس کے لکھے ہوئے خطوط مسلسل آپ کو ارسال کرتی رہوں تاکہ آزمائش کی گھڑیاں آپ آسانی سے گذار لیں اور جب آپ کی ڈیوٹی قریب الختم ہو تو آپ کو تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا جائے۔

آج اُس کو دیا ہوا وعدہ پورا کرنے کا وقت آن پہنچا ہے۔ اس وقت جس کڑے امتحان سے میں گذر رہی ہوں، یہ میں جانتی ہوں یا میرا رب جانتا ہے! اوپر والے سے میری التجا ہے کہ وہ کسی کو اس طرح کے امتحان سے کبھی نہ گذارے۔

مارچ کی پندرہ تاریخ کو وہ نیند سے نہیں جاگی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سوگئی۔ اُس کے لبوں پر آخری وقت تک ایک نام آپ کا بار، بار آتا رہا۔ اُس وقت اُس کی آنکھوں کی حسرت اور اُس کے چہرے کی بے بسی کسی بھی دردمند انسان کو مار سکتی تھی مگر میں چاہتے ہوئے بھی نہ مر سکی، صرف اس لئے کہ مجھے شرمیلا فقط آپ کی شرمیلا سے کیا ہوا عہد نبھانا تھا۔

آخری الفاظ جو اُس کی زبان سے ادا ہوئے وہ کچھ یوں تھے ''جب دیپک کے بچے ہنسیں گے، کھیلیں گے اور مسکرائیں گے تو سمجھ لینا میں مسکرا رہی ہوں۔ مجھے اپنی یادوں میں ہنستے، ہنستے بسانا اگر رو کر یاد کیا تو میں ناراض ہو جاؤں گی۔ پھر شاید میرے لئے خوابوں میں آنا بھی ممکن نہ رہے!

میں نے اپنا وعدہ پورا کیا، اب آپ کی باری ہے اُس کی آخری خواہش پوری کرنے کی!!!

آپ کی خیرخواہ

سیما بھارگو

...... بدلی میں چھپا چاند ......

عام طور پر اچھا ادب وہ سمجھا جاتا ہے، جو اپنے دَور کا عکّاس ہو۔ اس سے بھی اچھا ادب وہ ہوتا ہے جو اپنے دَور کی عکّاسی تو کرتا ہی ہو، ساتھ ہی ساتھ اُس میں ماضی کی جھلک بھی ملتی ہو اور مستقبل کی تلاش بھی۔ ایسا ادب جہاں وقت کی حدود کو توڑ کر ایک طرح سے ہر دَور کا نمائندہ ادب بن جاتا ہے، وہاں وہ جغرافیائی حدوں کو پھلانگ کر کُل عالم کا ادب بھی بن جاتا ہے۔ ہر عہد میں آنے والا فرد اُسے اپنا لیتا ہے۔

پچھلے چند سالوں سے مَیں رینو بہل کی کہانیوں کو غور سے پڑھتا رہا ہوں۔ جس لگن سے وہ کہانی لکھنے اور اپنے عہد کے درد کو بیان کرنے میں لگی ہیں، اس سے اُمید بندھتی ہے کہ وہ اردو ادب میں اپنی الگ چھاپ چھوڑنے میں کامیاب ہوں گی۔ ''بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے''، ''لغزشِ آدم'' اور ''سیڑھی'' جیسی کہانیاں انہیں منزل کی طرف گامزن کر رہی ہیں۔ ...... **رتن سنگھ**

ایک سو اٹھائیس صفحات اور پندرہ افسانوں پر مشتمل یہ کتاب دوسو روپے کے عوض موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹، گولا مارکیٹ، نئی دہلی پر دستیاب ہے۔

...... دشتِ بے کنار ......

گفتنی کیا ہے اور ناگفتنی کیا؟ ہر حسّاس اور باشعور تخلیق کار کے مقابل پہلا بڑا سوال یہی آتا ہے۔ محتسب کی خیر ہو، جگہ جگہ حساب خانے کھل گئے ہیں۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی نوجوان، جب ناگفتنی کا بارِ امانت اُٹھا کر اپنی دانست میں صعوبتیں جھیلتا ہے تو ادب کے محتسب اُسے بتاتے ہیں کہ یہ سب تو پہلے کے باکمال گفتنی بنا چکے، تم نے ناحق یہ رنج اُٹھایا۔ یہی ممکنہ طعن ہے، جو کوئی ہیئت، فنی تدبیر اور زبان میں ندرت پیدا کرنے کا جتن کر کے ان اپنوں سے اکثر فاصلہ پیدا کر بیٹھتا ہے، جن سے مخاطبت کی آرزو، جوانی میں شعر خوانی پر اُکساتی ہے۔

مظہر بخاری، شدّتِ احساس کے شاعر ہیں، سو ناگفتنی کا عذاب جھیل رہے ہیں، خواب سے تعبیر، خودسپردگی سے بے تعلقی، امنگ سے وصیت، کربلا سے کوفے اور وعدہ وفائی سے مکر نے تک کا جو فاصلہ ہوتا ہے، وہ ان کے اس مجموعے میں ہم کلامی کی گہری آرزو کے ساتھ شعر کے پیکر میں ڈھلا ہے۔ اس میں ان کے تجربے، مطالعے، مشاعروں اور مجلسوں کی کرچیاں اور ڈونگرے بھی ان کی صدا کے ہم رکاب ہیں، گویا ایک غبار بھی اس شہسوار کے ہم راہ ہے، دیکھیں دشتِ شعر میں وہ آخر کیا خبر لاتا ہے یا گُل کِھلاتا ہے۔ ...... **ڈاکٹر انوار احمد**

ایک سو ساٹھ صفحات کی یہ کتاب مبلغ دوصد پچاس روپے کے عوض الاشراق پبلی کیشنز، لاہور پر بآسانی دستیاب ہے۔

...... لولاک نمبر ......

لولاک کا تازہ شمارہ کئی معنی سے منفرد ہی نہیں ممتاز بھی ہے، ہندوستان، پاکستان اور اردو کی وہ نئی بستیاں جہاں سے اردو رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ میری حقیر معلومات کے مطابق اب تک شخصیات اور موضوعات پر ان گنت گوشے اور نمبر شائع ہوئے ہیں لیکن ایسا پہلی بار ہو رہا ہے جب کسی کتاب (ایک نظم) پر مشتمل خصوصی شمارہ شائع ہو رہا ہو۔ جی ہاں! ہم ملک کے سینئر صحافی اور بلند فکر شاعر چندر بھان خیالؔ کی کتاب ''لولاک'' پر لولاک نمبر شائع کر رہے ہیں۔ لولاک ایک طویل نظم ہے (کتاب کی شکل میں) جو نبی کریم ﷺ کی عظمت و رفعت پر بڑی عقیدت اور فراخ دلی سے تحریر کی گئی ہے۔ نعتیہ شاعری یوں تو بہت سے غیر مسلم شعرا نے کی ہے لیکن لولاک اپنی نوعیت کی پہلی نعتیہ نظم ہے جس میں کسی غیر مسلم شاعر نے اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ انتہائی معذرت کے ساتھ یہ عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ لولاک 1500 برس میں کسی غیر مسلم شاعر کی پہلی نظم ہے جو سیرت نبوی کو موضوع بنا کر اتنی مدلل، مفصل اور بالکل نئی تکنیک کے ساتھ کہی گئی ہے اور جو اپنے آپ میں تاریخ بن گئی ہے۔ ...... **حسیب سوز**

تین سو سولہ صفحات پر مشتمل یہ مجلّہ مبلغ دوصد پچاس روپے کے عوض سینٹرل نیوز ایجنسی پرائیویٹ لمیٹڈ، نئی دہلی پر بآسانی دستیاب ہے۔